

مستقل اہمیت کی حامل معیاری اور شگفتہ تحریریں

سیارہ ڈائجسٹ

جنوری 2015

حکیم دانا...

حکیم محمد سعید

وہ انعام کے طور پر ملے
اور سزا کے طور پر واپس
لے لئے گئے

WWW.PAKSOCIETY.COM

خوش خلقی میں حرفِ آخر مروت اور لحاظ میں لائانی
فقیری میں سلطانی اور سلطانی میں درویشی کا اعجاز
اُن ہی کی کرامت تھی

پاکستان کو ایسے رہنماؤں کی ضرورت ہے

سیارہ ڈائجسٹ

جنوری 2015ء

قیمت: 80 روپے

القرآن

بسم الله الرحمن الرحيم

سورة الانعام

اور اس طرح ہم اپنی نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں تاکہ مجرموں کی راہ بالکل نمایاں ہو جائے۔

اے محمد! ان سے کہو کہ تم لوگ اللہ کے سوا جن دوسروں کو پکارتے ہو ان کی بندگی کرنے سے مجھے منع کیا گیا ہے۔ کہو! میں تمہاری خواہشات کی پیروی نہیں کروں گا! اگر میں نے ایسا کیا تو گمراہ ہو گیا، راہ راست پانے والوں میں سے نہ رہا، کہو! میں اپنے رب کی طرف سے ایک دلیل روشن پر قائم ہوں اور تم نے اسے جھٹلادیا ہے اب میرے اختیار میں وہ چیز ہے نہیں جس کے لیے تم جلدی مچا رہے ہو۔ فیصلہ کا سارا اختیار اللہ کو ہے، وہی امر حق بیان کرتا ہے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

(آیات ۵۵ تا ۵۷) (حوالہ تفہیم القرآن از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

ضروری نوٹ: گزشتہ ماہ ”القرآن“ کی آیات کا حوالہ غلط شائع ہو گیا تھا۔ ترجمہ شدہ آیات 53 تا 54 تھیں جو سہواً 36 تا 37 درج کردی گئیں۔ قارئین کرام صحیح فرمائیں۔

الحديث

بسم الله الرحمن الرحيم

اطاعت رسول ﷺ کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

ترجمہ: تین آدمی حضور ﷺ کے معمول عبادت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے حضور ﷺ کی ازواج کے پاس آئے، جب انہیں بتایا گیا تو انہوں نے آپ ﷺ کی عبادت کی مقدار کو کم تصور کیا اور کہنے لگے: ”نہی ﷺ سے ہمارا کیا مقابلہ! ان سے نہ تو پہلے گناہ ہوئے نہ بعد میں ہوں گے۔ (اور ہم معصوم نہیں، پس ہمیں زیادہ سے زیادہ عبادت کرنی چاہیے)۔“

”چنانچہ ان میں سے ایک نے اپنے لیے یہ طے کیا کہ وہ ہمیشہ پوری رات نوافل میں گزارے گا۔

اور دوسرے نے یہ کہا کہ میں ہمیشہ نفلی روزے رکھوں گا اور کبھی ناغہ نہ کروں گا اور تیسرے نے کہا ”میں عورتوں سے الگ تھلک رہوں گا“ کبھی شادی نہ کروں گا۔“

(جب آپ ﷺ کو اس کی اطلاع ملی) تو آپ ﷺ ان کے پاس گئے اور کہا ”کیا وہ تم ہی لوگ ہو جنہوں نے ایسا ایسا کہا ہے؟“

پھر آپ ﷺ نے فرمایا ”بلاشبہ میں تم سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور اس کی نافرمانی سے بچنے والا ہوں لیکن دیکھو میں (نفلی) روزے کبھی رکھتا ہوں کبھی نہیں رکھتا۔ اسی طرح میں (رات میں) نوافل بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور دیکھو میں بیویاں بھی رکھتا ہوں (سو تمہارے لیے خیریت میرے طریقہ کی پیروی میں ہے) اور جس کی نگاہ میں میری سنت کی وقعت نہیں جو میرے سنت سے بے رنجی برتے وہ میرے گروہ میں سے نہیں ہے۔“

(بحوالہ: فرمان رسول / سپارہ ڈائجسٹ)

اس شمارے میں.....

2 **القرآن** ضیاء القرآن قرآن ایک مکمل ضابطہ حیات ہے!

3 **الحديث** ادارہ اطاعت رسول ﷺ کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

14 **استک** امجد رؤف خان سانحہ پشاور... دہشت گردوں کے حمایتی رعایت کے مستحق نہیں!

41 **”ریشماں“** کیپٹن لیاقت بیٹیاں یقیناً باعثِ رحمت ہوتی ہیں مگر ان کے لئے جو اس رحمت پر یقین رکھتے ہیں.....!

49 **خود جلیس زیدہ اغیار کو مینا کر دیں** قلندر حسین سید ایسی بے مثال تحریروں کا گلدستہ جنہیں چننے کے لئے درجنوں کتابوں کی عرق ریزی درکار ہوتی ہے!

57 **کچی ٹکلیا** وسیلہ خاتون جیک رچی، منفرد اور تیکھی کہانیاں لکھنے میں عالمی شہرت رکھتے ہیں 22 منٹوں کی ایک دہشت پسند کہانی!



17

حکیم دانائے
حکیم محمد سعید

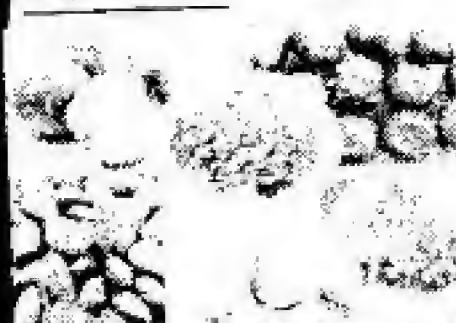
سیارہ رپورٹ

وہ انعام کے طور پر ملے
اور سزا کے طور پر واپس
لے لئے گئے

132

ذہانت تیز کرنے والی غذائیں

ضمیمہ صحت مند



بلا شک ذہانت قدرتی اور پیدائشی ہوتی ہے اور اسے عطیہ خداوندی قرار دینا چاہیے۔ تاہم اس کا صحت مند جسم اور غذا سے گہرا تعلق ہے۔

- 77 "وفا داری" جاوید احمد
دو دلوں کا ماجرا، وہ ایک دوسرے کیلئے بنے تھے مگر
حالات نے انھیں جدا کر دیا تھا.....!
- 83 "زائرے" عارف محمود اہل
اس خوفناک قدرتی آفت سے دنیا بھر میں ہر سال
لاکھوں افراد لقمہ اجل بن جاتے ہیں.....!
- 89 گھر تو آخر اپنا ہے درخشاں انجم
بچی کے بلوں کے ستارے ایک گھرانے کا ماجرا، جو تنگ
آ کر انتقام لینے چلے تھے.....!
- 93 گھٹن کاٹی چوہان
ایک عورت کی کہانی جس کے دل پر ایک غلطی کا بوجھ تھا!
- 125 پی نیو ایر حنا اصغر
میاں بیوی کا فسانہ، اُن کے درمیان شک کی دیوار
حائل ہو گئی تھی.....!
- 129 "نامتھام" مرزا حامد
ایک مجرم کی کہانی، وہ ہر جرم کے بعد یہ کام چھوڑنے
کا پختہ عہد کرتا تھا.....!

خواتین کا راز

174

خواتین قوت سماعت کی حفاظت
کے لیے مچھلی کھائیں تحقیق



☆ سیارہ کچن کارز



بچی دباؤ عورتوں کو سہیلیوں کے
قریب کر دیتا ہے

شاہی کوفتے



پڑا سرکار کہانی

اُچھلتی گڑبڑ

سونی مندر کا آدم خور

135

64

کتاب

دودھ والی خالی گڑبڑ اچھلتی گڑبڑ، ایک نئے سرار رازات کا حیرت انگیز قصہ

ایک درندے کا قصہ جس نے کئی انسانی بستیاں ویران کر دی تھیں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

ایک شخص کا فسانہ جس کی بیوی روز اُٹھتے ہی اسے لازوال مسکراہٹ کیساتھ دیکھتی تھی.....!

نسیم سحر

نایافت

145

ایک کشمیری دوشیزہ کی داستان، وہ شجاعت و بہادری کا پیکر تھی.....!

نوشاہ اختر

اک عہد وفا

151

نواب سعد اللہ خان کی دلہن کی کہانی، جس نے اپنی شادی کے لیے چار سن الاچھی فراہم کرنے کی شرط رکھی تھی.....!

محمد سلیم اختر

”محبت کی معراج“

163

بازوق قارئین کے کلام و انتخاب پر مبنی مقبول ترین سلسلہ!

ادارہ

بزم شاعری

169

ازدواجی زندگی میں صاف گوئی تعلقات میں استواری پیدا کرتی ہے لیکن ہر معاملے میں صاف گوئی نقصان بھی پہنچا سکتی ہے!

ایس۔ امتیاز احمد

بہلا وا.....!

189

بعض مجرم ایسے ہوتے ہیں جن کی وجہ بظاہر سمجھ نہیں آتی، ایک مجرم کا اعتراف نامہ.....!

ندیم شاہ

جنوں رنگ

197

179 حضرت عبدالقدوس گنگوہی

پروفیسر غلام رسول



اللہ کے کامل ولی کی زندگی کے ایمان افروز واقعات جو ہمارے لیے مشعل راہ ہیں

209 میرا کشمیر..... میرا عشق

(وادی نیلم) فرخ صابری



سیارہ ڈائجسٹ کے قارئین کے لیے ”جنت“ سے لایا ہوا اک اشرے خاص

حقیقت کہانی

65



پُر اسرار انتقام

جاوید رانی

بہن بھائی کا قصہ ایک سچے سچے ان ماحول کی زندگی بدل کر رکھ دی تھی!

97

”معصوم لڑکی“

نواز خان

”وہ ایک معصوم اور سادہ دل لڑکی کا متلاشی تھا۔ طویل انتظار کے بعد اسے ایسی لڑکی مل گئی لیکن.....!“



معیار بھی لاشانے

نام بھی لاشانے



www.lashanindustries.com



عرق مہزل

وزن گھٹانی صحت یابی

موٹاپے کو ہم ایک عرصہ تک صحت مندی سمجھتے رہے ہیں لیکن جدید تحقیق نے یہ ثابت کرنا ہے کہ صحت اور موٹاپا دو الگ چیزیں ہیں موٹاپا نہ صرف بیماری ہے بلکہ بہت سی دیگر بیماریوں کی جڑ ہے لاشانی عرق مہزل ہر قسم کے موٹاپے کے لیے مفید ہے اس کو لاشانی فارما کی ریسرچ لیبارٹری کے تجربہ کار سائنس دانوں نے جدید ریسرچ اور کامیاب طبی کلینکل ٹرائل کے بعد پورے اعتماد سے پیش کیا ہے مارکیٹ میں موجود دوسری ادویات سے ممتاز لاشانی عرق مہزل ہر قسم کے مابعد اثرات سے پاک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک بھر کے معالجین کی کثیر تعداد عرق مہزل پر بھرپور اعتماد کرتی ہے۔ اس کے اجزاء صدیوں سے استعمال ہیں لیکن ان کو بہترین طریق اور تناسب سے موٹاپے کے علاج کے لیے پیش کرنے کا سہرا لاشانی کی ریسرچ اینڈ ڈیولپمنٹ ٹیم کے سر ہے۔ لاشانی عرق مہزل کے استعمال سے موٹاپا ختم اور بہترین صحت حاصل ہوتی ہے۔ مریض کسی قسم کی کمزوری محسوس نہیں کرتا کیونکہ لاشانی عرق مہزل نہ تو جلاب آور ہے اور نہ ہی جھوک ختم کرتا ہے بلکہ طبعی طریقے سے جسم کی ساخت میں غیر ضروری تبدیلی (موٹاپا) کو ختم کرتا ہے۔ مطلوبہ وزن کم کرنے کے بعد بھی اس کا استعمال وزن کو دوبارہ بڑھنے سے روکتا ہے اور آپ کو چاب و چوند رکھتا ہے۔ لاشانی عرق مہزل کے استعمال کے ساتھ چکنائی سے پرہیز اور ورزش اس کے اثرات کو دو چند کرتے ہیں۔ جسمانی طور پر موٹاپے کی طرف مائل لوگ لاشانی عرق مہزل کے استعمال سے موٹاپے سے بچ سکتے ہیں۔

ترکیب استعمال:

بچان 30 ملی لیٹر (1/4 کپ) سے 20 ملی لیٹر (1/8 کپ) تین مرتبہ روزانہ

8 سال سے 13 سال تک:

15 ملی لیٹر (1/8 کپ) سے 30 ملی لیٹر (1/4 کپ) 3 مرتبہ روزانہ

عمومی خوراک 20 ملی لیٹر (2 کھانے کے چمچ) 3 مرتبہ روزانہ

ہر قسم کے موٹاپے کی وجوہات کو

کم کرنے کیلئے مؤثر دوا

فون: 042-36581200

042-36581300

فیکس: 042-36581400

پرائیویٹ

لیمیٹڈ

لاشانے فارما



جلد 52 - شمارہ 1 - جنوری 2015ء

وطن آل پاکستان نوز پیمبر سوسائٹی

www.facebook.com/sayaradigest

Email: editorsayyara@yahoo.com

sayaradigest@gmail.com

editorsayyara@hotmail.com

Phone: 92-042-37245412

Mobile: 0300-9430206

مستقل اہمیت کی حامل معیاری اور شگفتہ تحریریں

ماہنامہ سپارہ ڈائجسٹ لاہور

مدیر اعلیٰ : امجد رؤف خان
مدیر منتظم : کامران امجد خان

مدیر : محمد ثاقب

معاون مدیران : جویریہ کامران - رونی خان - فرحان امجد

سرکولیشن منیجر : بشیر احمد

مارکیٹنگ منیجر : خرم احمد خان - 0333-4207684

نگران پرنٹنگ : خالد محمود

طابع : اللہ والا پرنٹرز شاہراہ قائد اعظم لاہور

0333-4207684

0300-4144781

0321-3758492

لاہور : خرم احمد خان -

طارق محمود -

کراچی : محمد عابد مرزا -

شعبہ اشتہارات :

صغیرہ بانو شیریں ز رفیق غوری
ریاض آفندی فیض منیر عارف محمود اہل

مجلس مشاورت

امجد رؤف خان پبلشرز نے اللہ والا پرنٹرز سے چھپوا کر
240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور سے شائع کیا۔

قیمت
80 روپے



سیارہ ڈائجسٹ کی سالانہ خریداری کیلئے بیرون ملک بدل اشتراک

6000/-
روپے

(1) سعودی عرب، کویت، اردن، سری لنکا، ابوظہبی،
بحرین، دبئی، مسقط، قطر، شارجہ، بھارت۔

6000/-
روپے

(2) سوڈان، یوگنڈا، لیبیا، نائیجیریا اور دیگر افریقی ممالک، مشرقی
اور مغربی جرمنی، ڈنمارک، انگلینڈ، ناروے، سویڈن، ملائیشیا،
سوئٹزرلینڈ، سنگاپور، ہانگ کانگ، آسٹریا، برونائی۔

7000/-
روپے

(3) آسٹریلیا، کینیڈا، فجی، نیوزی لینڈ، بہاماز، ونیزویلا،
یونان، امریکہ، نودو، برازیل، چلی، کولمبیا، کیوبا،
ارجنٹائن، میکسیکو، گریناڈا۔

◀◀ بیرون ملک وی پی نہیں جاتی۔ رقم پہلے بھجوائیں۔

◀◀ کتابوں پر ڈاک خرچ خریدار کو ادا کرنا ہوگا۔

◀◀ ڈرافٹ سیارہ ڈائجسٹ لاہور کے نام ارسال کریں۔

240 مین مارکیٹ، ریواز گارڈن لاہور۔

فون: 0423-7245412

E.mail: sayyaradigest@gmail.com

سیارہ ڈائجسٹ



اظہار خیال

خوب سے خوب تر

مدیر اعلیٰ جناب امجد رؤف خان صاحب! السلام علیکم! مزان گرامی! عرض خدمت یہ ہے کہ آپ نے کمال مہربان سے میری لکھی گئی سچی کہانی ”اللہ کے راز“ سیارہ ڈائجسٹ اکتوبر 2014ء میں شائع فرمائی، شکر گزار ہوں۔ دوسری کہانی ”من مٹھری سرائیکی“ کے نام سے ارسال کر چکا ہوں۔ امید ہے کہ پسند آئی ہوگی۔ ایک اور کہانی (سچی) ”چھلتی گزوی“ کے نام سے بھیج رہا ہوں گو کہ مختصر ہے لیکن سو فیصد سچا اور ذاتی واقعہ ہے۔ ضرور شائع فرمادیں۔ ”شہر خموشاں میں تین روز“ کے عنوان سے ذاتی مشاہدات لکھ کر بھیج رہا ہوں۔ امید ہے کہ نوک پلک سنوار کر چھپنے کا موقعہ دیں گے۔ انشاء اللہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہ کر کہانیاں، واقعات، انہونیاں اور قصے بھیجتا رہوں گا۔ منتخب کرنا اور چمکانا آپ کا کام ہے۔

سیارہ ڈائجسٹ پہلے کی نسبت کافی بہتر اور مواد جاندار ہو گیا ہے لیکن یہ ڈائجسٹ ہم تین دوستوں نے مل کر عرصہ دراز سے سالانہ لگوا یا ہوا ہے لیہ کے بک سٹال پر یا کسی پرائیویٹ بندہ کے ہاں نہیں دیکھا جاتا پھر ہمارے شہر لیہ میں یہ شمارہ سرے سے آتا ہی نہیں ہے۔ براہ مہربانی اس کمی کو دور کیا جائے۔ فقط والسلام، دعا گو

(غلام نبی عارف/لیہ)

جمہوریت کے نام پر شہنشاہیت

مجی جناب کا مران صاحب! ”منتظم“ سیارہ ڈائجسٹ ”السلام علیکم! سیارہ ڈائجسٹ کا شمارہ دسمبر

ملا۔ جو زینت مطالعہ ہے! ہاں اکتوبر کے شمارہ میں ٹائٹل جاوید ہاشمی کی تصویر کے لیے مختص تھا اور اندرونی صفحات پر بھی ان کا ذکر پڑھنے کو ملا۔ میں نے بھی ان کی کتاب ”ہاں! میں باغی ہوں“ سے اقتباس لیے جو شمارہ نومبر میں چھپے لیکن افسوس! کہ کمپوزر نے ان کی کتاب کا نام غلط لکھ دیا۔ عمران خان سے علیحدہ ہو کر گوشہ گمنامی میں ہیں۔ شاید اسی کا نام پاکستان میں سیاست ہے۔ ان ہی لوگوں کی وجہ سے قائد اعظم محمد علی جناح کا پاکستان 24 سال کے بعد دو لخت ہوا کیونکہ اکثریت کو اقلیت بنا دیا گیا تھا۔ بنگالیوں نے ہم سے علیحدگی ہی میں اپنی عافیت جانی، آج وہ ہم سے تعلیم میں اور دوسرے شعبوں میں ترقی کر کے آگے ہیں۔ وہ طاغوتی طاقتیں آج بھی برسرِ اقتدار ہیں۔

ملکی حالات ہر روز ایک نیا رخ اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ جمہوریت کے نام پر شہنشاہیت ہے۔ گزشتہ روز خبرواں میں بتایا جا رہا تھا کہ ایک شہری نے قرضہ وصول نہ ہونے پر 24 بچیوں کو اس کے گھر لا بیٹھایا ہے کہ تم ہی ان کے کفیل ہو، کل کو یہی بچیاں جوان ہو کر بچوں کو جنم دیں گی، جہ چہل نے کہا تھا کہ تم مجھے! اچھی مائیں دو اور میں تمہیں اچھی قوم دوں گا۔ وہی قومیں آج بام عروج پر ہیں۔ ڈاکٹر اقبال جب یورپ گئے تھے تو انہوں نے کہا تھا کہ میں نے وہاں اسلام دیکھا لیکن مسلمان نہیں جب وہ واپس وطن آئے تو انہوں نے کہا کہ یہاں میں نے مسلمان دیکھے اسلام نہیں، خیر یہ ایک لمبی بحث ہے۔ اسے کون سلجھائے! میں اس میں الجھنا نہیں چاہتا۔

”خود جلیں دیدہ اغیار کو پینا کر دیں“ کے لیے زاہدہ یوسفی صاحبہ اور کنول صاحبہ نے اپنی خوبصورت آراء دیں ہیں۔ ان کے لیے نیک خواہشات کا اظہار نہ کروں تو بخیل کہلاؤں۔

اگلا شمارہ جنوری 2015ء کا ہوگا، نہ جانے اس وقت ملک میں کیا حالات ہوں گے۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ ملک میں قانون تو ہے لیکن اس کے محافظ نہ جانے کیوں۔ خاموش ہیں نیک خواہشات کے ساتھ۔

(قلندر حسین سید)

تیس فیصد سچ

محترم و مکرم! السلام علیکم! خوبصورت سرورق کے ساتھ سیارہ ڈائجسٹ موصول ہوا۔ ہاشوائی صاحب ٹائٹل پر جلوہ گر تھے۔ ہمارا سیارہ بھی صحیح آن بان اور شان کے ساتھ اپنا آپ دکھاتا ہے۔ خاص الخاص انٹرویو اور سچائی کے سفر کی تلخیص بے انتہا چشم کشا ہے اور گھٹاؤنے کردار کے حامل سربراہان کے چاک گریبان اور ان کے اصل رویوں کے قصے تو قاری کو حیرت میں لے ڈالتے ہیں۔ تمام لکھنے والوں پر سبقت سیارہ ڈائجسٹ کے ادارتی عملہ کے لوگ لے گئے کہ ہاشوائی صاحب جیسی شخصیت اور ان کی زندگی کے سچ سے متعارف کروانے میں آپ نے بڑی مشقت اور محنت اٹھائی ہے اور یہ تو بات سونی صد سچ ہے کہ یہ 30 فی صد کی حد تک ہی رازوں سے پردہ اٹھا سکتے تھے اور 70 فیصد سامنے لانے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ اصل میں یہ تھوڑا بھی پوری تصویر کو اجاگر کرنے کے لیے کافی ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس سے تمام لوگوں کو آگاہی ہونی چاہیے تاکہ اگلے انتخابات تک ہم عام ووٹرز ضمیر کی آواز پر لبیک کہیں اور بے انتہا صاف شہرے اور دردمند دل

رکھنے والے لوگ آگے آئیں۔

عارف اہل کی رپورٹ انتہائی زبردست تھی۔ تھر میں ہلاکتیں، کیا ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ چند دن کی واردات ہے، جی نہیں یہ پچھلے تمام ادوار کی غفلت، بے حسی، بے ایمان اور ظالم لوگوں کی لاپرواہی اور بے توجہی کا شاخسانہ ہے!! ”میرا کشمیر“ والا سفر نامہ تو میں نے ایسا طرز تحریر پچھلے پچاس سال میں بھی نہیں پڑھا۔ واہ!! ایک اور کہانی بھیج رہا ہوں قریبی اشاعت میں شامل کر کے مشکور فرمائیں۔ بے حد دعاؤں کے ساتھ

(جاوید احمد صدیقی)

صفحات بڑھادیں

محترم امجد رؤف خان صاحب، السلام علیکم۔ سیارہ ڈائجسٹ کے دسمبر 2014 کے شمارے میں جناب صدرالدین ہاشوائی کی آپ بیتی پڑھ کر لطف آ گیا۔ واقعی اُن کے پاس ایسے سچ موجود ہیں جو بہت سے لوگوں کی حقیقت بے نقاب کر سکتے ہیں۔ جن صاحب نے بھی اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے اُن کو میری دلی مبارکباد پہنچا دیں کیونکہ یہ کسی طرح بھی محسوس نہیں ہوتا کہ کتاب کو انگریزی سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ یہ سیارہ ڈائجسٹ کا ہی خاصہ ہے کہ ایسی کارآمد چیزیں قارئین کے لیے مہیا کرتا ہے۔ دسمبر کے شمارے میں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ قلندر حسین صاحب دوبارہ اپنے کالم کے ساتھ جلوہ گر ہیں، مگر اُن کے کالم کے صفحات کیوں کم کر دیئے گئے ہیں؟ گزارش ہے کہ قلندر حسین صاحب کے کالم کو ہم بہت شوق سے پڑھتے ہیں اور ان کے کالم سے ہمیں بہت کچھ حاصل ہوتا ہے۔ آپ سے گزارش

وجہ یہ ہر پاکستانی میں بھر جائے تو وطن کے دشمن ملک کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکیں۔ یہ تحریر لکھتے ہوئے دل بہت بوجھل ہے، ایک روز پہلے ہی ملک کے دشمنوں نے پشاور میں آرمی پبلک سکول کے معصوم لڑکوں کو شہید کر دیا۔ 141 ماؤں کے سہوت اُن سے جدا ہو گئے۔ ملک و قوم کا مستقبل تھے۔ یہ بچے جوان ظالموں نے اپنے وحشی پن اور درندگی کی نذر کر دیئے۔ اس وقت پوری قوم کو ایک اور متحد ہونے کی ضرورت ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ سب مل کر ان وطن دشمنوں کے خلاف سیرہ پلائی دیوار بن جائیں۔ ملک پر بڑا کٹھن وقت ہے۔ باہمی اختلافات بھلا کر ان دہشت گردوں کے خلاف فیصلہ کن ضرب لگائی جائے۔

(عشرت فاطمہ/ لاہور)

محترم جناب ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم! امید ہے کہ آپ سب لوگ خیریت سے ہوں گے اور دعا گو ہوں کہ رب کائنات تمام مسلمانوں کو اور بالخصوص تمام پاکستانیوں کو حفظ و امان میں رکھے (آمین)

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ”سیارہ“ اپنی انفرادیت برقرار رکھے ہوئے ہے اور انشاء اللہ یہ انفرادیت برقرار رہے گی کیونکہ میرا مشاہدہ ہے کہ جس کام میں خلوص شامل ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو منزل بہ منزل ترقی عطا فرماتا رہتا ہے آپ نے جو حق و صداقت کے لیے اپنی زندگی کو اپنے قلم کو وقف کیا ہوا ہے انشاء اللہ اس کا اجر اللہ تعالیٰ ضرور عطا فرمائے گا۔ میں تمام سچ لکھنے والوں کا نہایت احترام کرتا ہوں اور ان کے لئے دعائیں کرتا رہتا ہوں۔ صدر الدین ہاشونی صاحب کے لیے اور ان جیسے

ہے کہ کالم کے صفحات کو دوبارہ بڑھا دیا جائے۔
(محمد نعیم مرزا۔ لاہور)

بدلے بدلے انداز

محترم جناب ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم! امید ہے خیریت سے ہوں گے۔ دسمبر کے شمارے میں سیارہ کے انداز کچھ بدلے بدلے سے لگے۔ آپ نے کافی تبدیلیاں کی ہیں جو خوش آئند ہیں۔ کچھ لے آؤٹ اور ڈیزائننگ تبدیل ہوئی ہے اور کچھ نئے ابواب کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے قارئین کی پسند کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ تبدیلیاں کی ہیں۔ پر اسرار کہانی اور خواتین کی دلچسپی کے صفحات پسند آئے۔ اب آپ سے ایک گزارش یہ ہے کہ کوئی سلسلے وار ناول بھی شروع کر دیجئے۔ کوئی تاریخی یا پھر معاشرتی ناول، جو ہمیشہ سیارہ ڈائجسٹ کا خاصا رہا ہے۔ محترمہ شوکت افضل صاحبہ یا فرخ صابری سے بھی لکھوایا جاسکتا ہے۔ یہ دونوں قارئین کی مزاج آشنا ہیں اور تحریر پر گرفتار بھی ان کی مضبوط ہے۔

تازہ شمارے میں ہاشوگروپ کے بانی صدر الدین ہاشونی کی آپ بیتی بہت ہی زبردست رہی۔ انہوں نے اپنی زندگی کے حالات بیان کرنے کے ساتھ ملک کی پوری تاریخ بھی بیان کر دی ہے۔ یہ یقیناً ایک تاریخی دستاویز ہے۔

(انیلا ظہیر/ سرگودھا)

پشاورہ سانحہ

محترم امجد رائف خان صاحب! السلام علیکم! سیارہ ڈائجسٹ کا ہر شمارہ خاص ہوتا ہے دسمبر کا شمارہ بھی بہت ہی زبردست تھا۔ اس کی تمام تحریریں ہی لاجواب تھیں مگر مجھے خاص طور پر نوشاہہ اختر کی دھندلا ہونے والی تصویر نے بہت متاثر کیا۔ کاش یہ جوش

2014 کا سیارہ ڈائجسٹ بڑی آب و تاب سے طلوع ہوا۔ صدرالدین ہاشوانی صاحب کے بارے میں پڑھ کر آنکھیں کھل گئیں کہ پیارے پاکستان کو پستیوں میں دھکیلنے والے کون ہیں؟ ہر حکمران نے اپنے فائدے اور اقتدار کے دوام کے لیے ہمیشہ کاسہ لیسوں کی سرپرستی کر کے ہمارے وطن کو زوال کی راہ پر ہی ڈالا ہے۔ نواز صاحب کی طویل کہانی بہت پسند آئی۔ ادارہ بھی قابل توجہ تھا اور قلم کے حوالے سے انتظامیہ کی نا اہلیوں پر ایک طمانچہ ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ سیارہ کی تمام تحریریں مختلف دنیاؤں سے آشنا کر رہی تھیں۔ اللہ اس رسالے کو مزید ترقی عطا فرمائے اور تمام ٹیم کو اپنے حفظ و امان میں رکھے! آمین! والسلام!

(محمد شعیب خان، واہ کینٹ)

تحریریں کہاں گئیں؟

کامران امجد خان صاحب! السلام علیکم امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا! ماہ دسمبر 2014ء کا ”سیارہ“ ہمارے سامنے ہے خوبصورت ٹائٹل اور شاعری کا انتخاب لا جواب رہا۔ ماہ نومبر 2014ء میں ہماری تحریر نہ لگ سکی؟ دسمبر 2014ء میں ہماری تحریر تو لگی، سیارہ کے آخری صفحات پر مگر اس کا فہرست میں کوئی ذکر نہ تھا.....؟

بہر حال بہت شکریہ..... اعزازی کا پی بھی تک نہ مل سکی.....؟ اور نہ آئی.....!

میٹرز آپ کے پاس ہیں پلیز دیکھئے گا، اقریبی اشاعت میں جگہ دیں آپ کو اور دیگر شاف اور ”سیارہ“ کے تمام خوبصورت لکھنے والوں کو پیشگی نیا سال مبارک اور تمام خوبصورت پڑھنے والوں کو دعا سلام۔



تمام لوگوں کے لیے دعا کرتا ہوں کہ جن لوگوں نے پیارے وطن کے لیے نامساعد حالات کے باوجود اپنی زندگیاں وقت کیس اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو دونوں جہانوں کی خوشیاں عطا فرمائے (آمین ثم آمین)

”دستک“ بہت خوب جارہا ہے لیکن ”دستک“ کے لیے مزید صفحات کی ضرورت ہے۔ اگر ممکن ہو سکے تو ”ہاشوانی“ صاحب کی کتاب کے چند ورق اور شائع فرما دیجئے ابھی تشنگی برقرار ہے۔ نواز خان صاحب بہت اچھے جارہے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ سیارہ نواز صاحب اور نواز صاحب سیارہ کی پہچان بنتے جارہے ہیں۔

تحریریں تمام اچھی اور نہایت اچھی ہیں اگر سب کی تعریف کرنے لگوں تو شاید میرا خط شائع ہی نہ ہو اگر شائع ہو بھی تو آپ کو ”کینچی“ کی ضرورت پڑ جائے۔

شاعری بھی معیاری پڑھنے کو مل رہی ہے اور اس طرح ماضی اور حال ہمارے سامنے ہوتا ہے اور اس طرح ہم اپنی خامیوں کی خود تصحیح کر سکتے ہیں اور اردو ادب کے شہ پارے ہمیں پڑھنا نصیب ہو جاتے ہیں۔ خط کو طوالت سے بچاتے ہوئے اتنا کہوں گا کہ ایک قاری کو جو کچھ چاہیے ہوتا ہے وہ ”سیارہ“ میں موجود ہوتا ہے۔

آپ کا نہایت شکر گزار ہوں کہ آپ میری تحریروں کو بھی اشاعت کا موقع عنایت فرما رہے ہیں جبکہ ایک طالب علم کی تحریروں کو اشاعت کا موقع ملنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

ایک تحریر اور ارسال کر رہا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ جلد شائع ہو جائے گی۔ نہایت شکر گزار۔

(نیر رضاوی/کراچی)

صدرالدین ہاشوانی کی آپ بیتی

محترم ایڈیٹر سیارہ ڈائجسٹ! السلام علیکم! دسمبر



سانحہ پشاور..... دہشت گردوں کے حمایتی رعایت کے مستحق نہیں!

ملک میں اس وقت ایک قیامت برپا ہے، ہر پاکستانی خون کے آنسو رو رہا ہے۔ بالخصوص اُن 142 گھرانوں کی تکلیف اور آزمائش کا محض اندازہ ہی کیا جاسکتا ہے جن کے پیارے پشاور کے سکول میں ہونے والی دہشت گردی کی واردات کی نذر ہو گئے ہیں 132 بچے..... ماؤں کے جگر گوشے، قوم کے مستقبل کی اُمید، جنہوں نے آگے چل کر اپنے والدین کے خواب پورے کرنے کے ساتھ ساتھ ملک کی تعمیر و ترقی بھی کرنی تھی..... انہیں وحشی درندوں نے سکول سے سیدھا جنت میں پہنچا دیا۔ جوٹے چھوٹے بچے جن کی عمریں ابھی کھلونوں سے کھیلنے کی تھی انہیں ایک آسان ہدف سمجھتے ہوئے ان دہشت گردوں نے باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ شہید کر دیا۔ یہ ملک کی تاریخ کا بدترین سانحہ ہے۔ سکول میں معصوم بچوں کا قتل عام کرنے کے لیے یہ دہشت گرد کہاں سے اتنا پتھر دل لائے ہوئے..... اس بربریت سے ظاہر ہوتا ہے یہ لوگ کیسے درندے اور ظالم ہیں، ان کی سوچ کیا ہے، یہ لوگ کس حد تک جہالت کے اندھیروں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

افسوس..... صد افسوس کہ اس سب کے باوجود آج بھی کچھ لوگ ہمارے اندر بیٹھ کر، ہماری صفوں میں موجود رہ کر ان دہشت پسندوں کی حمایت کرتے ہیں۔ ان کی بربریت کا جواز پیش کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ انہیں اس کام پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ جب اُن سے پوچھا جاتا ہے کہ کس نے مجبور کیا ہے تو فرماتے ہیں کہ امریکہ نے مجبور کیا ہے، اور چونکہ آپ کا ملک امریکہ کا اتحادی ہے اس لیے وہ آپ کو بھی نشانہ بنانے پر مجبور ہیں۔ ان حمایت کرنے والے عقل کے

اندھوں سے کوئی پوچھے کہ اگر امریکہ نے انھیں مجبور کیا ہے تو جائیں جا کر امریکہ سے لڑیں، وہ افغانستان میں بیٹھا جہاں سے یہ آتے ہیں، کریں اُس سے براہ راست جنگ، بنائیں انھیں نشانہ۔ معصوم اور کمزور بچوں کو پاکستان میں نشانہ بنانے کا کیا مقصد ہے۔ ان کی حمایت کرنے والے کہتے ہیں، یہ ہمارے ہی بھٹکے ہوئے بھائی ہیں جو مذاکرات اور ان کے خلاف کارروائیاں ختم ہونے سے واپس آ جائیں گے۔ ان سے کوئی پوچھے اپنا بھائی بھی ہو تو کیا ایسے معصوم بچوں کو شہید کرنے، سینکڑوں ماؤں کی گواہی جانے اور وحشت و بربریت کا ایسا مظاہرہ کرنے پر اسے معاف کیا جاسکتا ہے؟ ہرگز نہیں، اسی وحشیانہ پن کا اس کے علاوہ کوئی علاج نہیں کہ پوری قوم ان کے خلاف سیمہ پلائی دیوار بن کر گھڑی ہو جائے اور ان وحشیوں کو پوری طاقت کے ساتھ صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے۔ آپ انھیں اپنا بھائی کہتے ہیں تو آپ بھی ظالم ہیں کیونکہ ظلم کی حمایت کرنے والا بھی ظالم ہوتا ہے۔ اب مزید ان لوگوں کے حق میں دلیل برداشت نہیں کی جائے گی کیونکہ یہ دہشت گرد ہماری اسی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کبھی امریکہ کے نام پر اور کبھی مذہبی بھائی چارے کے نام پر ان ظالموں کو تحفظ دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن اب پاکستان مزید ایسے عناصر کو برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ ظالم اس قابل ہیں اور نہ ان کی حمایت کرنے والے۔ ان کی حمایت کرنے والوں کا بھی سماجی سطح پر مکمل بائیکاٹ کیا جانا ضروری ہے۔ تاکہ دہشت گردوں کو یہ واضح پیغام ملے کہ اب قوم ان کے خلاف مکمل طور پر متحد ہے۔

پشاور کے آرمی پبلک سکول پر ہونے والا یہ ظالمانہ حملہ اس قدر شیانہ ہے کہ اس پر پوری دنیا کا مہذب یا بھی چیخ اٹھا ہے اور دنیا کے تمام ممالک نے اس کی مذمت کی ہے۔ ملک کی تمام سیاسی جماعتوں نے بھی باہمی اختلافات اور محاذ آرائی کو چھوڑ کر اس مشکل گھڑی میں متحد ہو کر مشترکہ رائج عمل اپنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا واقعی یہ لوگ اس بار حقیقتاً اس عفریت کے خلاف متحد ہو سکیں گے جس نے ملک کو کھوکھلا کر رکھ دیا ہے۔ یا پھر محض باتیں ہوگی، تقریریں کی جائیں گی، اگر مگر کے سوال اٹھائے جائیں گے اور ایک دوسرے پر الزام تراشیوں کے نعروں میں ماؤں کی سسکیاں اور ننھے شہیدوں کا غم بھلا دیا جائے گا۔

ڈی جی آئی ایس پی آر میجر جنرل عاصم سلیم باجوہ کا کہنا ہے کہ ہمیں چتہ چل گیا ہے کہ دہشت گردوں کو کون لوگ کنٹرول کر رہے تھے، ان کے مددگار کون تھے، وہ کن سے ہدایات لیتے رہے۔ ہم اُن کو مانیٹر کر رہے تھے اور اب ہم اُن کا ملک کی سرحدوں سے باہر بھی پیچھا کریں گے۔ قوم کے نونہالوں کے خون کا بدلہ لیں گے۔ اُن کا کہنا ہے کہ دہشت گرد فوجی وردیوں میں آئے، اُن کے پاس کئی دن کا راشن اور اسلحہ بارود تھا۔ وہ بچوں کو برغمال بنانے نہیں بلکہ شہید کرنے کی نیت سے ہی آئے تھے۔ انھوں نے آتے ہی بچوں کو گولیوں کا نشانہ بنانا شروع کر دیا

اور چھپے ہوئے، بچوں کو بھی چُن چُن کر نشانہ بناتے ہیں۔ ان لوگوں کا مسلسل اپنے کنٹرول کرنے والوں سے رابطہ تھا۔ فورسز اپنے طور پر ان دہشت گردوں کے خلاف لڑ رہی ہیں، اب حکومت، اپوزیشن اور عدلیہ کو بھی اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔

پاک فوج نے آپریشن ضرب عضب کے نام سے دہشت گردوں کے خلاف فیصلہ کن جنگ کا اعلان کر رکھا ہے اور اس حوالے سے پچھلے کچھ عرصہ میں ہماری فوج کو مسلسل کئی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ ہم نے دہشت گردوں کی پناہ گاہیں ختم کیں، کئی سرکردہ دہشت گردوں کو ہلاک کیا گیا اور فورسز نے کئی علاقوں کو ان دہشت گردوں سے پاک بھی کر دیا۔ ان کامیابیوں ہی کی بدولت پچھلے کچھ عرصہ سے پاکستان میں دہشت گردی کی وارداتوں میں نمایاں کمی ہوئی تھی مگر اب پھر..... ان دہشت گردوں نے وقفہ کے بعد ایک بھرپور سفاکانہ حملہ کیا ہے۔ یقیناً اس واردات نے قوم کو ہلا کر رکھ دیا ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ اس سانحہ نے قوم میں 65ء کی جنگ کا سا جذبہ بھر دیا ہے۔ پشاور کے معصوم بچے اب سب پاکستانیوں کے بچے ہیں، سب کو ان کا برابر دکھ ہے اور اب سب ان دہشت گردوں سے اس کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ اب کوئی ان کے لیے ”سافٹ کارنر“ نہیں دیکھنا چاہتا اور ان کی حمایت کرنے والوں کو بھی بخوبی اندازہ ہو گیا ہے کہ ایسی حمایت کو اس ملک میں برداشت نہیں کیا جائے گا۔

طالبان اور ان کی طاقت کمزور پڑ رہی ہے، یہ درندے اب اپنی بقا کے لیے جنگ لڑ رہے ہیں مگر اب اُن کا حتمی انجام بہت قریب ہے۔ پشاور کے آرمی پبلک سکول کے ننھے شہیدوں سے قوم کا یہ وعدہ ہے کہ ان کے قاتلوں کو اب معاف نہیں کیا جائے گا۔ ملک کو ان درندوں سے جلد نجات مل جائے گی۔ انشاء اللہ۔

امجد رؤف خان



چیرمین یونی فوم کو مبارکباد

چیرمین یونی فوم انڈسٹریز خالد رشید شیخ حج کا مقدس فریضہ ادا کر کے واپس آئے ہیں۔ ادارہ انہیں اس مقدس فرض کی ادائیگی پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔ (ادارہ)



حکیم دانا..... حکیم محمد سعید وضعداری اور جامہ زمبی حکیم سعید پر ختم تھی!

کرامت اللہ غوری

حکیم صاحب کی وضعداری اور شرافت کے قصے تو ہم نے کراچی میں ہوش سنبھالنے کے بعد سے بہت سنے تھے۔ اپنے خاندان کے ان بزرگوں کو، جو حکیم سعید کے مطب ہمدرد پران سے مشورہ کرنے اور نسخہ لکھوانے کے لیے جایا کرتے تھے، یہ کہتے اکثر سنا تھا کہ ان کا آدھا مرض تو حکیم صاحب کے لہجے کی مٹھاس اور سلوک کی اپنائیت سے ہی ختم ہو جاتا تھا لیکن حکیم صاحب سے میری ملاقاتوں کا سلسلہ کویت سے شروع ہوا، جہاں وہ اکثر بلوائے جاتے تھے!

کویت میں حکیم سعید کی کیا قدر و منزلت تھی، اس کا احساس اس والہانہ اور پُر تپاک استقبال کو دیکھ کر ہوتا تھا جو شیوخ عرب کی روایتی مہمان نوازی سے بھی بڑھ کر حکیم سعید کے لیے دلوں میں موجزن خیر سگالی کے جذبات کا آئینہ دار تھا۔ حکیم سعید کے مراسم کویت کے شاہی خاندان سے خصوصی تھے اور وہ لوگ جو محرم راز درون مینانہ تھے اکثر ترنگ میں آ کر کہا کرتے تھے کہ حکیم صاحب نے اپنے نسخوں سے کویت کے شیوخ کو اپنا متوالا اور مرید بنا رکھا ہے!

لیکن حکیم صاحب نے صرف نسخے ہی تجویز نہیں کیے تھے، وہ کویت میں اس طب اسلامی کے مرکز کے روح رواں اور ایک اعتبار سے خالق تھے، جو طب یونانی کے مختلف شعبوں میں جدید ریسرچ اور تحقیق کا کام کرنے کے اعتبار سے پورے عالم اسلام میں بکاۃ روزگار تھا۔ اس مرکز کے تصور قیام سے لے کر منصوبے کے اختتام تک کے تمام مراحل حکیم صاحب کی نگرانی میں گزرے تھے اور سرخرو ہوئے تھے!

لیکن کویتی آخر کو کویتی ہیں اور عالم عرب میں ان کی شہرت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ درہم و دینار کے معاملہ میں وہ یہود کو بھی مات دے سکتے ہیں۔ حکیم صاحب سے کویتی حکمرانوں نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ حکیم صاحب کی زندگی کے سب سے بڑے مشن، یعنی کراچی کے مضافات میں بننے والے مہیہ الحکمت کے لیے ان کی مساعی میں بھرپور حصہ لیں گے اور اس جدید جامعہ میں آڈیو ریم اردو کانفرنس سنٹر کے لیے تمام تر وسائل مہیا کریں گے لیکن یہ وعدہ کویت پر عراقی حملے اور قبضے سے پہلے کیا گیا تھا۔ اس کے بعد تو کویتیوں کا مزاج ہی بدل گیا تھا۔ وعدے وعید زیادہ تر بھول گئے۔ ہمارے وزیراعظم نواز شریف سے بھی انہوں نے وعدہ کیا تھا، جب میاں صاحب امیر کویت سے ان کی جلاوطنی کے قیام طائف میں ملاقات کے لیے گئے تھے کہ عراق

سے آزادی ملنے کے بعد وہ پاکستانیوں کو کویت واپسی کے لیے دیدہ دل فرش راہ کر دیئے لیکن آزادی کے بعد ان سے پاکستانیوں کی واپسی کے لیے ویزوں کا حصول ایک کارِ لا حاصل ثابت ہو رہا تھا۔ جس پر میاں صاحب نے حکم جاری کیا تھا کہ کسی ایسے افسر کو فوری طور پر سفیر بنا کر وہاں بھیجا جائے جو پہلے وہاں رہ چکا ہو اور قریہ قال اس حقیر پر تقصیر کے نام لکھا تھا۔

حکیم صاحب کو بھی کویتی، وسائل کی فراہمی کے باب میں ترسار ہے تھے اور اسی تناظر میں حکیم صاحب اکثر کویت آیا کرتے تھے لیکن کیا مجال ہے کہ دوستوں کے اس غیر دوستانہ برتاؤ پر ان کی پیشانی پر کبھی ایک نل بھی پڑا ہو۔ ہمیشہ مسکراتے ہوئے ہر چھوٹے بڑے کویتی صاحب حل و عقد سے ملاقات کرتے تھے اور اس خوش اسلوبی اور شرافت کے ساتھ اپنا مدعا اس کے سامنے رکھتے تھے کہ وہ شرمندگی سے پانی پانی ہو جاتا تھا!

اور رتبہ جامہ زمینی..... تو وہ تو نظر آیا کرتی تھی.....! پہلی ملاقات کے بعد میں نے یہ دستور بنالیا تھا کہ ان کے استقبال کے لیے کویت کے ہوائی مستقر پر انہیں خوش آمدید کہتا تھا..... حکیم صاحب اپنی سفید اچکن میں سر تا پا پاکیزگی اور طہارت میں ملبوس جہاز سے برآمد ہوتے تھے۔ اچکن ہی سفید نہیں ہوتی تھی۔ گرتا چوڑی دار پا جامہ مزے اور ہوتے سب سفید ہوتے تھے! اور رہا سامان سفر تو وہ ایک چھوٹی سی اٹیچی ہوتی تھی جس میں ایک اور سفید اچکن اور گرتے پا جامے کے ایک جوڑے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ پہلی بار جب میں نے اس مختصر زادِ سفیر پر جبریت کا مظاہرہ کیا..... اس لیے کہ میں نے تو اپنی سفارتی زندگی میں ہمیشہ یہ دیکھا تھا کہ ہمارے VIPs سامان سفر کے بوجھ سے ملکان جہاز سے اُترا کرتے تھے، تو حکیم صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا ”میاں! ایسے سفر میں بھی اور زندگی کے سفر میں بھی سامان جتنا کم ہوتا اچھا ہے..... بوجھ لادنے سے تو ویسے ہی صحت خراب ہو جاتی ہے!“۔

وہ جسمانی صحت اور بشرے کی وجاہت کا بے داغ نمونہ تھے۔ ان کا معمول یہ تھا، غذا کے معاملہ میں کہ صبح ناشتہ میں ایک سیب یا کیلا اور دودھ کا ایک گلاس پیتے تھے۔ دن کا کھانا یا لچ ان کی لغت میں ناپید تھا۔ دن بھر کے کام کے بعد صرف رات کو مکمل کھانا نوش کیا کرتے تھے۔ مجھے بھی انہوں نے نصیحت یہی کی تھی کہ کرسی پر بیٹھ کر کام کرنے والوں کے لیے تین وقت پوری غذا کھانا ایسے ہی ہے جیسے کوئی زہر پابندی سے لینے لگے اور حکیم صاحب کی یہ نصیحت اس دن سے میری گرہ میں بندھی ہے اور میرے لیے اچھی صحت کی سب سے بڑی ضامن ہے!

ان کی سادگی صرف خوراک اور لباس تک ہی محدود نہیں تھی! جہاز میں سفر کرتے تھے تو ہمیشہ اپنی جیب سے ٹکٹ خرید کر۔ اکانومی کلاس میں، ایک دوبارہ اس حیثیت میں بھی کویت تشریف لائے جب وہ سندھ کے گورنر تھے لیکن کیا مجال کہ سرکار سے ٹکٹ لیا ہو یا کوئی ADC ان کے پیچھے پیچھے ہاتھ باندھ کر چل رہا ہو، ورنہ ان آنکھوں نے تو بارہا ایسے وزیروں کو دیکھا تھا کہ کبھی تن تنہا سفر نہیں کر سکتے تھے۔ سرکار کے خرچ سے شاہانہ عیاشی عام تھی اور ایک آدھ دم چھلا بریف کیس اٹھانے کو یوں ساتھ ساتھ چلتا تھا جیسے گدھے کے ساتھ اس کی گچ ہو!

کویتی حکیم صاحب کی یہ خدمت کرتے تھے کہ ان کے لیے ہمیشہ کے لیے فائیو سٹار ہوٹل میں ایک سوئٹ تیار رہتا تھا لیکن حکیم صاحب تو مردِ درویش تھے۔ آرام دہ موٹے گدوں والے بستر پر سونے سے انہیں نیند نہیں آتی تھی۔ میں نے اکثر ان کے ہوٹل کے سوئٹ کے بیڈروم میں یہ منظر دیکھا تھا کہ حکیم صاحب نے نیچے قالین پر

ایک چادر بچھا رکھی ہے اور اس پر استراحت فرما رہے ہیں! میں سوال کرتا تھا ”حکیم صاحب یہ کیا بات ہے کہ آپ کو بستر کے گدے سے بالکل رغبت نہیں ہے؟“ جواب میں وہ اپنے مخصوص تبسم کے ساتھ کہتے تھے ”میاں! عمر بھرا۔ تنے گداز گدے کی عیاشی نہیں کی اور پھر فرش پر سونے کی عادت رہے تو اچھا ہے آخر کو تو ایک دن مٹی پر ہی سونا ہوگا۔“

حکیم صاحب کو خون میں نہلا کر مٹی کے بستر پر سنانے والے بد بخت قاتلوں کو کیا علم ہوگا کہ یہ مرد درویش ہمیشہ سے سنت بوتراپ کا مقلد رہا تھا۔ کمال درویشی تھی حکیم صاحب کی فطرت میں۔

میں جانتا تھا کہ زندگی بھر میں لے دے کے جو ایک مکان انہوں نے بنوایا تھا وہ بھی اپنے جیتے جی اپنی اکلوتی اولاد سعدیہ بیٹی کے نام کر دیا تھا۔ اس مکان میں بس ایک کمرہ ان کے اپنے استعمال میں تھا اور اس کمرہ میں بھی ان کی کتابوں کا قبضہ زیادہ تھا۔

ہمدرد ٹرسٹ کا ایک ایک پیسہ اس مددِ الحکمت کی تعمیر اور ان بہت سے فلاحی اداروں اور انجمنوں کے پانے پوسنے میں استعمال ہوتا تھا جو پاکستان بھر میں حکیم صاحب کی سرپرستی میں چل رہے تھے۔ روپے پیسے سے انہیں نام کو بھی رغبت نہیں تھی۔ ایک واقعہ اس ضمن میں جو میری یادداشت میں ہمیشہ محفوظ رہے گا اور جسے میں نے ان کی شہادت کے بعد ان پر لکھے گئے تعزیت نامے میں بھی شامل کیا تھا..... ان کی فقیری اور مال و منال سے بے رغبتی کی روشن مثال ہے۔

حکیم صاحب اپنے کویتی میزبانوں سے اپنی خدمات کا کوئی معاوضہ لینا حرام سمجھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کویت کے طب اسلامی کے مرکز میں ایک بہت بڑی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا تھا جس میں دنیا بھر سے طب یونانی کے ماہرین اور زعماء مذہب کے گئے تھے۔ حکیم صاحب اس کانفرنس کے کلیدی خطیب تھے اور ان کے ہر مغز مقالے کو بے حد سراہا گیا تھا۔ میں اس کانفرنس کے ہر اجلاس میں حکیم صاحب کے ساتھ ساتھ رہا تھا۔ کانفرنس کے اختتام پر شام کو کویت کے معروف میریڈین ہوٹل میں استقبالیہ تھا۔ کانفرنس کے تمام شرکاء موجود تھے۔ سفراء اور کابینہ کے اراکین بھی شریک محفل تھے۔ حکیم صاحب اور میں چند لوگوں کے ساتھ محو گفتگو تھے کہ منتظمین کانفرنس میں سے ایک صاحب ”آئے اور حکیم صاحب کو ایک طرف کونے میں لے جا کر ان کے ہاتھ میں ایک موٹا سا سفید لفافہ تھما نا چاہا۔ حکیم صاحب نے پوچھا کہ لفافہ میں کیا ہے؟ انہوں نے جواب میں کہا کہ کانفرنس کے تمام شرکاء کو نذرانہ دیا جا رہا تھا سو حکیم صاحب کے لیے وہ ہدیہ پیش کر رہے تھے۔“

حکیم صاحب نے لفافہ قبول کرنے سے انکار کر دیا، یہ کہہ کر کہ وہ کسی نذرانے یا ہدیے کے لیے کانفرنس میں شریک نہیں ہوئے تھے! وہ صاحب اس وقت تو وہاں سے چلے گئے لیکن کچھ دیر کے بعد پھر ایک چکر کاٹ کر آئے۔ اس وقت میں حکیم صاحب سے کچھ فاصلے پر کھڑا کسی اور شریک استقبالیہ سے بات کر رہا تھا۔ وہ صاحب تیر کی طرح میرے پاس آئے اور وہی لفافہ میرے ہاتھ میں تھما کر بڑی لجاجت سے بولے ”سفیر صاحب! حکیم صاحب کو آپ ہی قائل کر سکتے ہیں کہ وہ یہ ہدیہ قبول کر لیں۔“

میں نے لفافہ لے کر اپنے تجسس کو مٹانے کے لیے اسے کھول کر دیکھا کہ اس میں تھا کیا۔ پانچ ہزار ڈالر سو سو کے کرارے نوٹوں کی شکل میں لفافہ میں تھے۔ میں حکیم صاحب کو ایک کونے میں لے گیا اور انہیں لفافہ تھماتے ہوئے بتایا کہ وہ منتظم صاحب کس اصرار کے ساتھ مجھے دے گئے ہیں۔ حکیم صاحب نے یہ دیکھے بغیر کہ اس میں

کتنی رقم ہے مجھ سے کہا ”ان حضرات کو یہاں بلائیے!“۔

میں لپک کر اس غریب کو پکڑ کر حکیم صاحب کی خدمت میں لے آیا۔ وہ حیران پریشان تھا لیکن حکیم صاحب نے کمال شفقت سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ”دیکھئے! یہ ہمارے سفیر کبیر یہاں موجود ہیں اور میں انہیں گواہ بنا کر آپ سے التجا کر رہا ہوں کہ یہ رقم جو آپ مجھے معاوضے کے طور پر دینا چاہتے ہیں، میری طرف سے اپنے طب اسلامی مرکز کے غریب طلباء کے بہبود فنڈ میں جمع کرادیں۔ میرا انعام مجھے مل جائے گا۔“ وہ غریب ہکا بکا کبھی حکیم صاحب کو دیکھ رہا تھا کبھی مجھے، وہ شاید یقین نہیں کر پا رہا تھا کہ کسی انسان کا ظرف اتنا بلند بھی ہو سکتا ہے کہ وہ گھر آئی لکشمی کو یوں بے نیازی سے لات مار دے۔ شاید اس کی زندگی کا پہلا اور آخری تجربہ تھا جس میں انسان کا قد کاٹھ دولت اور روپے پیسے کے مقابلے میں کہیں زیادہ بلند اور ارفع تھا! میں اس کے چہرے پر آتے جاتے رنگ دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ شخص اُردو داں ہوتا تو اس لمحہ میں اسے میرا صاحب کا یہ شعر ضرور یاد دلاتا:

پیدا کہاں ہیں۔ ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو مجھ سے صحبت نہیں رہی

حکیم صاحب کی شہادت کا سانحہ ان کے دوستوں، مداحوں اور قدردانوں کے لیے قیامت صغریٰ سے کم نہیں تھا۔ میں اس زمانے میں عراق میں سفیر تھا اور بغداد میں مجھے یہ اطلاع بین الاقوامی نشریاتی اداروں کے توسط سے ملی تھی۔ اس کے کچھ عرصے بعد میں جب دوستوں سے ملاقات کے لیے کویت گیا تو وہاں حکیم صاحب کے ایک بہت ہی عزیز اور قریبی دوست ڈاکٹر عبدالرحمان العوضی میرے منتظر تھے۔ ڈاکٹر العوضی ایک طویل عرصے تک کویت کے وزیر صحت رہے تھے اور انہی کے دور وزارت میں طب اسلامی کے مرکز کا منصوبہ پایہ تکمیل کو پہنچا تھا۔ حکیم صاحب اور ڈاکٹر العوضی میں بہت قربت تھی، بہت دوستی تھی اور مجھے نہیں یاد پڑتا کہ کبھی ایسا ہوا ہو کہ حکیم صاحب کویت تشریف لائے ہوں اور ڈاکٹر العوضی نے ان کے اعزاز میں پرکلف عشاء یہ نہ دیا ہو۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر العوضی کے ہاں میری اور حکیم صاحب کی نجی نشستیں الگ رہا کرتی تھیں۔ حکیم صاحب اس حوالے سے مجھ پر بھی بہت مہربان تھے اور خصوصی شفقت اور محبت سے ملا کرتے تھے!

حکیم صاحب کی رحلت کے بعد ڈاکٹر العوضی سے اپنی پہلی نشست میں ہم دونوں گھنٹوں حکیم صاحب کی باتیں کرتے رہے اور انہیں یاد کر کے کڑھتے رہے اور پھر اچانک ڈاکٹر صاحب نے وہ جملہ کہا جو میں سمجھتا ہوں کہ حکیم صاحب قبلہ کی لوح مزار پر کندہ ہونا چاہیے تھا، فرمانے لگے:-

”حکیم (وہ حکیم صاحب کو ہمیشہ حکیم کہتے تھے، کبھی ان کے نام کی اضافت نہیں لگاتے تھے) انسان نہیں فرشتہ تھا..... خدا نے اسے ایک مشن پر یہاں بھیجا تھا اور مشن پورا ہو جانے پر واپس اپنے پاس بلا لیا..... ایسے لوگ خدا روز روز پیدا نہیں کرتا!“

نہیں..... میری دانست میں تو حکیم صاحب وہ انسان تھے جس پر فرشتے رشک کرتے ہوں گے۔ خوش خلقی میں حرف، آخر۔ مروت اور لحاظ میں لاثانی اور فقیری میں سلطانی اور سلطانی میں درویشی کا اعجاز ان ہی کی کرامت تھی۔

2 ستمبر 1993 کو کراچی میں میری بیٹی تزئین کی شادی طے تھی۔ میں نے اس سے کئی ہفتے پیشتر حکیم صاحب

کو اس کا نبوتہ بھی بوا دیا تھا اور ان کا فوری جواب بھی آ گیا تھا کہ وہ ضرور شرکت کریں گے۔ شادی کی تاریخ سے ایک دن پہلے ان کے ADC کا میرے پاس فون آیا کہ حکیم صاحب بات کرنا چاہ رہے ہیں۔ وہ اس وقت سندھ کے گورنر تھے۔ فون پر کہنے لگے کل مجھے حیدرآباد (سندھ) جانا ہے۔ دن بھر میرا وہیں گزرے گا لیکن میں شادی میں آؤں گا ضرور، ہوائی اڈے سے سیدھا شادی ہال پہنچ جاؤں گا۔ آپ چنداں پریشان نہ ہوں۔ ہاں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ اس لیے کہ حیدرآباد میں تقریب ایسی ہے کہ مجھے دوپہر کا کھانا وہیں کھانا پڑے گا اور آپ جانتے ہیں کہ میں دن میں دو کھانے نہیں کھاتا۔

اور انہوں نے جو کہا تھا وہی کیا۔ ہوائی اڈے سے سیدھے شادی کے پنڈال پہنچ گئے۔ آئے تو مجھ سے کہنے لگے ”بہت تھک گیا ہیں، زیادہ نہیں رکوں گا، لیکن جب اوپر سٹیج پر دولہا دلہن کے ساتھ بیٹھے تو گھنٹے بھر تک جم کر بیٹھے رہے۔ ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ محفل میں شریک ہر مرد وزن بوڑھا اور بچہ ان کے ساتھ تصویر اتروانے پر مصر تھا اور انکار کرنا یا کسی کا دل توڑنا تو ان کی شریعت میں تھا ہی نہیں۔ جانے سے پہلے میری بیٹی اور داماد کو دعاؤں کا توشہ دینے کے ساتھ ساتھ تحائف سے بھی مالا مال کر کے گئے۔

وہ اس دنیا کو بھی بہت کچھ دے کر گئے اور آخرت کے سفر میں، زاد سفر میں لے گئے، دوستوں کے وہ آنسو جوان کی شہادت پر بے حساب بہائے گئے۔

انہیں بخوبی اندازہ تھا کہ کون لوگ ان کے دشمن ہیں اور انہیں اپنے راستے کا کاٹنا سمجھتے ہیں! ایک بار کویت میں ان کے قیام کے دوران میری اور ان کی اسی موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی تو بڑی ترنگ میں فرمانے لگے ”میں نے وزیراعظم بے نظیر بھٹو (یہ بے نظیر کے دوسرے عہد وزارت کی بات ہے) سے کہہ دیا ہے کہ میں ایک بند لفافہ میں ان لوگوں کے نام لکھ جاؤں گا جو میرے خون کے پیاسے ہیں اور میرے مارے جانے کے بعد وہ لفافہ کھول کر دیکھ لیں گے تو جان جائیں گے کہ میرے قاتل کون ہیں؟

بے نظیر کو شاید وہ لفافہ کبھی ملا ہی نہ ہو..... مجھے یقین ہے کہ حکیم صاحب نے ایسا کوئی لفافہ بے نظیر کے لیے نہیں چھوڑا ہوگا۔ اس لیے کہ انسان دوستی اور مروت و ہمدردی کے جس اوج کمال پر وہ فائز تھے، وہاں اپنے خون کے پیاسے دشمنوں پر انگلی اٹھانا بھی ان کی شرافت طبع پر بہت بھاری رہا ہوگا!

ایک بار اسی دور میں جب وہ سندھ کے گورنر تھے اور بے نظیر ملک کی وزیراعظم تھیں۔ یہ افواہ اُڑ گئی کہ حکیم صاحب پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ حکیم صاحب صرف گھائل ہوئے ہیں۔ کسی کا کہنا تھا کہ حملہ جان لیوا ثابت ہوا۔ میں نے بھی جیسے ہی یہ خبر سنی گھبرا کر کراچی فون کیا، جہاں ان سے تو بات نہیں ہو سکی مگر ان کے قریبی ذرائع نے تقہر لیتی کی کہ حکیم صاحب بخیر و عافیت ہیں!

اس افواہ کے کچھ ہی عرصہ بعد حکیم صاحب پھر کویت تشریف لائے تو میں نے اس افواہ کے بارے میں پوچھا۔ حکیم صاحب ہنس کر کہنے لگے ”اللہ کا شکر ہے کہ بات افواہ تک ہی رہی، دشمنوں کے عزائم پورے نہیں ہوئے۔“

پھر تھقہ لگا کر بولے ”بے نظیر اس دن کہیں افریقہ کے کسی ملک میں کانفرنس میں تھیں۔ ان کا بھی میرے پاس فون آیا۔ گھبرا کے پوچھنے لگیں ”حکیم صاحب! آپ کہاں ہیں؟ خیریت سے تو ہیں“ تو میں نے تفریح لینے کے لیے جواب میں کہا: میں اس وقت جنت سے بول رہا ہوں اور یہاں یہ دیکھنے کے لیے آیا ہوں کہ میرے دشمن

آپ ادب نواز ہیں! آپ علم دوست ہیں!

ہم آپ کو سیارہ ڈائجسٹ کے تمام شمارے گھر بیٹھے

520/-

کی رعایت

بذریعہ رجسٹری ڈاک بھیجیں گے اور

آپ کو **520/-** روپے

کا فائدہ بھی ہوگا۔

سیارہ ڈائجسٹ

سالانہ اخراجات کا تخمینہ

قیمت فی شمارہ: **80/-** روپے - سال بھر میں بارہ شماروں کی عام قیمت **960/-** روپے

سال بھر کا ایئر میل رجسٹری ڈاک خرچ **360/-** روپے - کل رقم **1320/-** روپے

آپ صرف **800/-** روپے ہمیں ارسال کر دیں۔
سال بھر سیارہ ڈائجسٹ آپ کو گھر بیٹھے ملتا رہے گا۔
صرف یہ کوپن پہ کر کے حوالہ ڈاک کر دیجئے!

لیکن آپ اتنی
رقم کیوں خرچ
کریں؟

اس پیشکش سے فوراً فائدہ اٹھائیں

جناب منیجر صاحب۔ سیارہ ڈائجسٹ

براہ کرم مجھے ماہ..... سے سیارہ ڈائجسٹ ایک سال کیلئے جاری فرما دیں

800/- روپے کا ڈرافٹ / منی آرڈر ارسال کر رہا ہوں / آپ مجھے **800/-** روپے کی

وی پی پی ارسال کر دیں۔ میں وصول کر لوں گا۔ نوٹ: - چیک قبول نہیں کیا جائے گا

نام..... پتہ.....

آپ یہ رقم سے ٹی ایم (ATM) اور منی ٹرانسفر کے دیگر طریقوں سے بھی ہمارے اکاؤنٹ نمبر 4-720 ایم سی بی

ریوازا گارڈن بینک کو، نمبر 1227 برانچ لاہور میں ٹرانسفر کر سکتے ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے رابطہ نمبر 042-37245412

جہاں مجھے بھیجنے کے لیے بے تاب ہیں وہاں رہائش وغیرہ کا کیا انتظام ہے!“۔
حکیم صاحب نے مجھے کبھی ان بد بختوں کے نام نہیں بتائے جو ان کی جان کے درپے تھے اور انہیں ختم کرنا چاہتے تھے۔ میں نے بھی کبھی اصرار یوں نہیں کیا کہ میں اس مرد قلندر کی بے نیازی اور انسان پروری کو جانتا تھا۔ وہ ایسے ارتکاب جرم سے پہلے کسی پر انگلی اٹھا دیتے۔ ان کی وضعداری اور خون کی نجابت اس کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

آخر کو وہ فطرتاً بو ترابی تھے اور ان کے اور میرے ممدوح، مولائے کائنات علی مرتضیٰؑ تو قیامت تک کے لیے رواداری، انصاف اور انسان دوستی کی وہ درخشاں مثال قائم کر کے گئے ہیں کہ ضربت کے بعد بھی اپنے قاتل کو مہمانوں کی طرح رکھا اور حسنین کو وصیت کر کے گئے کہ جب تک ان کی آنکھیں بند نہ ہو جائیں، قاتل پر آنچ نہ آنے پائے!

ہاں حکیم صاحب کو اپنی نوجوان نسل سے گلہ تھا۔ بہت شاکی تھے، وہ اس نسل کے بے راہروی اور چنی اور اخلاقی انتشار سے اور مجھ سے اکثر فرمایا کرتے تھے ”سفیر صاحب! آپ کی نسل تک تو معاملہ صاف کھرا ہے لیکن آپ کے بعد کی نسل بگڑ گئی ہے۔ اس میں نہ بزرگوں کا لحاظ ہے، نہ شرافت کا معیار!“۔

حکیم صاحب نے ہی مجھے بتایا تھا کہ وہ خود سے چل کر مہاجر قومی موومنٹ کے عزیز آباد کراچی میں واقع مرکز جسے نائن زیر دیکھا جاتا ہے، گئے تھے اس تحریک کے قائد الطاف حسین سے ملاقات کی نیت سے، لیکن قائد تحریک کے پاس ان سے ملنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ حکیم صاحب نے بڑے تاسف سے فرمایا ”دیکھئے اس نوجوان نسل کی بے مروتی اور اخلاقی تہذیبی گمراہی کہ میں بزرگ تھا پھر بھی میں نے پیش رفت کی، لیکن موصوف کا حسن اخلاق یہ ہے کہ مجھے گھٹنے بھر تک باہر انتظار میں بٹھانے کے بعد یہ کہلوادیا کہ وقت نہیں ہے، مصروفیت بہت ہے۔“

حکیم صاحب کے قاتلوں کا سراغ آج تک نہیں ملا، یا یہ کہ سراغ مصلحت شہریاری اور مجبوری خسرواں کے ہاتھوں راز سر بستہ ہی رہ گئے۔ کتنے ہی ہاتھ ہیں جن پر اس فرشتہ صفت حکیم حاذق اور حکیم دانا کا لہو ہو سکتا ہے۔ ہمارے ہاں تو یہ روایت بہت پرانی ہے کہ قاتلوں کے گھناؤنے چہروں پر پردہ پڑا رہے۔ شہید ملت لیاقت علی خاں کے قتل کو ساٹھ برس ہو گئے۔ آج تک ان سازشیوں کے نام ملفوف ہیں جنہوں نے کرائے کے قاتل سے اس بطل عظیم کا قتل کروایا۔ حکیم صاحب بے نظیر کو اپنے قتل کی دہائی دیتے دیتے اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور پھر بے نظیر بھی شہید ملت اور حکیم صاحب سے وہیں جا ملیں۔ ان کے قتل کا معمہ بھی نہ جانے کب تک یونہی ہوا میں معلق رہے گا۔ مصطفیٰ زیدی نے سچ کہا تھا:۔

میں کس کے ہاتھ پر اپنا لہو تلاش کروں

تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

حکیم سعید کے بد بخت قاتلوں کا جرم صرف یہی نہیں ہے کہ انہوں نے ایک ایسے طبیب حاذق کو مٹا دیا جس کے ہاتھ میں، اس کے مریضوں کے بقول، مسیحا کی کا اعجاز تھا، نہیں، انہوں نے اس کے ساتھ ساتھ حکمت و علم کے، اس فانوس کو بجھا دیا جو علم و فکر کے چراغ روشن کر رہا تھا اور جسموں کے ساتھ ساتھ روحوں کی مسیحا بھی کر رہا تھا!

حکیم سعید نے 'شام ہمدرد' کے عنوان سے فکر و فنون کے مذاکروں کا جو آغاز کیا تھا وہ پاکستان میں اپنی نوعیت کی ایک انوکھی اور جدت طراز تحریک تھی۔ وہ جس طرح پاکستان کے 'کراچی کے ماسوا' ہر بڑے شہر میں مہینے میں کم سے کم ایک مرتبہ اپنا مطب لگاتے تھے۔ اسی طرح ہر اس شہر میں علم و عرفان کا دانش کدہ بھی منعقد ہوتا تھا، جس میں ملک کے نامور مشاہیر علم و ادب اور دانشور اپنے افکار کے چراغ روشن کیا کرتے تھے۔ ایک دبستان علم تھا جو حکیم صاحب نے تنہا اپنی علم دوستی کے بل بوتے پر کھول رکھا تھا اور یہ ایک ایسی سلسیل تھی جو علم و آگہی کے تشنہ لبوں کی پیاس بجھایا کرتی تھی۔ حکیم صاحب کے اس دنیا سے پردہ کر لینے کے بعد وہ دبستان بند ہو گیا! وہ فالوئس بجھ گیا جس سے علم و عرفان و آگہی کے نئے چراغوں کی قطاریں روشن ہو رہی تھیں اور پرانے چراغوں کی لو بلند ہو رہی تھی۔ انہیں بادمخالف کا سامنا کرنے اور تند ہواؤں کی موجودگی میں روشن رہنے کا حوصلہ اور جسارت مل رہی تھی!

حکیم صاحب کا یہ گلہ، جو وہ مجھ سے اکثر کیا کرتے تھے، غلط نہیں تھا کہ ہماری نئی نسل کے خود ساختہ رہنماؤں اور عیناؤں نے نوجوانوں کے ہاتھ سے قلم چھین کر کلاشکوف تھمادی ہے اور اب سینہ قرطاس پر علم کے موتی بکھرنے کے بجائے دھرتی کے سینے پر آئے دن لہو کی تحریریں لکھی جا رہی ہیں۔ انہی ناسپاس اور بد بخت ہاتھوں نے حکیم صاحب کے نجیب خون کو بھی پاکستان کی مٹی کی خوراک بنا دیا۔

لیکن حکیم صاحب کا مشن جاری ہے۔ مدیۃ الحکمت ان کی عمر بھر کی محنت شاقہ کا ثمر ہے اور جب تک درس و تدریس اور تحقیق و تجربہ کی یہ درس گاہ یہ جامعہ علم دانش کی روشنی پھیلاتی رہے گی حکیم صاحب کے مجاہدہ کا فیض دنیا بھر کے متلاشی علوم کی پیاس بجھاتا رہے گا۔

حکیم صاحب میری کتاب میں ان افراد کی فہرست کے سر آغاز پر آتے ہیں جن کے متعلق خوف و خطر یہ فیصلہ دیا جاسکتا ہے:

جن سے مل کر زندگی سے پیار ہو جائے وہ لوگ
آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں!
شہید حکیم محمد سعید کی یاد میں

(جاوید چودھری)

کیلنڈر پر جب بھی اتوار طلوع ہوتا ہے میرے دل کی دھڑکنیں رک سی جاتی ہیں اور حکیم سعید صاحب کی یادوں کی ریت آنکھوں کی پٹیوں پر رگڑ کھانے لگتی ہے۔ میں حکیم صاحب سے نومبر 1993ء میں پہلی بار ملا تھا 'حکیم صاحب کے ہونٹوں پر ایک طلسماتی مسکراہٹ اور ہاتھوں میں خوشبودار گرامش تھی۔ میں اس وقت ایک عام معمولی صحافی تھا جب کہ حکیم سعید عالمی شخصیت، مگر حکیم صاحب نے اپنائیت سے میری طرف دیکھا اور ان کے ساتھ زندگی بھر کا تعلق پیدا ہو گیا۔ میں عام زندگی میں ایک غیر سنجیدہ اور کیڑا لیس انسان ہوں میں زیادہ دیر تک خاموش اور باادب نہیں بیٹھ سکتا جب کہ حکیم صاحب کی محفل میں ایک مقدس اور متبرک سی خاموشی ہوتی تھی مگر اس تضاد کے باوجود ان کے ساتھ میری دوستی ہو گئی 'حکیم صاحب نے میری غیر سنجیدگی کے ساتھ خاموش سمجھوتا کر لیا۔ وہ شروع شروع میں میری غیر سنجیدہ باتوں پر خاموش رہتے تھے پھر انھوں نے اس میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ اس کے بعد وہ ان سے لطف لینے لگے اور آخر میں انھوں نے میری غیر سنجیدگی کو قبول کر لیا۔ مجھے ان

دنوں شوگر کا مرض لاحق ہو گیا، میں حکیم صاحب کے پاس حاضر ہوا اور ان سے عرض کیا ”حکیم صاحب مجھے شوگر ہو گئی ہے میں کیا کروں“ انھوں نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور بولے ”کیا فرق پڑتا ہے؟ یہ چھوٹی سی بیماری ہے یہ تمہارا کیا بگاڑ لے گی“ میں نے عرض کیا ”حکیم صاحب میں بیماری سے خوفزدہ نہیں ہوں میں اندیشے میں مبتلا ہوں“ فرمایا ”کیا مطلب“ میں نے عرض کیا ”جناب میں نے سنا ہے شوگر کے مریض اعصابی کمزوری کا شکار ہو جاتے ہیں اور میں اس کیفیت سے بہت ڈرتا ہوں“ حکیم صاحب نے بے اختیار رفقہ بہہ لگایا اور میرے ساتھ ہاتھ ملا کر بولے ”یار میرا بھی یہی مسئلہ ہے“ میری ہلکی نکل گئی اور میں نے عرض کیا ”حکیم صاحب چلیے پھر دونوں مل کر کوئی حکیم تلاش کرتے ہیں“ حکیم صاحب بڑی سنجیدگی سے بولے ”بالکل ٹھیک ہے کوئی حاذق حکیم تلاش کرتے ہیں۔“

دنیا میں کوئی شخص اس وقت تک بڑا انسان نہیں بن سکتا جب تک اس میں تین خوبیاں نہ ہوں ایک اس میں حس مزاج نہ ہو۔ دوسرا اس میں جمالیاتی حس نہ ہو اور تین اس کی ذات میں رومانویت نہ ہو۔ حکیم صاحب میں یہ تینوں خوبیاں موجود تھیں۔ وہ خوشگوار مزاج کے انسان تھے آپ ان کی محفل میں بیٹھ کر بور نہیں ہوتے تھے ان کی طبیعت میں حس جمالیاتی بن کر دوڑتی تھی وہ صاف ستھرا اور شفاف لباس پہنتے تھے حکیم صاحب کی گفتگو تک میں کوئی سلوٹ نہیں ہوتی تھی حکیم صاحب کے فقرے ایسے ہوتے تھے جیسے ابھی ابھی دھوئی کے گھاٹ سے دھل کر استری ہو کر آئے ہیں لفظوں کا چناؤ ایسا جیسے ان کے تمام لفظوں نے عطار کی دکان میں آنکھ کھولی ہے اور آپ کے دائیں بائیں ماحول میں نفاست کے انبار رہ گئی۔ رومانویت تو آپ شاعر کا دل مصنف کی آنکھ اور موسیقار کا احساس لے کر پیدا ہوئے تھے۔

آپ حکیم صاحب کی تحریریں پڑھیں آپ کو ان کے ایک ایک فقرے میں رومانویت کی ہلکی ہلکی تپش اور جذبوں کی بھیننی بھیننی خوشبو ملے گی۔ حکیم صاحب کی رومانویت اور عام انسانوں کی رومانویت میں فرق تھا عام لوگ اس جذبہ کو لیلیاؤں کی نگلیوں میں ”رول“ دیتے ہیں جب کہ حکیم صاحب نے اپنے اس جذبے کو ملک قوم اور ملت کے ساتھ وابستہ کر کے اسے عبادت گاہ کی شکل دے دی چنانچہ حکیم صاحب کی رومانویت قوم کی کردار سازی کا فرض ادا کرتی نظر آتی ہے۔ امریکا کے ایک ادارے نے دس برس قبل دنیا کے ایک ہزار نو سو ایک کامیاب لوگوں کی عادتوں کی ایک فہرست بنائی تھی ان تمام کامیاب لوگوں میں سات عادتیں مشترک تھیں یہ ایک وقت کے پار تھے حکیم صاحب بھی وقت کی سب سے انہماک پابندی کرتے تھے ان کے دس بجے ٹھیک نو بج کر 99 منٹ پر بجتے تھے وقت سے سناٹے میں گھرنے کی سوریں دھو کا کھا سکتی تھیں لیکن حکیم صاحب کے معمولات میں لغزش نہیں آتی تھی دنیا کے کامیاب لوگ کام روم دیتے تھے کہم صاحب کام کو ایمان کا حصہ سمجھتے تھے۔

انھوں نے لاکھوں خطوط کا جواب اپنے ہاتھ سے دیا تھا وہ گاڑی میں ہوں جہاز میں یا پھر کسی تقریب میں وہ مسلسل لکھتے رہتے تھے وہ سندھ کے گورنر بھی تھے تو معمول کے مطابق مریضوں کا معائنہ کرتے تھے۔ حکیم صاحب نے مختصر سی زندگی میں اتنے ادارے قائم کیے جتنے ہزاروں لوگ مل کر سینکڑوں برسوں میں قائم نہیں کر پاتے۔ دنیا کے کامیاب لوگ ایماندار ہوتے ہیں حکیم صاحب کی ایمانداری ایمان کو چھوٹی تھی حکیم صاحب نے پوری دنیا میں کوئی ذاتی جائیداد نہیں بنائی آپ کا ربوں روپے کا ادارہ ہمدرد پاکستان کے نام وقف ہے۔ وہ اپنی بیٹی سعدیہ سند کے گھر میں ایک کمرے میں رہتے تھے اور اس کا بھی باقاعدہ کرایہ ادا کرتے تھے سندھ کے

گورنر تھے لاہور میں مریضوں کے معائنے کے لیے آتے تھے تو ذاتی جیب سے اکانومی کلاس کا ٹکٹ خریدتے تھے خود اکانومی میں بیٹھتے تھے اور ان کے ملٹری سیکرٹری فرسٹ کلاس میں سفر کرتے تھے ملٹری سیکرٹری کو شرم آتی تھی لیکن آپ انھیں کہتے تھے ”بیٹا آپ میرے لیے اپنا اسٹیٹس خراب نہ کریں میں ذاتی کام سے سفر کر رہا ہوں آپ اپنی ڈیوٹی دے رہے ہیں آپ اپنے اسٹیٹس کے مطابق رہیں مجھے اپنے اسٹیٹس کے مطابق رہنے دیں۔“

لاہور اُترتے تھے تو ہمدرد ادارے کی سوزو کی کار میں مطب جاتے تھے کراچی میں بھی ذاتی کاموں کے لیے ذاتی کار استعمال کرتے تھے دنیا کے کامیاب لوگوں میں عاجزی تھی حکیم صاحب بھی انکسار سے بھرے ہوئے تھے وہ کسی تقریب میں جاتے تو ریکارڈ سے اس علاقے کے مریضوں کے ایڈریس لکھوا کر ساتھ لے جاتے اور جاتے اور آتے ہوئے مریضوں کے گھر جا کر ان کی خیریت معلوم کرتے ہوں تک سے جھک کر ملتے تھے انھوں نے کبھی ڈرائیور کو ڈرائیور اور چپڑا اسی کو چپڑا اسی نہیں سمجھا وہ سب کو انسان سمجھتے تھے اور انھیں اشرف المخلوقات کا درجہ دیتے تھے۔

دنیا کے کامیاب لوگ بے لوث تھے حکیم صاحب کو بھی لالچ اور ترغیب چھو کر نہیں گزری تھی انھوں نے جو کچھ کمایا ملک کے نام کر دیا کراچی کے مضافات میں اسکول قائم کیا اور ڈاکوؤں کے دیہات میں جا کر ان کے بچوں کو مفت تعلیم دینا شروع کر دی اس ملک میں جس میں ہرزور آور کے دامن پر کسی نہ کسی این آراو کا داغ ہے اس میں حکیم سعید واحد انسان تھے جن کے شفاف دامن کی قسم فرشتے بھی کھا سکتے ہیں۔ دنیا کے کامیاب لوگ بہادر تھے حکیم صاحب کے لہو میں بہادری سرخی کی حیثیت رکھتی تھی ان کی شہادت بھی بہادری کی وجہ سے ہوئی تھی انھوں نے ملک کے ان طبقوں کو لکارنا شروع کر دیا تھا جن کی طرف قانون تک آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا آپ کو رفقہ نے سمجھایا تو آپ نے جواب دیا ”میں نہیں بولوں گا تو کون بولے گا“ اور دنیا کے کامیاب لوگوں کے قول و فعل میں تضاد نہیں تھا حکیم صاحب بھی جو کہتے تھے وہ کرتے تھے اور جو کرتے تھے اسی کی تبلیغ فرماتے تھے ان کی ذات میں قول اور فعل جڑواں بھائیوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ مجھے یاد ہے 17 اکتوبر 2009ء کو لاہور میں حکیم سعید کی 11 ویں برسی منائی گئی میں بھی اس تقریب میں شریک تھا تقریب کی نظامت ٹیلی ویژن کے مشہور کمپیئر نور الحسن نے کی نور الحسن نے تقریب کے آخر میں فرمایا ”ہم 17 کروڑ لوگ حکیم سعید صاحب کی صاحبزادی محترمہ سعیدہ راشدہ سے معافی مانگتے ہیں کہ ہم حکیم صاحب کے قاتلوں کو سزا نہیں دے سکے“ یہ سن کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے کیونکہ اس سے بڑی بد قسمتی کیا ہوگی حکیم سعید 17 اکتوبر 1998ء کو کراچی میں شہید ہوئے ان کے قتل کے الزام میں لوگ پکڑے گئے لیکن صدر پردیز مشرف کے این آراو کی وجہ سے ان لوگوں کا جرم بھی ساف کر دیا گیا یہ لوگ بھی این آراو کی واشنگ مشین میں دھو دیئے گئے اور اس ظلم پر ہماری پارلیمنٹ کے کسی رکن نے آواز نہیں اٹھائی۔ کیا یہ حکیم صاحب کی شہادت سے بڑی بد قسمتی نہیں...! ہم سب واقعی اس قابل نہیں ہیں کہ حکیم سعید صاحب جیسے انسان ہمارے درمیان ہوتے کیونکہ حکیم سعید حضرت امام حسینؑ کے قافلے کے پچھڑے ہوئے رکن تھے اور حضرت امام حسینؑ کے قافلے کے لوگ کبھی کوفے میں قیام نہیں کیا کرتے۔

مدینے کا شہید

پچھلے موسم سرما میں ایک نامور پاکستانی دانشور بھارت گئے، دورے کے اختتام پر ایک غیر سرکاری تنظیم نے

دہلی میں ان کے اعزاز میں ایک نشست کا اہتمام کیا جس میں پاکستانی دانشور کو ”خراج عقیدت“ پیش کرنے کیلئے چوٹی کے بھارتی دانشور تشریف لائے، نشست کے آخر میں جب سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا تو ایک ہندو دانشور نے اپنے معزز مہمان سے ایک عجیب سوال پوچھا، پوچھنے والے نے پوچھا۔ ”یہاں بھارت میں تو مسلمان مساجد میں نماز ادا کرتے ہیں وہاں پاکستان میں کہاں پڑھتے ہیں؟“۔ پاکستانی دانشور نے اس سوال کو مذاق سمجھ کر فلک شکاف تہقہہ لگایا لیکن جب انہیں محفل کی طرف سے کوئی خاص رد عمل موصول نہ ہوا تو انہوں نے کھسکا سا ہوا کر سوالی کی طرف دیکھا، ہندو دانشور کے چہرے پر سنجیدگی کے ڈھیر لگے تھے۔

پاکستانی دانشور نے بے چینی سے پہلو بدل کر جواب دیا۔ ”ظاہر ہے مسجدوں میں ہی پڑھتے ہیں“۔ یہ جواب سن کر ہندو دانشور کھڑا ہوا ایک نظر حاضرین پر ڈالی اور پھر مسکرا کر بولا ”لیکن ہماری اطلاعات کے مطابق تو پاکستانی مسجدوں میں نماز پڑھنے والوں کو گولی مار دی جاتی ہے۔“ ہندو دانشور کا تبصرہ پاکستانی دانشور کو بسکڈ میزائل کی طرح لگا، اس کا ماتھا پسینے سے بھیگ گیا، ہاتھوں پر لرزہ طاری ہو گیا اور آنکھوں میں سرخی آگئی، منتظمین موقع کی نزاکت بھانپ گئے لہذا انہوں نے فوراً نشست کے اختتام کا اعلان کر دیا یوں پاک بھارت تعلقات مزید بگڑنے سے بچ گئے۔

یہ واقعہ مجھے مرحوم حکیم سعید نے سنایا تھا، مجھے آج بھی وہ گرم سہ پہر یاد ہے میں ہمدرد دوا خانہ راولپنڈی میں حکیم صاحب کے کمرے میں بیٹھا تھا، مرحوم خلاف معمول تھکے تھکے سے لگ رہے تھے۔ میں نے ادب سے طبیعت کے اس بوجھل پن کی وجہ دریافت کی تو دل گرفتہ لہجے میں بولے ”ہم نے اس دکھ سے بھارت چھوڑا تھا کہ ہمیں وہاں مذہبی آزادی حاصل نہ تھی، ہم نماز پڑھنے جاتے تھے تو ہندو مسجدوں میں سور چھوڑ دیتے تھے، خانہ خدا کے دروازے پر ڈھول پیٹتے تھے، بول و براز کی تھیلیاں ہمارے اوپر پھینکتے تھے، ہندو شرپند بھیلی صفوں میں کھڑے نمازیوں کو چہرے کھوپ کر بھاگ جاتے تھے، ہم نے سوچا چلو پاکستان چلتے ہیں وہاں کم از کم ہمارے بندے تو آزاد ہوں گے، ہماری مسجدیں، ہماری درگاہیں تو محفوظ ہوں گی لیکن افسوس آج مسلح کارڈز کے پہرے کے بغیر پاکستان کی کسی مسجد میں نماز کا تصور تک نہیں، مجھے میرے بڑھے بھائی حکیم عبد الحمید دہلی سے لکھتے ہیں ”سعید واپس آ جاؤ“ پاکستان کے حالات ٹھیک نہیں، یہاں ادھر کم از کم مسجدیں تو محفوظ ہیں۔۔۔۔۔ لیکن میں۔۔۔ ان کی آواز اکڑ گئی۔ ”پاکستان آنے پر آپ کو کبھی پچھتاوا ہوا؟“ میں نے نرمی سے پوچھا انہوں نے اچکن کے بٹن سہلائے ”نہیں“ ہرگز نہیں، یہ سودا ہم نے خود کیا تھا، حمید بھائی میرے اس فیصلے سے خوش نہیں تھے، ان کی خواہش تھی میں دہلی میں ہی ان کا ہاتھ بٹاؤں، لیکن مجھے لفظ پاکستان سے عشق تھا، لہذا ادھر چلا آیا، اللہ تعالیٰ نے کرم کیا اور وہ ادارہ جس کی بنیاد میں نے بارہ روپے سے رکھے تھے، آج پاکستان کے چند بڑے اداروں میں شمار ہوتا ہے، یہ سب پاکستان سے عشق کا کمال ہے، ان کی آواز میں بدستور ملال تھا، ”لیکن پاکستان کے حالات سے دکھ تو ہوتا ہوگا“ میں نے اپنے سوال پر اصرار کیا ”ہاں، بہت ہوتا ہے، اخبار پڑھتا ہوں، سیاستدانوں کے حالات دیکھتا ہوں، عوام کی دگرگوں صورتحال پر نظر پڑتی ہے تو بہت دکھ ہوتا ہے، جب ادھر دہلی سے کوئی عزیز رشتے دار پاکستان آ کر کہتا ہے، کیوں پھر، تو دل پر چھری سی چل جاتی ہے، لیکن کیا کریں، گھر جیسا بھی ہے، ہے تو اپنا، ہم اسے چھوڑ تو نہیں سکتے، لہذا لگے ہوئے ہیں اور لگے رہیں گے آخری سانس تک۔“



مرحبا شربت فولاد

خون کی کمی اور عام کمزوری کے لئے ایک عمدہ ٹانک

اچھی صحت کے لیے معدنی اجزاء نہایت ضروری ہوتے ہیں۔ اور بدن کو ان کی روزانہ ضرورت ہوتی ہے۔ دوسرے اہم معدنی اجزاء کی طرح فولاد (آئرن) ایک ناگزیر ضرورت کا حامل عنصر ہے۔ جس پر صالح خون اور توانا بدن کا دار و مدار ہے۔ فولاد کا معدنی جزو خون بنانا اور صاف کرتا ہے۔ اس کی روزانہ ضرورت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک مرد روزانہ 28 ملی گرام عورت کو 30 ملی گرام حاملہ عورت کو 38 ملی گرام اور بچے کو 26 سے 40 ملی گرام تک فولاد کی ضرورت ہوتی ہے۔

خون کے سرخ ذرات مخصوص پروٹین اور فولاد سے بنتے ہیں۔ اور سائنسی تحقیق نے یہ ثابت کیا ہے کہ بدن کی پرورش اور انسانی زندگی کے لئے فولاد ایک اہم ضرورت ہے۔ جس کا روزانہ خوراک میں شامل کیا جانا ضروری ہے۔

بدن میں فولاد کی کمی و جوہات اور علامات

فولاد کا بدن سے اخراج بھی ہوتا رہتا ہے۔ اس کی کمی و جوہات ہیں۔ مثلاً انفیکشن، ادویات اور کیمیکلز کا زیادہ استعمال، خون کے زیادہ بہنے اندرونی اعضاء کے متاثر ہونے، اسقاط حمل، حیض میں زیادہ خون آنے، بار بار حمل ٹھہرنے، زیادہ عرصہ تک بچے کو دودھ پلانے، گرمیوں میں بے تحاشا پسینہ بہنے سے فولاد کی کمی ہو جاتی ہے۔ فولاد کی کمی کے باعث تھوڑی سی محنت مشقت پر سانس پھول جانا، چہرے کا رنگ زرد ہونا، جنسی کمزوری غالب آ جانا، چڑچڑے پن کا شکار ہو جانا، ڈیپریشن کا عود آنا، بیماریوں کے خلاف مزاحمت میں کمی ہو جانا، نڈھال اور بے سکون رہنا ایسی علامات پائی جاتی ہیں۔

فولاد بیماریوں کے خلاف مزاحمت کرتا اور توانائی کی نشوونما کرتا ہے۔ لہذا فولاد کا روزانہ حصول ہی صحت کا ضامن ہے انسانی صحت اور زندگی کی ان ضرورتوں کے پیش نظر **مرحبا** لیبارٹریز نے بناتاتی اجزاء پر مشتمل شربت فولاد بنایا ہے جو بدن میں فولاد کی کمی کو پورا کرنے کے علاوہ ان تمام اعضاء کو صحت مند اور فعال بناتا ہے جو فولاد کے معدنی اجزاء کو ذخیرہ کرتے اور انہیں جزو بدن بناتے ہیں۔

مرحبا شربت فولاد کی خصوصیات



- ◀ جگر معده اور اعصابی نظام کو درست کرتا ہے۔
- ◀ چہرے کی چھائیاں اور زردی کو ختم کر کے چہرے پر شادابی لاتا ہے۔
- ◀ جسم میں توانائی اور چستی بڑھاتا ہے۔
- ◀ بھوک بڑھاتا اور باضمہ کا عمل تیز کرتا ہے۔
- ◀ جوڑوں کے درد رفع کرتا ہے اور دل کی دھڑکن اعتدال پر لاتا ہے۔
- ◀ وضع حمل کے دوران خواتین کو جسمانی کمزوریوں سے بچاتا ہے۔

142-مین انڈسٹریل اسٹیٹ کوٹ لکھت لاہور۔ پاکستان
مرحبا لیبارٹریز فون نمبر: 5118679-5156068 E-mail: info@marhaba.com.pk

”کوئی ایسی خواہش جس کا آپ نے آج تک کسی کے سامنے اظہار نہیں کیا“ انہوں نے کچھ دیر تک سوچا ”ہاں کبھی کبھی جی چاہتا ہے میری موت حید بھائی سے پہلے ہو، وہ میرے جنازے پر آئیں، میرے چہرے سے چادر سرکا کر دیکھیں اور پھر آہستہ سے مسکرا کر کہیں، ہاں سعید تمہارا فیصلہ غلط نہیں تھا۔“

وہ گرم دوپہر ڈھل گئی تو اس کے بطن سے آج کی خنک اور غمناک صبح طلوع ہوئی، میرے سامنے میز پر آج کے اخبار بکھرے پڑے ہیں، ہر اخبار کی پیشانی کے ساتھ آج کے سب سے بڑے انسان کی تصویر چھپی ہے، خون میں نہائی اور حسرت میں ڈوبی ہوئی تصویر جو ہر نظر سے چیخ چیخ کر ایک ہی سوال کر رہی ہے۔ میرا جرم کیا تھا، مجھے کیوں مارا گیا، میں تو زخموں پر مرہم رکھنے والا شخص تھا پھر میرے جسم کو زخم کیوں بنا دیا گیا ”میرا دماغ سلکتی لکڑیوں کی طرح چٹخنے لگا میں نے سوچا، یہ تصویر آج دہلی کے کسی اخبار میں چھپی ہوگی، وہ اخبار ہمدردنگر کے ایک چھوٹے سے غریبانہ کمرے میں بھی پہنچا ہوگا، چٹائی پر بیٹھے ہوئی بیاسی برس کے ایک بوڑھے نے بھی اسے اٹھایا ہوگا، اس کی آنکھیں بھی ہزاروں لاکھوں لوگوں کی طرح چھلک پڑی ہوں گی، اس نے بھی شدت جذبات سے اخبار پرے پھینک دیا ہوگا، اس نے بھی بازو پر دانت جما کر چیخ ماری ہوگی، اس نے بھی اپنی چھاتی پر ہاتھ مارا ہوگا، اس نے بھی چلا چلا کر کہا ہوگا۔ ”سعید تمہارا فیصلہ غلط تھا، مجھے دیکھو بیاسی برس کے اس بوڑھے کو دیکھو، یہ بغیر محافظ کے مسجد جاتا ہے، پیدل مطب پہنچتا ہے، روز صبح شام کافروں کے درمیان چہل قدمی کرتا ہے، لیکن اس پر بھی کوئی گولی نہیں چلی، اس کا کبھی کسی نے راستہ نہیں روکا۔ ہاں اس بیاسی برس کے کمزور بوڑھے نے چلا چلا کر کہا ہوگا ”سعید کر بلا میں تو میں کھڑا تھا لیکن مدینے میں تم مارے گئے۔“

HAKIM MOHAMMED SAID (SHAHEED)

(1920 - 1998)

- Chairman, and Waqif Mutawalli, Hamdard Laboratories (Waqf) Pakistan
- President, Hamdard Foundation Pakistan
- Founder-President, Madinat al-Hikmah
- Chancellor, Hamdard University
- President, Hamdard Public School
- Waqif Mutawalli, Hamdard Bangladesh
- Chief Physician, Hamdard Clinics
- President, Pakistan Historical Society, Karachi
- President, Institute of Health and Tibbi Research, Karachi
- President, Institute of Central and West Asian Studies, Karachi
- Federal Minister / Advisor to the President of Pakistan on Tibb from 1979 to 1982
- Governor of Sindh, from 1993 to 1994

Academic Qualifications:

- BEMS from The Ayurvedic and Unani Tibbi College, Delhi, 1940

- D Sc. "Medician Alternative". The International Multidisciplinary Scientific Society on Alternative Medicine - 1984

Languages:

- Urdu and English
- Working knowledge of Arabic and Persian

Honours, Prizes, Awards:

- Sitara-i-Imtiaz, Pakistan 1966
- "Sadiq Dost Award" from the people of Bahawalpur through commissioner of Bahawalpur, Pakistan
- Certificate of Merit from the Institute of History of Science and Technology, Istanbul Technical University, Turkey 1981
- Islamic Medicine Prize, Kuwait Foundation for the Advancement of Sciences, Kuwait 1982
- Winner of the Novosti Press Agency's Abu Ali Ibn Sina (Avicenna) International Prize for 1989, U.S.S.R.
- World No-Tobacco Day Medal, World Health Organization, 1965
- Award by the Pakistan League of the United States of America, New York, for the services in the fields of health, education and social work, 1996
- Outstanding Pakistani Award from the Rotary Club Islamabad Cosmopolitan, 1996
- Commemorative Postage Stamp issued on 17th October 1999 on 1st anniversary of Martyrdom of Hakim Mohammed Said
- Nishan-i-Imtiaz (Posthumous) in the field of Medicine (Hikmat) conferred by the President of the Islamic Republic of Pakistan on the occasion of the Independence Day, 14th August, 2000

Editorship (Urdu):

- Hamdard-i-Sehat (Monthly)
- Hamdard Naunehal (Monthly)
- Akhbar-ul-Tibb (Monthly)
- Payami (Urdu version of UNESCO's Courier)

Editorship (English):

- Hamdard Medicus (Quarterly)
- SPEM, Bulletin of the Society for the Promotion of Eastern Medicine
- Medical Times (Fortnightly)
- Hamdard Islamicus (Quarterly)
- Endeavour, Newsletter of Madinat al-Hikmah

Other Achievements:

Author and editor of more than 189 books both in Urdu and English

languages

- Has written more than 500 articles on science, medicines History and Islam
- Treated more than 5 million patients
- Participated in more than 92 international conferences round the globe and presented papers

اباجان

(سعدیہ راشد)

ہمیں پورا آئیڈیل کسی شخصیت میں مل جائے ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ اس کے ٹکڑے ضرور لوگوں کی شخصیت میں بکھرے مل جاتے ہیں۔ کبھی ایسی کوئی شخصیت بھی مل جاتی ہے جس کے وجود میں ہمارے آئیڈیل کے بیشتر رنگ، بیشتر ستارے زیادہ سے زیادہ نقوش چمک رہے ہوتے ہیں اور پھر ہم غیر شعوری طور پر اس کی طرف کھینچے چلے جاتے ہیں۔ میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے ایک شخصیت ایسی مل گئی جس میں میرے آئیڈیل کے سارے رنگ، سارے نقوش موجود تھے۔ یہ اباجان تھے، میرے آئیڈیل۔ وہ ایک مکمل شخصیت تھے۔

بیٹیاں یوں بھی باپ سے زیادہ قریب ہوتی ہیں۔ میں اپنی امی کے مقابلے میں اباجان سے زیادہ قریب تھی۔ حالانکہ میں شریع سے ان سے بہت ڈرتی تھی لیکن سب سے زیادہ ان سے محبت کرتی تھی میں وہی ہونا چاہتی تھی جو وہ مجھے دیکھنا چاہتے تھے۔ مجھ سے یہ کسی نے نہیں کہا۔ میری امی نے بھی نہیں لیکن مجھے یہ احساس شدت سے رہتا تھا کہ میں کوئی بات ایسی نہ کروں جو اباجان کے معیار عمل سے گری ہوئی ہو۔ میرے قول و عمل میں کوئی پہلو ایسا نہ ہو کہ کوئی کہے۔ یہ حکیم محمد سعید کی بیٹی ہیں۔ مجھے ہر وقت یہ احساس رہتا تھا کہ اباجان نے بڑی محنت، بڑی قربانیوں سے اپنا ایک مقام بنایا ہے، ایک نام پیدا کیا ہے۔ ان کی نیک نامی پر کوئی حرف نہ آئے۔ یہ احساس بچپن کے بالکل ابتدائی زمانے سے میرے لاشعور میں جاگزیں تھا اور جیسے جیسے میں بڑی ہوتی گئی یہ احساس شعوری طور پر بڑھتا گیا۔

اباجان نے میری تربیت اس طرح کی کہ کبھی مجھے بٹھا کر یہ نہیں کہا کہ یہ کرنا ہے اور یہ نہیں کرنا ہے۔ تربیت کا ان کا اپنا طریقہ تھا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ عمل کر کے دکھایا کرتا ہوں۔ مجھے کہنے کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے خاموشی سے میری تربیت کی اور وہ تمام قدریں جو کہ انہیں عزیز تھیں اپنے عمل سے بتادیں۔ سچائی، دیانت داری، تواضع، شائستگی، رواداری، اخلاق، دین داری۔ انہوں نے مجھے سب سکھا دیا۔ ان کا انداز یہ تھا کہ بس چند گھنٹے ہی تھے جس میں ہم الگ ہوتے تھے ورنہ مستقل ساتھ رہتے تھے حتیٰ کہ جب کسی پروگرام میں جاتے تو ساتھ ہوتے، کوئی ریسپشن ہوتا تو ساتھ ہوتے۔ دفتر جارہے ہیں تو ساتھ ہوتا۔ دفتر کے معاملات پر بات ہوتی وقت تو وہ اپنا کوئی ضائع نہیں کرتے تھے، راستے میں ضروری کاغذات بھی دیکھتے جاتے۔ ہم ان کے حوالے سے بھی بات کر لیتے۔ گورنری کے زمانے میں بھی وہ ہماری تربیت کر رہے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہمیں کوئی غلط احساس ہو، ہم کسی کمپلیکس میں مبتلا ہوں۔ ہم نے گورنر ہاؤس تو پوری طرح دیکھا بھی نہیں۔ گورنر ہاؤس کی گاڑی تو وہ خود بہت کم استعمال کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جب وہ سندھ کے گورنر تھے ہم ہوائی جہاز میں سفر کر رہے تھے۔

جہاز کے عملے نے ہمیں اکونومی کلاس میں آگے کی دو سیٹیں جو فرسٹ کلاس کبین کے فوراً بعد تھیں، ہمیں دی تھیں۔ ایر ہوٹس نے جو فرسٹ کلاس میں میزبانی کر رہی تھی دیکھا کہ گورنر صاحب بیٹھے ہیں تو اورنج جوس لے کر ہماری طرف آئی اور ابا جان کو پیش کیا۔ انہوں نے نہیں لیا۔ انہوں نے ہاتھ نہیں بڑھایا تو میں نے بھی ہاتھ نہیں بڑھایا۔ مجھے معلوم تھا کہ ابا جان نے جوس کیوں نہیں لیا ہے اور یہ وہ سمجھ رہے تھے لیکن اس کے باوجود جب ایر ہوٹس چلی گئی تو انہوں نے مجھ سے کہا، تمہیں پتا ہے میں نے جوس کیوں نہیں لیا؟ میں نے کہا، جی ہاں۔ یہ فرسٹ کلاس کے مسافروں کے لیے تھا۔ کہنے لگے، ہاں۔ ہم فرسٹ کلاس کے مسافر نہیں ہیں۔ اس پر ہمارا حق نہیں تھا۔ اس وقت بھی وہ چاہتے تھے کہ ہماری تربیت ہو اور ہمیں یہ معلوم ہو کہ یہ ہمارا حق نہیں ہے۔ ورنہ کیا تھا جوس وہ بھی پی لیتے، میں بھی پی لیتی۔

جب میں چھوٹی تھی تو ابا جان سے بہت ڈرتی تھی۔ ہمیں بتایا جاتا تھا کہ ابا جان اتنا ضروری کام کر رہے ہیں کہ آواز بالکل نہیں نکلی چاہیے۔ وہ گھر میں بیٹھے لکھ رہے ہوتے تھے تو گھر میں سب کو سناپ سونگھ جاتا۔ سانس تک کی آواز نہ آنی کیوں کہ ابا جان کام کر رہے ہیں۔ ہماری شروع سے ہی یہ ٹریننگ تھی کہ ابا جان گھر میں ہوں تو شور نہیں مچانا چاہیے۔ مجھے یاد ہے ایک دن میں صبح سکول جانے کے لیے کپڑوں پر ضد کر رہی تھی۔ ابا جان صبح مریضوں کو دیکھنے مطب جایا کرتے تھے۔ وہ بیٹھے شاید کوئی جوس پی رہے تھے۔ میں امی جان سے مسلسل ضد کر رہی تھی کہ میں یہ فراک آج نہیں پہنوں گی۔ ان دنوں سکول میں کوئی یوٹیفارم تو تھا نہیں۔ میرے ضد کرنے پر ابا جان کو بہت غصہ آیا۔ کافی دیر تو انہوں نے برداشت کیا۔ پھر ایک پھٹر میری پیٹھ پر مارا۔ اوہو! میں تو ان سے پہلے ہی بہت ڈرتی تھی۔ اس وقت تو اتنا ڈری کہ بتا نہیں سکتی۔ میرا خیال ہے وہ دن اور آج کا دن میں نے کپڑوں پر کبھی ضد نہیں کیا۔ جیسا بھی ملا پہن لیا۔ کبھی یہ نہیں سوچا کہ یہ میچنگ ہے یا یہ میچنگ نہیں ہے۔ بس وہ ایک پھٹر کافی تھا۔

ابا جان میری تعلیم کی طرف سے بے فکر تھے۔ اس کی ذمہ داری میرے ماموں جان (حکیم محمد یحییٰ) نے سنبھال لی تھی۔ درحقیقت ابا جان کے پاس وقت نہیں تھا کہ وہ دیکھتے کہ ہم کیا پڑھ رہے ہیں، کیا نہیں۔ وجہ یہ تھی کہ ان کا مشن تو چلتا رہا۔ شروع میں ہمدرد کو بتانے میں لگے رہے، پھر مدد سے الحکمہ بنانے میں لگ گئے۔ ان کا مشن ان سے پورا وقت مانگتا تھا۔

ماموں جان ہماری تعلیم میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ میں سمجھتی ہوں میری تعلیم ان کی مرہون منت ہے۔ میری ابتدائی تعلیم تو سینٹ فلوینا سکول سے جو بکرا سٹ واکنگ سکول کہلاتا ہے، شروع ہوئی۔ یہ سکول ہمارے گھر کے قریب تھا۔ ہم پیدل جاتے تھے۔ کوئی ملازم ساتھ ہوتا تھا۔ پانچویں کلاس سے ہمارا داخلہ سینٹ جوزف کالونٹ میں ہو گیا۔ یہاں داخلہ بہت مشکل سے ملتا تھا۔ بی۔ کے بیچ ان دنوں ڈائریکٹر ایجوکیشن تھے۔ وہ ماموں جان کے دوست تھے شاید انہوں نے مدد کی۔ ماموں جان کی بیٹی مسعودہ بھی میرے ساتھ تھیں۔ ہم دونوں نے ساتھ پڑھا ہے۔ ہم ساتھ ہی رہتے تھے اور ہماری دوستی ایسی تھی کہ ہم میں سے کوئی ایک بیمار پڑتا تو دوسرا بیمار ہو جاتا۔ ماموں جان کو اس بات کا بہت خیال تھا کہ ہم اچھی تعلیم حاصل کریں۔ وہ ہمارے لیے کتابیں خرید خرید کر لاتے اور انہوں نے گھر میں ہمارے لیے لائبریری بنانی شروع کر دی تھی۔ وہ اس بات کا بھی خیال رکھتے تھے کہ

ہم بچپن ہی سے پڑھے لکھے لوگوں کے ساتھ رہیں اور ان لوگوں کے ساتھ انھیں بیٹھیں نہیں جو پڑھے لکھے نہ ہوں۔ ہماری اور مسعودہ کی تعلیم میں ان کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ ہمارا اسکول یونیفارم بنوانے وہ خود جاتے تھے۔ رپورٹ کارڈ پر دستخط بھی وہی کرتے تھے۔ کتابیں بھی وہی دلاتے تھے۔ وہ ابا جان کے بہت قریب تھے اور ابا جان کو اطمینان تھا کہ ہماری تعلیم کا صحیح انتظام ہو رہا ہے۔ بھائی دیکھ رہے ہیں۔ ماموں جان ہمیں ہر ہفتے اولڈ کلفٹن بھی لے جاتے۔ یہ ہر جمعہ کا معمول تھا۔ ابتداء میں ہلکی پھلکی مزاحیہ اور پھر جب ہم بڑے ہوئے تو کلاسک، انگریزی فلمیں بھی دکھانے لے جاتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہماری انگریزی رواں ہو جائے۔

میں چودہ سال کی تھی کہ ابا جان نے مجھے پارٹیز میں لے جانا شروع کر دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پہلی پارٹی جس میں وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے چینی سفارت خانے میں تھی۔ چینی سفارت خانہ ان دنوں ہمارے گھر کے قریب تھا۔ ابا جان کے ساتھ پہلی بار میں 1963ء میں ملک سے باہر گئی۔ ہم چین گئے، ہندوستان تو ہم شروع میں برابر جاتے رہتے تھے۔ اکثر گرمیوں کی چھٹیاں بڑے ابا حکیم عبدالحمید صاحب کے ساتھ دہلی اور نئی دہلی میں گزارتے۔ بعد میں بڑے ابا بھی کراچی آنے لگے۔

ابا جان اپنے بڑے بھائی سے بہت محبت کرتے تھے، بہت احترام کرتے تھے۔ نجانے وہ انہیں چھو کر کیسے چلے آئے۔ کہیں انہوں نے ضرور لکھا ہوگا یہ پاکستان کا جذبہ تھا اور مسلم لیگ سے ان کی وابستگی جس نے انہیں

اپیل

عرصہ دراز سے میری دھرتی ماں اور اس کے بہت میرے کارہائے تقلید و نمایاں سے واقف و متعارف ہیں۔ ”سیارہ ڈائجسٹ“ کے علاوہ پاکستان بھر کے بھی جرائد رسالہ جات اخبارات میں عرصہ طویل سے اعزازات کے ساتھ منسلک ہوں۔ بہت سے قارئین کے علم میں ہوگا کہ 27 جون 2013ء کو میرا ایک پیچیدہ ایکڈینٹ ہوا جس کی ری آپریٹ سرجری، 20 نومبر 4:30 طے ہونا پائی تھی۔ اس کی علاوہ طویل عرصہ سے، آنکھوں، دل، اور ہپاٹائٹس کے امراض سے بھی نبرد آزما ہوں۔ 12 نومبر کو کچھ عزیزوں سے اس حوالے سے ایک معقول رقم لارہا تھا اچانک 4 بانیک سوار لڑکوں نے مجھے روکا اور مجھ سے سب کچھ چھیننے لگے، میں نے کچھ مزاحمت کی، یہ بھی کہا کہ یہ پیسے میری بچی کے جہیز اور میرے آپریشن کے ہیں تو انھوں نے مجھ سے میرے ہونے والے آپریشن کا زخم دکھانے کا کہا اور میری مضروب ٹانگ کو انہوں نے جوتوں اور ٹھنڈوں سے بے دردی سے مزید مارا اور پھینک کر چلے گئے سب کچھ لوٹ کر لے گئے۔ اس وقت صاحب فراش اور فلاح ہو کر رہ گیا ہوں، بیماری الگ ستار ہی ہے۔ آپ اہل ثروت مگر اہل دل بھی ہیں تو میری ہر ممکنہ مدد فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ دنوں میں آپ کے گمان سے بھی زیادہ عطاء فرمائے گا۔ ہر قسم کے اطمینان اور گارنٹی کے لیے رجوع فرما سکتے ہیں۔ کراچی کے احباب بنفس نفیس تشریف لا سکتے ہیں فون کر کے آکر میری حالت اور حقیقت کو سمجھ سکتے ہیں۔ والسلام! آپ سب کا خیر اندیش ڈاکٹر سید نعیم احمد ادیب جعفری۔

رابطہ نمبر 0322-3816602/0333-2116062 آپ منی آرڈر بھی بھیجوا سکتے ہیں۔

MEEZAN BAK LTD, LANDHI BABAR MRKT BARANCH A/C (0100919475)

HBL, LANDHI, BABER, MKT, BRANCH A/C:(08907900255101)



سیارہ ڈائجسٹ کے عظیم المثنان اسلامی نمبرز

آثارِ قیامت نمبر

قرآن وحدیث کی روشنی میں علاماتِ قیامت روزِ آخرت اور حیاتِ بعد از موت کا احوال (قیمت: 175 روپے)

رسول نمبر

سیرت پاک پر ایک جامع دستاویز (دو جلدوں میں - قیمت: 350 روپے)

قرآن نمبر

ایمان افروز، عقل پرور اور عمل آفرین پیشکش (تین جلدوں میں - قیمت: 525 روپے)

اخلاق رسول نمبر

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پاکیزہ زندگی کے پاکیزہ واقعات و مشتمل دستاویز (قیمت: 175 روپے)

عکس سیر نمبر

حضرت محمد مصطفیٰ کی حیاتِ طیبہ پر مبنی مقدس تصاویر (قیمت: 275 روپے) خاص ایڈیشن (450 روپے)

اولیائے کرام نمبر

اللہ کے برگزیدہ بندوں کی ایمان افروز داستانیں (چار جلدوں میں - قیمت: 700 روپے)

صحابہ کرام نمبر

ان عظیم ستیوں کی کہانی جنہوں نے رحمتِ عالمین کی معیت میں زندگی بسر کی (قیمت: 175 روپے)

خلفائے راشدین نمبر

اسلام کی سر بلندی کیلئے خلفائے راشدین کی بے مثال قربانیوں کا ذکر (قیمت: 175 روپے)

فرمان رسول نمبر

عاشقانِ رسول کی خدمت میں ایک بے مثال تحفہ (قیمت: 175 روپے)

فہم دین نمبر

سہلی زندگی اور عبادات کے بنیادی مسائل کا حل قرآن وحدیث کی روشنی میں (قیمت: 175 روپے)

انبیائے کرام نمبر

پیغمبرانِ خدا کی حیاتِ طیبہ جاوداں کے روح پرور تذکرے (قیمت: 175 روپے)

ازواجِ مطہرات نمبر

امہاتِ المؤمنین کی پاک زندگی کے واقعات و حقائق تک لیک جگہ لکھنے سے بچاؤ (قیمت: 200 روپے)

دعا نمبر

دُعا تقدیر بدل دیتی ہے حدیث رسول (قیمت: 175 روپے)

معجزات رسول نمبر

سرورِ کونین کی زندگی کے دوران قہرِ نبی ہوئے معجزوں و معجزات و شتمل دستاویز (قیمت: 175 روپے)

قرآنی وظائف نمبر

ہماری آپ کی اور ہر گھر کی نیتوں اور نیتوں کی نیتوں کے لئے قرآنی وظائف (قیمت: 175 روپے)

قصص القرآن نمبر

ان واقعات کا مجموعہ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبیؐ کی امت کو بتلانا ضروری سمجھا (قیمت: 175 روپے)

صحابیات نمبر

100 سے زائد صحابیاتؓ کا تذکرہ جنہوں نے رسول اکرمؐ سے بیعت کی (قیمت: 175 روپے)

اسلامی حکایات نمبر

وچسپ اور ہنر آمیز قصے جس قوتِ ایمانی سے ہر شمار سبق آموز حکایات کا مجموعہ (قیمت: 175 روپے)

حقوق العباد نمبر

حقوقِ مومن و مومنہ کی بیان کرتا مجموعہ جس پر عمل کرے ہی چاہے مسلمان یا کافر ہو (قیمت: 175 روپے)

حج عمرہ اور زیارات نمبر

حج عمرہ کی طریقہ و مسائل اور زیاراتِ مقدسہ کی تفصیلات (قیمت: 175 روپے)

توبہ نمبر

توبہ اللہ کی رحمت کے دروازے کھولتی ہے شہرے واقعات سے مزین توبہ کے آداب و فضائل (قیمت: 175 روپے)

والدین نمبر

والدین کے فضائل و حقوق اور فراموش آگاہ کرتی ہر بخشی دستاویز - ہر گھر کی ضرورت (قیمت: 175 روپے)

لازوال اسلامی واقعات نمبر

رسولِ خدا، خلفہ راشدین، صحابہ کرام اور صالحین کی زندگیوں کے ایمان افروز واقعات (قیمت: 175 روپے)

شرعی احکام نمبر

عہدات سے معاملات، تک اور معاشرت سے لیکر سبب تک مکمل منہاجِ حیات (قیمت: 175 روپے)

پاکستان چلے آنے پر مجبور کر دیا۔ انہیں اپنے بھائی سے بہت محبت تھی اور انہیں چھوڑ کر آنا ان کے لیے یقیناً ایک شخص کام تھا۔ میں سمجھتی ہوں یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت تھی۔ اللہ کو ان سے اچھے کام کرانے تھے۔ انہوں نے دل و جان سے پاکستان کی خدمت کی لوگوں کی بھلائی کے لیے کام کیا۔

ابا جان کو یوں تو اپنی بہنوں حمیدی بیگم اور محمودی بیگم دونوں سے محبت تھی۔ دونوں ان سے بڑی تھیں لیکن وہ محمودی بیگم کو زیادہ چاہتے تھے۔ وہ انہیں پیار سے مونا کہتے تھے۔ وہ ابا جان سے آٹھ سال بڑی تھیں اور جب ابا جان چھوٹے تھے تو انہیں گود میں لیے پھرتی تھیں۔ پھولی جان ابا جان سے بہت محبت کرتی تھیں۔ ان کا دستور تھا کہ وہ عید سے دو تین دن پہلے ہمارے ہاں آ جایا کرتی تھیں اور عید کے دو تین دن بعد اپنے گھر واپس جایا کرتی تھیں۔ وہ حکیم یسین صاحب کی والدہ تھیں۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں۔ ابا جان کی شہادت سے کچھ ہی عرصہ پہلے اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ پھولی اماں کو اللہ سلامت رکھے ہمارے درمیان ہیں۔ وہ ابا جان کے پاس ہی رہتی تھیں۔ ان کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ کبھی انہیں اس کا خال آتا تو میری امی سے کہتیں ”سعدیہ آپ کی بچی بیٹی ہے۔“

حکیم عبدالنہید اور حکیم محمد سعید کی قدریں ایک تھیں، ان کی سوچ خدمت کا جذبہ عام لوگوں کی بھلائی، ذاتی خوبیاں ایک نہیں البتہ شخصیتیں مختلف تھیں۔ کام کرنے کا انداز مختلف تھا۔ بڑے ابا خاموش طبع تھے، ابا جان اپنے خیالات کا بھرپور اظہار کرتے تھے لیکن یہ بعد کے زمانے کی بات ہے۔ شروع میں ابا جان زیادہ نہیں بولتے تھے۔ بہت سی باتوں کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ یوں بھی وہ اپنے اندرونی خیالات اپنے تک ہی رکھتے تھے۔ جیسا کہ عموماً لوگ گھر میں بیٹھ کر کچھ اپنی کچھ دوسروں کی باتیں کرتے ہیں ویسا نہیں ہوتا تھا۔ اس قسم کی باتوں کے لیے ان کے پاس وقت نہیں تھا۔ اکثر کھانے پر اس طرح کی باتیں ہو جاتی ہیں لیکن ہمارے ہاں تو کھانے پر بولنے کی اجازت نہیں تھی۔ خاموشی سے کھانا کھانا ہوتا تھا۔ اگر گودا بھی کھانا ہوتا تو سڑپ کی آواز نہیں آنی چاہیے۔ گودے والی ہڈی الگ رکھ لی جاتی تھی کہ ابا جان چلے جائیں تو شغل ہوگا۔

ہر اتوار کو البتہ شروع میں ابا جان کے کچھ دوست جمع ہو جایا کرتے تھے لیکن یہ گنے چنے لوگ تھے شام کے وقت ہمارے، گھر ایک محفل ہوتی تھی مغرب کے وقت یہ لوگ آ جاتے تھے اور رات کا کھانا ساتھ کھاتے تھے۔ اس محفل میں مختلف موضوعات پر حالات حاضرہ پر آپس میں باتیں ہوتیں تھیں۔ اس محفل میں آنے والوں میں ایک مولانا ظہیر الحسن تھے، عزیز کارٹونسٹ تھے ایک مرزا فرخ بیگ تھے جو ہمارے قریب ہی رہتے تھے۔ ماموں جان ہوتے تھے۔ بس یہی پانچ جیسے افراد تھے۔

ابا جان کے دو قریبی دوست تھے۔ ایک مسرت زبیری اور دوسرے کموڈور آصف علوی، عبداللہ بنگالی اور محمد علی رنگون والا بھی ابا جان کے ابتدائی دوستوں میں سے تھے۔ ان دونوں سے ابا جان کی بڑی قربت تھی۔ ایڈ آرٹس کے عبدالغفور صاحب سے بھی ابا جان کی بہت دوستی تھی۔ وہ ہمارے ہاں آتے تھے اور کبھی وہ آتے اور مجھے کوئی انگریزی میں مضمون لکھنا ہوتا تو میں ان سے مدد لے لیا کرتی تھی۔ میران محمد شاہ بھی ابا جان کے بہت قریب تھے۔ مجھے یاد ہے وہ ہمارے ہاں آیا کرتے تھے۔ ابا جان ان کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ وہ جب ہمارے ہاں آ کر ٹھہرنے لگے تو ابا جان نے ان کے آرام کی خاطر گھر میں بہت سی تبدیلیاں کرائیں۔ میران محمد شاہ کا ایک پرانا ملازم تھا۔ اس کا نام عرب تھا وہ بھی ان کے ساتھ آتا تھا۔ ڈاکٹر سید برکات احمد اور سید یوسف حسین نقوی بھی

اباجان کے بہت قریبی دوست تھے۔ برکات احمد صاحب سے ان کی دوستی دہلی کے زمانے سے تھی۔ برکات احمد صاحب ہندوستان کی فارن سروس میں تھے اور زیادہ تر باہر رہتے تھے۔ اباجان 1956ء میں جب ترکی گئے تو برکات احمد صاحب ہی کے ہاں ٹھہرے تھے۔ بڑے ابا بھی ساتھ تھے۔ برکات احمد صاحب وطن آتے جاتے کراچی میں ضرور ٹھہرتے۔ ان کا قیام ہمارے ہاں ہی ہوتا۔ ان کی بیگم اور بچے بھی ساتھ ہوتے۔ اباجان ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ان کے بچے بھی اباجان سے بہت محبت کرتے تھے۔ برجیس ان کی بیٹی ہیں۔ نیویارک میں رہتی ہیں۔ اباجان وہاں جاتے تو سب کام چھوڑ کر ان کے ساتھ رہتیں۔ سید یوسف حسین نقوی صاحب کا قیام لندن میں تھا۔ ایک زمانہ میں جب اباجان لندن جا کر وہاں مطب کرتے تھے تو اس کا سارا انتظام نقوی صاحب ہی کرتے تھے۔ ان کے بیٹے بھی اباجان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ محمد شعیب صاحب سے بھی جو صدر ایوب کے دور میں پاکستان کے وزیر خزانہ تھے اور بعد میں ورلڈ بینک میں چلے گئے تھے۔ اباجان کی بہت دوستی تھی۔ جمشید نرونجی مہتہ اور حاجی عبداللہ بنگالی اباجان کے ایسے دوستوں میں تھے جنہوں نے ان کی ہر طرح مدد کی۔

اباجان کے دوسرے دوستوں میں جی الانا، اوریس احمد مینائی اور ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی بھی شامل تھے اور اکثر ہمارے ہاں آیا کرتے تھے۔ اباجان نے جرمنی، ترکی، کویت، سعودی عرب اور لبنان میں بھی بہت دوست بنائے۔ ان دوستوں میں شیخ ذکی یمانی، ڈاکٹر عبدالرحمن العواضی اور ڈاکٹر احسان ڈوگر امانی شامل تھے۔ اباجان ان ملکوں کا اکثر دورہ کرتے رہتے تھے۔ وہ صحت اور ثقافت سے متعلق کئی تنظیموں کے رکن تھے اور ان کے اجلاسوں اور عالمی کانفرنسوں میں شرکت کے لیے وہاں جایا کرتے تھے۔ اپنی شہادت سے ایک ماہ پہلے وہ اسلامی ممالک کی تنظیم او آئی سی کے ایک ذیلی ادارے کی کانفرنس میں شرکت کے لیے ترکی گئے تھے۔ جہاں ان دوستوں سے ان کی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ اباجان کا بہت دل تھا کہ میں بھی اس سفر میں ان کے ساتھ ہونی انہوں نے استنبول کے سفر نامے میں لکھا بھی ہے کہ اچھا ہوتا کہ سعدیہ اس سفر میں میرے ساتھ ہوتیں۔ میں بعض نجی مجبور یوں کی وجہ سے نہ جاسکی تھی اور مجھے اب اس کا بہت ملال ہے۔ اللہ کی یہی مرضی تھی۔

امریکہ میں بھی اباجان نے بہت دوست بنائے تھے وہاں کے علمی حلقوں میں اباجان کا بہت احترام تھا۔ واشنگٹن میں ڈاکٹروی کے شاہ اباجان کے معالج سے زیادہ دوست ہو گئے تھے۔ ان کا پورا گھرانہ اباجان کا گرویدہ تھا۔ اباجان بھی ان کا بڑا خیال کرتے تھے اور ہمیشہ احسان مندی کے جذبے سے ان کا ذکر کرتے تھے۔ اباجان کے بہت سے غیر ملکی دوست جن میں جرمنی کے ڈاکٹر ہان ہولز قابل ذکر ہیں کراچی آ کر اباجان کے مہمان رہ چکے ہیں۔

گھر کے معاملات میں اباجان کے کچھ اصول تھے اور ان پر سختی سے کاربند رہتے تھے اور ہم سے بھی یہی چاہتے تھے۔ ان کو اس کا بہت خیال رہتا تھا کہ ملازموں کے اوقات کار مقرر ہونے چاہئیں۔ یہ نہیں کہ ملازم ہے تو سارا دن کام کر رہا ہے۔ اس کو آرام نہیں، رات کو دیر تک ہمارے ہاں کبھی کام نہیں ہوا۔ ان کا حکم تھا کہ نو ساڑھے نو بجے ملازم کو رخصت ہو جانا چاہیے اور اسی طرح ڈیڑھ دو بجے جب وہ مطب سے آئیں تو ملازم گھر میں نظر نہ آئے۔ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ کام ختم نہیں ہوا ہے اور اباجان کے آنے کا وقت ہو گیا ہے تو ملازم کو کچن میں بند کر دیا جاتا تھا۔ وہ ہماری والدہ سے کہتے تھے کہ ملازموں کا ایک دن چھٹی کا مقرر کر دو۔ ورنہ وہ ایک دن خود تم سے اس کا مطالبہ کریں

گے۔ ابا جان اسے بالکل پسند نہیں کرتے تھے کہ ملازم ہے تو وہ صبح سے شام تک کولہو کے بتل کی طرح لگا ہے۔ کچھ آرام کا بھی وقت ہونا چاہیے وہ وقت کے بڑے پابند تھے اور چاہتے تھے کہ گھر میں بھی وقت کی پابندی ہو۔ وقت کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ جس وقت ابا جان نے کہہ دیا کہ فلاں کام فلاں وقت ہوگا تو وہ کام اسی وقت ہوتا تھا۔ میری شادی کے موقع پر فوٹو گرافر آیا اور کہنے لگا کہ پورٹریٹ بنانی ہے۔ مجھے تیاری میں دیر ہوگئی تھی میں نے کہا کہ میں پورٹریٹ نہیں بنواؤں گی۔ دیر ہو جائے گی۔ ہماری تمام سہیلیاں کہہ رہی تھیں کہ پورٹریٹ بنے گی لیکن میں نے منع کر دیا کیوں کہ ابا جان نے جو وقت سبج پر پہنچنے کا مقرر کر دیا تھا، اس وقت وہاں پہنچنا ضروری ہے، دیر کا سوال ہی نہیں ہے۔

ہماری شادی پر دہلی سے قاضی سجاد حسین صاحب آ گئے تھے وہ ابا جان کے استاد تھے۔ امی جان کی ان کے آنے سے گویا عید ہوگئی کہ اب ساری خریداری ان کی معرفت ہو جائے گی۔ ابا جان ان سے کہتے مولانا صاحب آپ سنبھال لیجئے۔ ابا جان شروع میں خود خریداری کے لیے جاتے تھے۔ ایک دو دفعہ مجھے ہوتے پہنانے انگلش بوٹ ہاؤس لے گئے۔ وہاں ان کا حساب تھا۔ ابا جان پیسوں سے ڈیل نہیں کر سکتے تھے۔ خریداری کرتے تھے۔ بل آجاتا تھا ادائیگی کر دی جاتی تھی۔ جلال دین بھی ایسا ہی تھا۔ ابا جان دکانوں پر جاتے تھے لوگ انہیں پہچان جاتے تھے اور ان کے گرد جمع ہو جاتے۔ ابا جان کہتے تھے کہ میرے دکانوں پر جانے سے دکان داروں کو تکلیف ہوتی ہے اور گاہکوں کو بھی، پھر وہ شاپنگ کے لیے کم ہی جانے لگے۔

شادی کے معاملے میں ابا جان رسم و رواج کے قائل نہ تھے۔ وہ زیادہ خرچ کے بھی قائل نہ تھے۔ شادی میں کھانے کے خلاف تھے۔ میری شادی پر شام کو چائے کا انتظام تھا۔ میرا خیال ہے کئی ہزار مہمان بلائے گئے تھے۔ بہت اچھا انتظام تھا۔ ابا جان چاہتے تھے کہ میں دیکھوں کہ کیسے انتظامات ہو رہے ہیں۔ وہ کہتے ”سعدیہ! تم دیکھ رہی ہو جو انتظامات ہو رہے ہیں۔ جب میں دلہن بنی بیٹھی تھی تو اس وقت بھی وہ سبج پر آ کر مجھ سے کہنے لگے۔ ذرا اٹھ کر دیکھو تو کیسا انتظام ہے۔“ میں سوچنے لگی کہ میں دلہن بنی بیٹھی ہوں میں کیسے اٹھ کر دیکھ لوں کہ کیسا انتظام ہے۔ دراصل وہ چاہتے تھے کہ میں دیکھ لوں میری شادی کا انتظام انہوں نے کیسا کیا ہے۔ مطمئن ہو جاؤں خوش ہو جاؤں۔

ہماری بڑی بیٹی پیدا ہوئی تو ابا جان اسلام آباد میں تھے، وہ مطب کے لیے آئے ہوئے تھے۔ شعبان کی 14 تاریخ تھی۔ وہ بہت خوش تھے۔ پورے چاند کو دیکھ کر انہوں نے ہنسی کا نام ماہ نیم ماہ رکھا۔ پھر انہوں نے ہنسی کو قرآن پاک اور ایک قلم دیا۔ یہ میرے پاس اب بھی رکھا ہے۔ قرآن پاک سونے کے ایک چھوٹے سے کیس میں رکھا تھا۔ کہتے تھے دیکھو! میں نے اسے کتاب اور قلم دیا ہے۔ میری دوسری بیٹی آمنہ بھی اسلام آباد میں پیدا ہوئیں لیکن ابا جان اس موقع پر وہاں موجود نہ تھے میری والدہ تھیں۔

آمنہ کی پیدائش کے بعد ہم نے بہت سفر کیا۔ ابا جان کے ساتھ سفر کا آغاز بھی اسی زمانے میں ہوا۔ ہوتا یہ تھا کہ ہم ہنسی کو دادی کے پاس چھوڑ دیتے تھے اور آمنہ کو نانی کے پاس۔ لوگ کہتے تھے تمہارا بڑا اچھا رائجمنٹ ہے۔ ایک کو دادی کے پاس چھوڑ دیا اور دوسری کو نانی کے پاس اور چلی گئیں۔ اس طرح میں نے ابا جان کے ساتھ کافی سفر کیے۔ اس رائجمنٹ کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ماہ نیم ماہ اپنے دادا دادی سے زیادہ مانوس ہو گئیں اور آمنہ نانا نانی سے۔



39



سیاہ	January 2015						
	Sun	Mon	Tue	Wed	Thu	Fri	Sat
1					1	2	3
2	4	5	6	7	8	9	10
3	11	12	13	14	15	16	17
4	18	19	20	21	22	23	24
5	25	26	27	28	29	30	31

سیاہ	February 2015						
	Sun	Mon	Tue	Wed	Thu	Fri	Sat
6	1	2	3	4	5	6	7
7	8	9	10	11	12	13	14
8	15	16	17	18	19	20	21
9	22	23	24	25	26	27	28

سیاہ	May 2015						
	Sun	Mon	Tue	Wed	Thu	Fri	Sat
10						1	2
11	3	4	5	6	7	8	9
12	10	11	12	13	14	15	16
13	17	18	19	20	21	22	23
14	24	25	26	27	28	29	30
15	31						

سیاہ	March 2015						
	Sun	Mon	Tue	Wed	Thu	Fri	Sat
16	1	2	3	4	5	6	7
17	8	9	10	11	12	13	14
18	15	16	17	18	19	20	21
19	22	23	24	25	26	27	28
20	29	30	31				

سیاہ	June 2015						
	Sun	Mon	Tue	Wed	Thu	Fri	Sat
21		1	2	3	4	5	6
22	7	8	9	10	11	12	13
23	14	15	16	17	18	19	20
24	21	22	23	24	25	26	27
25	28	29	30				

سیاہ	April 2015						
	Sun	Mon	Tue	Wed	Thu	Fri	Sat
26				1	2	3	4
27	5	6	7	8	9	10	11
28	12	13	14	15	16	17	18
29	19	20	21	22	23	24	25
30	26	27	28	29	30		

02

46

سیارہ	October 2015						
	Sun	Mon	Tue	Wed	Thu	Fri	Sat
40					1	2	3
41	4	5	6	7	8	9	10
42	11	12	13	14	15	16	17
43	18	19	20	21	22	23	24
44	25	26	27	28	29	30	31

سیارہ	July 2015						
	Sun	Mon	Tue	Wed	Thu	Fri	Sat
27				1	2	3	4
28	5	6	7	8	9	10	11
29	12	13	14	15	16	17	18
30	19	20	21	22	23	24	25
31	26	27	28	29	30	31	

سیارہ	August 2015						
	Sun	Mon	Tue	Wed	Thu	Fri	Sat
31							1
32	2	3	4	5	6	7	8
33	9	10	11	12	13	14	15
34	16	17	18	19	20	21	22
35	23	24	25	26	27	28	29
36	30	31					

سیارہ	September 2015						
	Sun	Mon	Tue	Wed	Thu	Fri	Sat
36			1	2	3	4	5
37	6	7	8	9	10	11	12
38	13	14	15	16	17	18	19
39	20	21	22	23	24	25	26
40	27	28	29	30			



سیارہ	November 2015						
	Sun	Mon	Tue	Wed	Thu	Fri	Sat
45	1	2	3	4	5	6	7
46	8	9	10	11	12	13	14
47	15	16	17	18	19	20	21
48	22	23	24	25	26	27	28
49	29	30					

سیارہ	December 2015						
	Sun	Mon	Tue	Wed	Thu	Fri	Sat
52			1	2	3	4	5
53	6	7	8	9	10	11	12
54	13	14	15	16	17	18	19
55	20	21	22	23	24	25	26
56	27	28	29	30	31		

”خود جلس دید اغیار کو بینا کر دیں“



husain_sayyed2001@yahoo.com

قلندر حسین سید سیارہ ڈائجسٹ کے دیرینہ قاری اور مستقل قلم کار ہیں۔ گزشتہ کئی ماہ سے وہ ایسی بہترین تحریروں کا مجموعہ قارئین کی نذر کر رہے ہیں جو قارئین میں بے حد پسند کی جارہی ہیں اور جن کے حصول کے لیے بے شمار کتب، جرائد اور انٹرنیٹ سے استفادہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جناب سید نے قارئین سیارہ ڈائجسٹ کیلئے اپنے گہرے مطالعہ اور تحقیق کے نچوڑ کیساتھ ساتھ دنیائے ادب کی چنیدہ کتب و جرائد سے اخذ اقتباسات پر مشتمل انتخاب کو زیر نظر سلسلے میں یکجا کر دیا ہے۔ ان تحریروں میں شہد جیسی مٹھاس، لیموں کی کھٹاس، کوڑتھا کی کڑواہٹ اور زہر ہلاہل کی آمیزش ہے۔ !!

کیا تھا۔ ان کے مطابق انسانی روح کا وزن 21 گرام ہوتا ہے۔ اگر ایک بار یہ 21 گرام انسانی جسم سے نکل جائیں تو پھر پیچھے دو سو پاؤنڈ گندگی اور بدبو رہ جاتی ہے جو بے روح لاش کے سوا کچھ نہیں۔
☆ ایک روایت ہے کہ بھارت کے لیڈروں سے پوچھا گیا کہ 1965ء میں جنگ کے دوران آپ نے پاکستان سے مار کھائی لیکن 1971ء میں پاکستان نے مار کھائی۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ 1965ء سے 1971ء تک ہم اسلحہ بناتے رہے اور فوج تیار کرتے رہے اور پاکستانی جنگی ترانے بناتے رہے۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

”میں نے پڑھا“

☆ ملک، کو بڑی طرح لوٹا اور برباد کیا گیا ہے۔
سوائے جمہوریت کے کچھ بھی نہیں بچا۔
☆ آج مغرب بحران زدہ ہو گیا ہے کیونکہ سرمایہ داری کی بنا پر انسانی فلاح نہیں، صرف منافع اور سود کا حصول چاہیے۔ جنگوں سے حاصل ہو، ہیروئن اور گنا فروخت یا اسمگل کر کے ہو!
☆ دن کو رزق کی تلاش کرو اور رات کو اسے جو تمہیں رزق دیتا ہے (حضرت علیؓ)
☆ جاندار خواہ انسان ہو، چونٹی ہو یا ہاتھی، اس کو روح زندہ رکھتی ہے۔ نیو پارک کے چند سائنس دانوں نے کچھ عرصہ قبل انسانی روح کا وزن

انہیں کے دم سے رونق ہے۔ یہ ہلکے پھلکے، میٹھے شکوے اور جھگڑے بہن، بہن، بھائی، بھائی کے رشتے میں بھی موجود ہیں۔ مگر بہن، بھائی کے رشتے کی زد میں زیادہ شدت پکڑ جاتے ہیں۔ عموماً ہر ماں ہی اس کوفت میں مبتلا نظر آتی ہے تو کبھی وہ شائستگی سے اسے ختم کرنا چاہتی ہے، تو کبھی لامحالہ ڈانٹ ڈپٹ کا ہتھیار استعمال کرنا پڑتا ہے۔

لیکن ٹھہریے، ذرا غور کیجئے ناراضی سے لبریز لہجے میں، ان شکایات میں غصیلے بھڑکیلے جموں میں کہیں بہت پیارا، دل رُبا، اٹوٹ اور گہرا رشتہ بھی تو موجود ہے۔ کسی بہت ہی پاکیزہ اور روح پرور تعلق کا ذکر ہے اور وہ ہے ”بھائی“ کا۔ یہ لفظ محض چند حروف سے نہیں بنا بلکہ یہ تو مامتا کی خوش بو اور پدرانہ شفقت کے رنگوں کا مرکب ہے یہ وہ آسانی رشتہ ہے، جو زمین پر اتر کر بہن اور بھائی دونوں کو معتبر بناتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ رشتہ بہن اور بھائی دونوں ہی کو ایک نعمت غیر مترقبہ کے طور پر عطا کیا ہے۔ والدین کے بعد یہ رشتہ خلوص اور ایثار و وفا میں اپنی مثال آپ ہے۔ یہی شکوے گلے اس بندھن کا حسن ہیں۔ یہ معصوم، انوکھی شرارتیں وقتی بدمزگی کا باعث تو بنتی ہیں مگر تھوڑی ہی دیر میں دل سے بدگمانی کے بادل چھٹ جاتے ہیں۔ جہاں بہن اور بھائی کو متاع حیات کے درجے پر فائز کرتی ہے، وہیں ہر بھائی بھی اپنی بہن کا لاڈ اٹھانے میں نہال ہوا جاتا ہے۔ بہن کی آنکھ کے آنسو بھائی کو تڑپا دیتے ہیں، پیسے ادھار لے کر واپس نہ کرنے والا بھائی بلاچوں چراں بہن کی فرمائش پوری کرنے میں اپنی ساری پاکٹ منی خرچ کر دیتا ہے۔ بہن کے چہرے کی افسردگی بھائی کے ملال میں اضافہ کرتی ہے اور وہ عہد کرتا ہے کہ آئندہ کبھی بہن کو تنگ نہیں کرے گا۔ مگر کچھ ہی دیر بعد وہی دھما چوٹری اور نتیجتاً دونوں کی ٹوٹو میں میں شروع ہو جاتی

”بدن بھائی کی نوک جھوک، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں مذہب دونوں کو شرم و حیا کا دامن تھامے رکھنے کی تاکید کرتا ہے مرد کے دامن کی کچڑ کچڑ رہے گی، عورت کا داغ بن جائے گی“ بیٹا بیٹی میں تخصیص کیوں؟“ سوال ایک جواب کئی۔

”امی! بھائی سے بولیں کہ میرے پیسے واپس کرے۔“ امی دیکھیں! بھائی نے آج پھر میری آنس کریم بغیر پوچھے کھالی ہے۔“ امی! بھائی نے آج پھر اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر ڈرائنگ روم کا حلیہ بگاڑ دیا ہے، مالاں کہ تھوڑی دیر پہلے ہی میں نے ڈسٹنگ کی تھی اور دیکھیں، یہ دیکھیں، کارپٹ پر گندے ہوئے لیے آرہا ہے اور،“ امی! بھائی کی ایک بات بالکل غلط ہے کہ مجھے چھٹی کے بعد اکثر دیر سے پک کرتا ہے۔ بیس بیس منٹ اس کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ آپ، مجھے دین یار کٹے کا بندوبست کر دیں میں روزانہ اس کا انتظار نہیں کر سکتی، بس کہہ دیا ہے میں نے.....!!“

یہ وہ شکایات ہیں، جو آپ کی پیاری، راج دلاری بیٹی کو ہفتوں یا مہینوں نہیں بلکہ ایک ہی دن میں کئی کئی بار بھائی سے پیدا ہو جاتی ہے جو روتی، منہ بسورتی اپنے بھائی سے سخت تالاں ہے اور خوب برا بھلا کہتی ہے۔ کبھی آپ مامتا کی آنچ دے کر اس کو شانت کرتی ہیں تو کبھی اس کے بھائی کو ڈانٹ ڈپٹ کرتی ہیں۔ آپ نہ تو بیٹی کے نازک دل کو دکھانا چاہتی ہیں اور نہ ہی آنکھ کے تارے، بیٹے کو شرمندہ دیکھنا چاہتی ہیں۔ اپنے بیٹے اور بیٹی کے درمیان بہن بھائی کا یہ رشتہ آپ کو بھی بہت پیارا ہے۔ ولی آسودگی کا سامان ہے۔ آپ کے گھر میں

مزید منتخب خطوط نذر قارئین ہیں۔

بے شک مرد اور عورت قدرت کا شاہ کار ہیں، ان میں قدرے مماثلت بھی ضرور ہے۔ دونوں دو پاؤں پر چلتے ہیں۔ دونوں کے بازو ہاتھ ہیں اور دونوں کے شانوں پر سر ہے۔ کھانے کے لیے ایک منہ ہے، دیکھنے کے لیے دو آنکھیں اور سننے کے لیے دو کان مگر دیکھنے والے نے اس حقیقت کو نہ جانا۔ دونوں باہر سے ایک ہیں اور اندر سے قطعی مختلف، ڈاکٹر اقبال کہتے ہیں کہ عورت کو دماغ کم زور ملا تھا، اس لیے تخلیقی قوت دماغ کی بجائے رحم کو عطا کی گئی ہے۔ مرد دماغ سے تخلیق کا کام لیتا ہے اور عورت رحم سے۔ عورت کی کوکھ سے ایک نسل نے جنم لینا ہوتا ہے، کیوں کہ کوئی ماں کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔ یورپ میں تو مرد اپنی شناخت ماں سے بھی کرانے کا مجاز ہے!

بات یہ ہے کہ عورت کی عصمت ایک سفید سمور کی طرح ہوتی ہے۔ اس پر ایک دھبہ بھی گوارا نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے چرچل نے کہا تھا کہ تم مجھے نیک عورتیں دو! میں تمہیں بہترین قوم دوں گا۔ عورت چراغ خانہ ہے، شمع محفل نہیں اور اسلام میں بھی مرد اور عورت کے لیے علیحدہ علیحدہ ضابطہ حیات موجود ہے۔

(قلندر حسین سید)

یہ سچ ہے کہ لڑکا، لڑکی دونوں برابر ہے۔ اسلام دونوں کو تاکید کرتا ہے کہ شرم و حیا کا دامن نہ چھوڑیں، لیکن لڑکی پر لڑکے سے زیادہ ذمہ داری اس لیے عائد ہوتی ہے کہ لڑکی ماں، بہن، بیوی اور بیٹی ہے۔ یہ وہ رشتے اور ہستیاں ہیں جن کی وجہ سے مرد باپ، بھائی اور شوہر معاشرے میں سر اٹھا کر چلتے ہیں پھر عورت کسی بھی معاشرے کی بنیاد اور اکائی ہے۔ یہی ایک عورت سارے خاندان کو سنوارتی ہے، اسی لڑکی کی گود میں ہل کر ایک نسل جوان ہوتی ہے

ہے اور ماں بے چاری اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی کے مصداق پھر سے ان گتھیوں کو سلجھانے میں کوشاں ہو جاتی ہے۔

والدین سے روزانہ ایک دوسرے کی شکایتیں کرتے یہ بچے معصوم ہیں۔ ان کے درمیان ایسا ان مول رشتہ موجود ہے، جس کی پاکیزگی اور تقدس لفظوں کا محتاج نہیں۔ لہذا والدین معمولی اور معمول کی ان ریشوں پر ہرگز دل گیر نہ ہوں بلکہ ان شکوؤں، گلوں کو اپنے لاڈلوں کے بچپن کی یاد بنا کر دل کے نہاں خانوں میں چھپائیں۔ یہ شرارتیں اور آنکھیلیاں ان بچوں کی عمر کا تقاضا ہے اور ہر عمر کا ایک اپنا حسن ہے۔ خفت اور دباؤ سے اس حسن کو مت گھنہ یے۔ گزرتا وقت بچوں کے ہاتھ میں سنجیدگی اور بردباری خود ہی تھما دیتا ہے۔ سو! آپ کی تربیت کبھی راہیگاں نہیں جائے گی۔ دعاؤں کا وہ جوار بھاٹا جو آپ کے دل میں ہمہ وقت موجزن رہتا ہے وہ خود ہی ان کی حفاظت کرے گا انہیں صلح صفائی پر آمادہ کرے گا۔ بھائی خود ہی جان جائے گا کہ بہن تو مہمان ہے۔ ایک نہ ایک دن گھر آئیں گے ویران کر کے نئی دنیا بسائے گی اور پھر اپنی بہن کے لیے بہترین ہم سفر کے چناؤ میں یقیناً سب سے زیادہ ممد و معاون اس کا بھائی ہی ہوگا اور اگر آپ (ماں) ان روز روز کی الجھنوں اور شکایتوں پر اپنا دل میلانہ کرتی تو یقیناً اپنی بیٹی کے دل کی بات بھی جان لیتیں، کہ جرم نے جان لی ہے، وہ یہ کہ آپ کی دلاری بیٹی اپنے لیے ایک من موہنی سی بھابھی لینے جلد ہی چاند پر جانے والی ہے، ذرا اسی سے پوچھیے۔ ”گناہ برابر ہے تو بیٹا، بیٹی میں تخصیص کیوں.....؟“ نے، لاہور کے اٹھائے ہوئے سوال کے جواب میں موصول ہونے والے خطوط کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے۔ اسی حوالے سے چند

چھپانے کے موثر عملیات اور کالا دھن کسی پر ظاہر نہ ہونے کے آزمودہ تعویذات۔ امتحان میں ناکامی یا دھرتیا بازوں کو منتشر کرنے میں ناکامی۔ ہر ناکامی کو کامیاب میں بدلنے کا کام بذریعہ عملیات و تعویذات و جنات و چکریات کیا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ سائیں لفنگا سرکار کے قبضے میں جنات کا پورا ریوڑ ہے۔ پہلے آؤ پہلے پاؤ کی بنیاد پر جنات سے دشمنوں کی ٹانگیں تڑوائیں۔ اسمبلیاں تڑوائیں۔ فیکو کریٹس کی حکومت بنوائیں۔ اپنے حق میں ووٹ ڈنوائیں۔ عوام کو بے وقوف بنوائیں۔ قرضے معاف کروائیں۔ رقم ڈبل کروائیں یا کوئی دو نمبر کا کام کروائیں۔ ہر کام آپ کی مرضی کے مطابق ہوگا۔ سنگدل محبوب آپ کے قدموں میں۔ دل پھینک شوہر منٹوں میں تارک الصورات، ساس آپ کی اگلے جہاں، دولت کی دیوی آپ پر مہربان، بجلی چوری آپ کی دسترس میں۔ انعامی رقم آپ کے کھیسے میں۔ شہرت آپ کی لوٹری اور کھایا پیا آپ کا ہضم۔

نوٹ: ہر کام بغیر لالچ اور نذرانے کے کیا جاتا ہے۔ البتہ جنات کے قیام اور طعام پر کافی خرچہ اٹھ جاتا ہے۔ عاقل را اشارہ کافی است۔ اشتہاری سائیں لفنگا سرکار، بھنگ پورہ۔

(وقار خاں کالم جنگ ڈاٹ کام سے اقتباس)

”دعاؤں سے چلنے والا ملک“

میں نے سنی تو انائی سے چلنے والی کار بنائی ہے۔ امریکی سائنسدان نے بتایا۔

”جلد پٹرول اور ڈیزل سے جان چھٹ جائے گی۔“

”میں نے بھاپ سے چلنے والا انجن بنایا تھا“

برطانوی سائنس دان نے بتایا ”ایسے انجن برسوں تک ریل گاڑیاں کھینچتے رہے۔“

”میں نے ہوا سے چلنے والی چکی بنائی تھی“

اگر ایک لڑکی خراب ہوگئی تو پوری نسل کے خراب ہونے کا اندیشہ ہے، جب کہ اولاد کی پرورش میں مرد کا اتنا اہم کردار نہیں ہوتا، ایک لڑکا خراب ہو تو اس کو ایک سلجھی ہوئی با کردار لڑکی درست کر سکتی ہے لیکن کسی لڑکے میں ایسے جوہر نہیں ہوتے۔ ایک حدیث شریف کا مفہیم ہے کہ ایک عورت کی بد کرداری یا بے حیائی کی وجہ سے 4 مرد جہنم میں جائیں گے۔ اس کا باپ، بھائی، شوہر اور اس کا بیٹا، کیوں کہ مختلف ادوار میں یہ لڑک وہ ہیں جو ایک عورت کو کنٹرول کرتے ہیں اور اس کو اگر بے راہ روی سے نہ روکیں (قدرت رکھنے کے باوجود) تو وہ جہنمی ہوں گے، جب کہ ایک مرد اپنے کیے کا گنہگار ہے۔

(شیخ نعمان ساجد)

(فریحہ اسحاق کا کالم ”پیارا گھر“ سنڈے میگزین)

جنگ ڈاٹ کام سے اقتباس)

نوحہ قلم

”خاص اشتہارات“

کالے علم اور کالے علم کی کاٹ کے ماہر کالے شاہ المعروف سائیں لفنگا سرکار کا اعلان ہے کہ دنیا میں ہر مصیبت کا حل موجود ہے۔ چاہے وہ کالے علم کے اثرات ہوں یا کالے دھن کے۔ ایک رات کے عمل سے آپ پر کالا علم کرنے والے کا منہ کالا اور اگر آپ کالا دھن اکٹھا کر کے اپنا منہ کالا کر چکے ہیں تو شرطیہ ایک ہفتہ میں آپ کا دھن اور منہ چٹا سفید۔ کالا دھندا کرنے والوں کے لیے پولیس اور قانون نافذ کرنے والے دیگر اداروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے یا رام کرنے کے تیر بہدف نسخے، مخالفین اور رقیبوں کو کالے پانی کی سزائیں دلوانے کے کامیاب گر۔ سرکاری محکموں کی کالی بھیڑوں کا گارنٹی شدہ تحفظ، کالی رتوں کی شرمناک وارداتوں پر پردہ ڈالنے کا حیرت انگیز ہنر۔ کالے کر توت میڈیا سے



جہاں سیفٹی . . . وہاں کوٹلا شوز

سب کہہ دو سیفٹی

پھر کہہ دو

کوٹلا سیفٹی شوز



**LOCAL AND
FOREIGN MADE**

USA-Germany-England
Taiwan-China
and Pak Made



KOTLAA

**SAFETY HALMET
& SAFETY SHOES**

FIRST FLOOR, ASLAM ARCADE, 16-McLEOD ROAD, LAHORE. Ph: 75-14287-88

ہمارا پہلا پڑاؤ تھا۔

بھنجور کے بعد ہمارا دوسرا پڑاؤ ہالے جی جھیل پر تھا جو سندھ وائلڈ لائف کے تحت جنگلی حیات کے تحفظ کا ایک اہم مقام ہے۔ ٹھٹھہ ضلع میں واقع پھر جھیل بھی جسے پاکستان کی سب سے بڑی جھیل کہا جاتا ہے۔ اس زمرے میں آتی ہے جسے مصنوعی طریقے سے وسیع کیا گیا ہے۔ سرد ممالک سے ہجرت کر کے آنے والے پرندے ہالے جی جھیل پر اترتے ہیں۔ ان ہجرتی پرندوں اور جھیل میں موجود مگرچوں کو دیکھنے والے ہم جو افراد کے لیے یہاں سہولتیں مہیا کی گئی ہیں۔ ٹھٹھہ شہر سولہویں اور سترہویں صدی کے دوران صوبہ سندھ کا دارالحکومت رہ چکا ہے بلکہ کئی معنوں میں یہ قدیم شہر آج بھی سندھ کا ثقافتی دارالحکومت سمجھا جاتا ہے۔ سندھ کی روایتی ”اجرک“ کی بلاک پر تنگ آج بھی پورے سندھ میں ٹھٹھہ سے بہتر کہیں نہیں کی جاتی۔ مکھی کا تاریخی قبرستان بھی ٹھٹھہ میں واقع ہے جسے دنیا کا سب سے بڑا قبرستان کہا جاتا ہے یہاں دس لاکھ سے زائد قبریں اور ایک لاکھ صوفیوں کے مزارات اور مقابر موجود ہیں۔ جن کا تعلق چودھویں صدی کے وسط سے تھا۔ مکھی قبرستان کی پہاڑیوں کو ”اقوام متحدہ کے عالمی ورثے“ کی حیثیت دے دی گئی ہے۔

ان تمام مقامات سے گزرتے ہوئے ہم بھٹ شاہ پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ بھٹ شاہ کے معنی ہیں ”بادشاہ کا ٹیلہ“ جو حیدرآباد سے قریب واقع ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے سالانہ عرس کا آغاز ہو چکا تھا۔ ہم لوگوں نے ان کے مزار کو گھوم پھر کر دیکھا۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے تمام مادی آسائشوں اور آسانیوں کو ترک کر کے اپنی پوری زندگی غریبوں اور مفلسوں کے لیے وقف کر دی تھی۔ اس کی تقریبات ایک میلے کی صورت میں منائی جاتی ہیں۔ شاہ

یونانی سائنسدان نے بتایا۔ ”اب انہیں کام میں لا کر بجلی بنائی جا رہی ہے۔“

پھر ان تینوں نے وہاں موجود سیاست دان سے پوچھا ”آپ نے بھی کچھ بتایا ہے؟“
”جی ہاں!“ وہ نحیف آواز میں بولے ”میں نے دعاؤں سے چلنے والا ملک بنایا ہے۔“

☆☆☆

فاطمہ بھٹو کے کالم سے

کراچی سے بھنجور کا فاصلہ چالیس میل ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں سے آٹھویں صدی میں محمد بن قاسم سندھ میں داخل ہوا۔ اگرچہ اب بھنجور کے قدیم آثار اینٹوں اور مٹی کے ساختہ ٹائلز کی صورت میں ہی نظر آتے ہیں اور بہت کچھ وقت کے ہاتھوں فنا ہو چکا ہے لیکن وہاں اس بات کے آثار اور نشانات آج بھی تلاش کیے جاسکتے ہیں جن کے سبب یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی قدیم تہذیب میں دریائے سندھ کے کنارے پر ایک شاندار تہذیب کا وجود رہ چکا ہے جسے تخیل کی آنکھ سے دیکھا جاسکتا ہے۔ حیرت ناک واقعہ یہ ہے کہ جنوبی ایشیا کے خطے میں پائی جانے والی پہلی مسجد کی بنیادوں کے آثار بھی بھنجور میں دریافت کیے گئے ہیں۔ سندھ میں مسلمانوں اور اسلام کی آمد سے قبل بھنجور میں پہلے مغربی ایشیاء کی سلطنت پارٹھیا کے باشندے آباد ہوئے۔ جن کے بعد ہندو اور بدھ مت کے پیروکاروں نے بھنجور کو اپنا مسکن بنالیا جسے برصغیر میں ایک اہم تجارتی اور کاروباری مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ بھنجور میں ایک عجائب گھر بھی قائم کیا گیا ہے جہاں چین کے بنے ہوئے برتن، اسلامی خطاطی کے کوئی زبان میں تحریر کیے گئے نمونے، چکنی مٹی سے تیار شدہ بھٹیاں اور تنور، ہامی دانت اور میرا کوٹا سے بنی جیولری بھی رکھی گئی ہے۔ میں اپنی دو سہیلیوں کے ہمراہ اندرون سندھ کے سفر پر روانہ ہوئی تو بھنجور

بے دریغ استعمال یہ ہم پر کرتے ہیں وہ کہاں اور کیسے تیار کی جاتی ہیں؟

ان میں سے کئی نیم حکیموں کے پاس کسی مسند ادارے کی سند یا ڈپلوما بھی نہیں ہوتا۔ کہتے ہیں کہ ہم یہ کام شوق سے کرتے ہیں تو کیا ایک انسان کی صحت سے کھیلتا بھی کسی کی (Hobby) ہو سکتی ہے؟ یونانی 'آیور ویدک اور ہومیو پیتھک تعلیم اور ادویات پر جو نام نہاد نگرانی ہوتی ہے۔ وہ نیشنل کونسل برائے ہومیو پیتھک اور نیشنل کونسل برائے طب کے ذریعے ہوتی ہے۔ جن کے ممبران کی اکثریت "میرا قاتل ہی میرا منصف ہے" کے مصداق انہی تعلیمی اور ادویات ساز اداروں کے مالکان پر مشتمل ہوتی ہے۔

وطن عزیز میں تقریباً ایک لاکھ 35 ہزار ہومیو پیتھک ڈاکٹر 50 ہزار طب کے پریکٹسز موجود ہیں لیکن یہ تمام بھی اپنی کونسل کے پاس رجسٹرڈ نہیں۔ نہ جانے کتنوں نے پیشہ ورانہ تعلیم ایسے اداروں سے حاصل کر رکھی ہے۔ جہاں داخلے سے فراغت تک کوئی مستند معیار سرے سے مقرر ہی نہیں۔ امتحان کا کوئی محسوس طریقہ کار ہے اور نہ تعلیم کا کوئی مستند نظام، نہ ہی کسی بورڈ یا یونیورسٹی سے الحاق، ان میں سے بعض ان کے اپنے بقول ایسی ایسی بیماریوں کے علاج پر بھی قدرت رکھتے ہیں جن کا علاج ہے ہی نہیں۔

ہومیو پیتھک اور طب کی جن ادویات کا بے دریغ استعمال ہم پر کیا جاتا ہے ان کے متعلق بھی کوئی قانون لاگو نہیں۔ جس کا جہاں جی چاہے وہ اپنی مرضی کی کوئی بھی دوا بنا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے ان ادویات میں (Steroids) کا استعمال کر کے لوگوں کو بے وقوف بنانے، ان کے مدافعتی نظام کو کمزور کرنے اور ان کی صحت کو بگاڑنے کی شکایات سننے میں اکثر ملتی رہتی ہیں۔ اس طرح جو کشتے بنائے جاتے ہیں ان میں دھاتوں کا استعمال کیا جاتا ہے جو درست

عبداللطیف بھٹائی کے مقبرے کو پاکستان کے واحد مقبرے کی حیثیت حاصل ہے جہاں پورے سال غروب آفتاب کے بعد قوالی کا دور چلتا ہے۔

لاڑکانہ میں مختصر قیام کے بعد دوسرے دن ہم لوگ کراچی واپس روانہ ہو گئے۔ دوپہر تک ہم منجھر جمیل تک پہنچ چکے تھے جس کی لہروں پر کشتیوں سے بنے مکانات ڈول رہے تھے۔ منجھر جمیل کو آپ صحیح معنوں نہ صرف پاکستان بلکہ ایشیاء کی بڑی جمیل کہہ سکتے ہیں۔ آسمان اس جمیل کے پانی میں تیرتا نظر آتا ہے۔ یہاں ہم نے ماہی گیروں کی تیار کردہ پلا مچھلی اور سائبیریا سے ہجرت کر کے آنے والی مرغابیوں کے گوشت سے لہج کیا جو روسی موسم سرما کی شدید سردی سے بچ کر اس طرف آنکلی تھیں تاکہ ہماری لذت کا مودہن کا سامان مہیا کر سکیں۔

سہون شریف میں واقع حضرت لعل شہباز قلندرؒ کے مزار پر وہاں دھمال ڈالنے والے صوفی فقیر ہی لوگوں کی توجہ کا مرکز نہ تھے بلکہ میری پہلی سونی (جس کا تعلق لندن سے تھا اور وہ پہلی بار پاکستان آئی تھی) بھی ان کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ ہم اس مزار کے دروازے سے باہر نکلے جو سونے کا بنا ہوا ہے اور جسے شہنشاہ ایران محمد رضا شاہ پہلوی نے تحفہً پاکستان کو پیش کیا تھا۔

حیران ہونے کی ضرورت نہیں

اکثر حکیموں اور ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی بیماری ایسی نہیں، جس کا علاج ان کے پاس نہیں، علاج بھی بڑا موثر، بڑا ہی آسان اور بڑا ہی سستا، جس کا کوئی سائیڈ افیکٹ نہیں۔ اسی لیے بے شمار لوگ طرح طرح کی بیماریاں لے کر بڑی امید کے ساتھ ان حضرات کے پاس جاتے ہیں لیکن کیا کوئی یہ بھی جانتا ہے کہ ان میں سے اکثر کی حقیقت کیا ہے؟ اور جن ادویات کا

دانش و حکمت کی ساری روشنی کے باوجود
کم ہی ملتا ہے زمانے میں کم آزاد آدمی

زندگی

میرے نزدیک زندگی ایک شمع کی مانند نہیں ہے جو
ایک مختصر دور لیے تک روشنی بہم پہنچا کر اپنے وجود سے ہاتھ
دھو ٹھنکتی ہے بلکہ میرے نزدیک زندگی ایک مشعل کی مانند
ہے اور میں اس مشعل کو آنے والی نسل کو منتقل
کرتا چاہتا ہوں تاکہ وہ اسے مزید روشنی سے ہمکنار کرے۔
(برناڈشا)

اس جہاں رنگ و بو کی رونقیں، چہل پہل،
رعنائیاں، پھولوں کی خوشبو، قوس و قزح کے رنگ،
پرندوں کی چہچہاہٹ، سریلی آوازیں، دریاؤں اور
سمندروں کے پانی کی روانی، سائنس اور ٹیکنالوجی
کی نت نئی ایجادات، جس میں حضرت انسان کا چاند
پر قدم بھی ہے۔ یہ سب زندگی کی علامات اور قبرستان
موت کی بے جان نشانیاں ہیں۔ حادثات سے
زندگی نہیں رکتی اور نہ ہی موت زندگی کو روک سکی
ہے۔ موت اپنے تمام تر خدمات، سختیوں، پریشانیوں،
غموں اور خوف و ہراس کے باوجود زندگی کو فتح نہیں
کر سکی۔ موت شکست خوردہ ہے، شکست کو اہمیت نہ
دو۔ آج بھی موت کی آغوش میں منہ چھپائے لوگ
قبروں میں دفن پڑے ہیں۔ ان پیاروں، دل کے
جگر گوشوں کے لیے وقتی طور پر آہ و بکا اور ماتم داری
محض رکی ہوتی ہے کیونکہ زندگی اپنی پوری آب و
تاب سے اس جہاں کو رواں دواں رکھے نظر آتی
ہے۔ موت بیماری، ششدر اور حیران نگاہوں سے
زندگی کی بہاروں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتی
ہے۔ اس لیے کہ زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔
(جعفر بخاری)

پراسیسنگ نہ ہونے کی وجہ سے نقصان دہ ہوتی ہے۔
ہمارے یہاں انگریزی ادویات بھی بالعموم قانون
کے مطابق نہیں بنائی جاتیں لیکن ان کے متعلق کوئی
قانون کم از کم موجود تو ہے۔ روایتی طریقہ علاج کا کوئی
قانون تو سرے سے نافذ ہی نہیں لیکن اس پر میری
طرح آپ کو بھی نیرت نہیں ہونی چاہیے کیونکہ ہم بھیڑ،
بکریوں کا ریوڑ ہیں جو ان اشاروں اور آوازوں سے
ہانگے جانے کا عادی ہو چکا ہے جن کا کوئی مطلب نہیں
ہوتا۔ ہماری قومی غیرت جن چیزوں سے مجروح ہوتی
ہے ان میں اور تو اور دینا ملک اور میرا جیسی اداکاروں کی
وہ اداکاری بھی شاں ہے جو بھارت میں کی گئی ہو لیکن
ادویات سازی میں پائی جانے والی لاقانونیت شامل
نہیں کیونکہ ہم ایک ایسی ”سپر پاور“ ہیں جو بین الاقوامی
مسائل میں اتنی اگلی ہوئی ہے کہ اس کے پاس کوئی
دوسرا کام کرنے کی فرصت ہی نہیں۔

(اسرار ایوب کالم، خبریں ڈاٹ کام سے اقتباس)

غزل

دور رہ کر قریب کتنے تھے
فاصلے بھی عجیب کتنے تھے
درد دل کی دوا نہیں ورنہ
اس جہاں میں طبیب کتنے تھے
عمر بھر جو ساتھ رہا تیرے
اس کے اچھے نصیب کتنے تھے
کیوں نہ آیا میں سپنوں میں تیرے
مرے شکوے عجیب کتنے تھے
(فیس بک ڈاٹ کام سے)

زندگی نیچے کہیں منہ دیکھتی ہی رہ گئی
کتنا اونچا لے گیا جینے کا معیار آدمی
عمر ساری صحرا نوردی کی مگر شادی نہ کی
قیس دیوانہ بھی تھا کتنا سمجھ دار آدمی



کچی ملکیا

وسیلہ خاتون

جیک رچی، منفرد اور تیکھی کہانیاں لکھنے میں عالمی شہرت رکھتے ہیں
22 منٹوں کی ایک دہشت پسند کہانی

میرا اشارہ پاتے ہی راہداری کی طرف لپکا جس کے آخری سرے پر ٹیلیفون کا سوئچ بورڈ لگا ہوتا تھا۔ ”معاف کیجئے گا جناب!“ میں نے ریسپور میں کہا ”لائن کچھ خراب محسوس ہوتی ہے۔ مجھے آپ کی آواز صاف سنائی نہیں دے رہی ہے۔ کیا آپ ذرا اونچی آواز میں نہیں بول سکتیں؟“

ٹیلی فون کی ٹھنٹی بجی، میں نے ریسپور اٹھایا۔ دوسری طرف سے آنے والی آواز کسی نوجوان لڑکی تھی۔ ”سنو کتے سنو!“ نامعلوم لڑکی نے کہا ”ٹھیک بائیس منٹ بعد بسن ہال میں بم کا دھماکا ہوگا۔“ میں نے جلدی سے سارجنٹ موریسن کو اشارہ کیا۔ وہ

پچھلے دو مہینوں میں ہمیں بم پھینکنے کی سات دھمکیاں موصول ہوئی تھیں جن میں سے پانچ تو صرف دھمکیاں ثابت ہوئی تھیں۔ باقی دو دھمکیاں دودھماکے ثابت ہوئے۔ پہلا دھماکہ انتظامی شعبے کی عمارت میں ہوا تھا جس میں برائے نام نقصان ہوا تھا یعنی چند کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے تھے لیکن دوسرا دھماکہ بڑا نقصان دہ ثابت ہوتا تھا۔ دھماکہ سائنسی تجربہ گاہ میں ہوا تھا اور اس کے نقصانات کا تخمینہ ایک لاکھ ڈالر سے زیادہ لگایا گیا تھا۔ اس دھماکے کے بعد ہی ہم نے آنے والے فون ٹیپ کرنے کا انتظام کر لیا تھا۔ بس ہمیں سوئچ بورڈ پر بیٹھیں ٹیلی فون آپریٹر کو اشارہ کرنا ہوتا تھا۔ وہ ہمیں نصف منٹ میں یہ بتا دیتی تھی کہ وہ ٹیلی فون کس نمبر اور کس جگہ سے کیا جا رہا ہے؟ سارجنٹ مورسین واپس آیا تو میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”ٹیلیفون ہیزل ہال کے ٹیلی فون بوتھ سے کیا گیا ہے۔“ سارجنٹ نے اطلاع دی۔

میں اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس گیا اور جھانک کر باہر دیکھنے لگا، سڑک کے اُس پار سامنے والی عمارت کے دائیں جانب ہیزل ہال کی آٹھ منزل عمارت کھڑی تھی۔ یہ لڑکیوں کا ہوشل تھا اور اس میں اس وقت تقریباً سات سو لڑکیاں رہ رہی تھیں۔ اس سے آگے مزید دو عمارتوں کے بعد ایک چوراہا واقع ہے یہیں کوئے میں کھڑی ہوئی پانچ منزلہ عمارت ولسن ہال کہلاتی تھی۔ اس دن اتوار تھا اور رات کے کھانے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ اس لیے مجھے یقین تھا کہ اس وقت عمارت میں سینکڑوں طلبہ اور درجنوں اساتذہ کے بجائے بمشکل درجن بھر طالب علم موجود ہوں گے جو سر جھکائے اپنے کمروں میں مطالعہ کر رہے ہوں گے۔ سارجنٹ نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا ”صرف اٹھارہ منٹ“ اس نے تلملاتے ہوئے بے بسی سے کہا ”بھلا صرف اٹھارہ منٹ میں پانچ منزلہ عمارت

لڑکی دوبارہ اتنی زور سے چیخ کر بولی کہ اس کی آواز کانوں کے پردے پھاڑنے لگی ”سنو کتے! یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ اب سے ٹھیک بائیس منٹ بعد ولسن ہال بم کے ایک زبردست دھماکے کے ساتھ زمیں بوس ہو جائے گا۔“

لڑکی کی باتوں میں الجھائے رکھنا میرا مقصد تھا۔ ”رہنے بھی دیکھئے محترمہ!“ میں نے کہا ”آج کل کی لڑکیاں مذاق بھی کرتی ہیں تو وہی گھسا پٹا برسوں پرانا۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے ہاں کوئی پارٹی ہو رہی ہے اور کسی نے ازراہ مذاق آپ سے پولیس کو تنگ کرنے کی فرمائش کی ہے۔“

”کیا تمام پولیس والے گدھے ہوتے ہیں؟“ لڑکی کی آواز سے سخت الجھن جھلک رہی تھی ”کان کھول کر سن لو احمق کتے کہ اس مرتبہ ہونے والا دھماکا پچھلے تمام دھماکوں سے زیادہ تباہ کن ہوگا اور اطلاعاً عرض ہے کہ اب تمہارے پاس ولسن ہال خالی کرنے کے لیے صرف بیس منٹ رہ گئے ہیں۔“

اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہتا، نامعلوم لڑکی نے ٹیلی فون بند کر دیا۔ میں نے نظریں اٹھا کر کھلاک کی طرف دیکھا شام کے چھ بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ اگر لڑکی کی تنبیہ درست تھی تو ٹھیک ساڑھے چھ بجے ولسن ہال کی عمارت ایک زبردست دھماکے کے ساتھ از جانی چاہیے تھی۔ میرا تعلق یونیورسٹی کمپس کے پولیس تھانے سے ہے۔ یونیورسٹی کمپس کی آبادی چودہ ہزار نفوس سے زائد پر مشتمل تھی۔ ہوشیوں میں رہنے والے طلبہ، تدریسی عملہ اس کا علمدان اور یونیورسٹی کا انتظامی عملہ اور ان کا خاندان اس آبادی میں شامل تھے۔ چودہ ہزار کی آبادی کم نہیں ہوتی۔ یہ اتنی آبادی ضرور تھی کہ یونیورسٹی کمپس کو ایک چھوٹا سا شہر کہا جاسکتا تھا۔ ایک بڑے شہر میں ایک محلہ پر سکون جھوٹا سا شہر لیکن پچھلے دو مہینوں سے اس شہر کا سکون تہہ وبالا ہو گیا تھا۔

نشین رکھو تم کسی چیز کو ہاتھ مت لگانا، سمجھ گئے تم کسی چیز کو چھو نا مت۔“

”لیکن میں نے وہ بم ناکارہ بتادیا ہے“ نگران نے کہا۔ ”تم نے کیا کر دیا ہے؟“ مجھے ایک بار پھر اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

”میں نے وہ بم وہ آتش گیر مادہ ناکارہ بتادیا ہے یعنی اس کا خود کار میکا کی نظام، تاریخہ کر کے بے کار کر دیا ہے اب جب تک اسے ماچس کی تیلی نہیں دکھائی جائے گی، آتش گیر مادہ بے ضرر رہے گا۔“

میں نے ڈرتے ڈرتے ایک سانس لیا ”تم آخر ہو کون؟“

”وسن ہال کانگران جناب! میں کوریا کی جنگ میں سارجنٹ رہ چکا ہوں۔ وہاں میں بہت سے دستی اور ٹائم بم ناکارہ بنا تا رہا ہوں۔“

میں چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا ”آخر تمہیں اس آتش گیر مادے کی موجودگی کا علم کس طرح ہوا؟“

”آج کھانا کھانے کے دوران میں مجھے اچانک یہ خیال آیا کہ کل صبح لائڈری سے کچھ فالتو چادریں تو لیے وغیرہ دھل کر آئیں گے تو انہیں رکھا کہاں جائے گا؟ پھر اچانک مجھے اس الماری کا خیال آیا جو ایک ریلداری کے آخری سرے پر بنی ہوئی ہے۔ کبھی استعمال میں نہیں آتی۔ میں وہاں یہ دیکھنے پہنچا کہ اس الماری میں کچھ رکھا تو نہیں ہے اور الماری کو کھولتے ہی مجھے یہ بم نظر آیا۔“

”اور اب تم کہاں سے فون کر رہے ہو؟“

”پروفیسر ایرکسن کے دفتر سے جو اس الماری کے نزدیک ہی واقع ہے“ جواب ملا۔

”ٹھیک ہے“ میں نے کہا ”تم فون بند کر کے واپس جاؤ اور اس الماری کی حفاظت کرو، کسی کو اس کے قریب نہ آنے دینا۔ میں چند آدمی تمہارے پاس بھیج رہا ہوں۔“

جب میں ریسپور کریڈل پر رکھ کر ہٹا تو سارجنٹ مورین کمرے میں داخل ہو رہا تھا میں نے اسے فون پر ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا تو اس نے اطمینان کا

کی تلاشی کس طرح لی جاسکتی ہے اور وہ بھی ایک ٹائم بم کی تلاشی جو کہیں بھی چھپایا جاسکتا ہے۔ اب ہمارے سامنے ایک ہی صورت رہ گئی ہے کہ عمارت فوراً خالی کر لی جائے تاکہ بم پھٹنے سے کوئی جانی نقصان نہ ہو۔“

میں نے نائید میں سر ہلا کر اس سے اتفاق کیا۔ اتوار کے دن ہمارے پاس صرف ایک پٹرولنگ گاڑی ہوتی ہے اور اس پر دو آدمیوں کی ڈیوٹی رہتی ہے۔ میں نے سارجنٹ سے کہا کہ وہ ریڈیو کے ذریعے اس گاڑی سے رابطہ قائم کرے اور انہیں فوراً وسن ہال پہنچنے کی ہدایت کر دے۔ سارجنٹ نے فوراً ریڈیو روم کی طرف بھاگا۔ میں نے اپنا ہیٹ سر پر رکھا اور کمرے سے باہر نکلنے والا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے اس نازک موقع پر ٹیلی فون کرنے والے کو آہستہ سے برا بھلا کہا اور لپک کر ریسپور اٹھالیا۔ بولنے والے نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔

”جناب! میرا نام پرلینٹن ہے“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

میں اس سے یہ کہنے والا تھا کہ بھائی آدھے گھنٹے بعد دوبارہ فون کر لو کیونکہ اس وقت میں ہنگامی حالت میں ہنسا ہوا ہوں اور تھانے میں عملہ بہت کم ہے لیکن اس کے اگلے جملے نے میرا کھلا ہوا منہ بند کر دیا ”جناب! میں وسن ہال سے بول رہا ہوں۔ میں یہاں کانگراں ہوں مجھے ابھی ابھی ایک بم ملا ہے“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”کیا کہا؟“ میں نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا ”کیا ملا ہے؟“ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

”ایک بم جناب“ نگران نے اپنی بات دہرائی ”یہ بم الماری میں رکھا تھا۔ پلاسٹک کے تھیلوں میں بہت سا آتش گیر مادہ اور پوری الماری ان تھیلوں سے بھری ہوئی تھی۔“

”اُف میرے خدا“ میں نے ریسپور مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ”سنو تم جو کوئی بھی ہو میری ایک بات ذہن

کے سامنے رکھ دیا۔ وہاں سے کہا گیا ”ٹھیک ہے ہم یہاں سے چند ماہرین بھیج رہے ہیں لیکن انہیں کیسپس پہنچنے میں کافی دیر لگ جائے گی۔ اتوار کی وجہ سے بیشتر عملہ چھٹی پر ہے۔ تمہیں اس کے علاوہ اور کسی قسم کی مدد تو نہیں چاہیے؟“

کیسپس میں ہم نے یہ اصول بنا رکھا تھا کہ جب تک باہر کی مدد ناگزیر نہ ہو مدد طلب نہیں کی جائے۔ ”نہیں“ میں نے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے کہ ہم یہاں حالات قابو میں رکھ سکتے ہیں۔“

جیسے ہی میں نے ریسپور کریڈل پر رکھا۔ فوراً ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس مرتبہ بولنے والا برٹن تھا جو ولسن ہال پہنچ چکا تھا اور وہیں سے ٹیلی فون کر رہا تھا ”میں نے ابھی بھی بم کا معائنہ کیا ہے“ برٹن نے کہا ”آتش گیر مادے کی مقدار اتنی زیادہ ہے کہ اگر وہ پھٹ جائے تو پوری عمارت فضا میں اچھال سکتی ہے۔“

”کیا اب بھی ایسا کوئی امکان ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”نہیں..... مگر ان نے اسے ناکارہ بنا دیا ہے۔ اب فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔“

”پھر بھی احتیاط عمارت خالی کر لو، خواجواہ خطرہ مول لینے سے کوئی فائدہ نہیں۔“

”عمارت میں کوئی موجود بھی تو ہو“ برٹن نے کہا ”بظاہر یہاں میرے اور مگر ان کے سوا اور کوئی نظر نہیں آتا۔“

میں نے فون بند کر کے ہیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں اور سارجنٹ کمرے سے نکلنے ہی والے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی زور سے چینی۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا اور پھر ٹیلی فون کے پاس پہنچا۔

وہی لڑکی بول رہی تھی جس کے پہلے فون کے بعد یہ ہنگامہ شروع ہوا تھا۔ وہ غصے میں بھری ہوئی تھی ”تم لوگ اب تک کیا کر رہے ہو؟ ولسن ہال خالی کیوں نہیں کراتے؟ اب صرف بارہ منٹ رہ گئے ہیں۔“

میری نظریں خود بخود کھڑکی کی طرف اٹھ گئیں۔ میں نے ایک نظر ولسن ہال پر ڈالی۔ باہر سے ایسا معلوم ہوتا

گہرا سانس لیا ”ہیزل ہال گھیرے میں کیوں نہ لے لیا جائے؟“ سارجنٹ نے تجویز پیش کی ”اس لڑکی نے وہیں سے ٹیلی فون کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ لڑکی یا تو مجرموں کی سافٹی ہے یا پھر ان سے اچھی طرح واقف ہے ورنہ اسے اس بم کی موجودگی کا علم کس طرح ہوا؟ اگر یہ لڑکی کسی طرح ہمارے ہاتھ لگ جائے تو اس دہشت پسند گروہ کے باقی ارکان بھی پکڑے جاسکتے ہیں۔ ان کم بختوں نے ہماری نیند حرام کر رکھی ہیں اور یونیورسٹی کا پرسکون ماحول تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے“ میں نے کہا ”لیکن یہ کیوں بھولتے ہو کہ آج اتوار ہے اور تمہانے کا بیشتر عملہ چھٹی پر ہے ظاہر ہے سات سو لڑکیوں پر قابو پانا اور ان سے سوالات کرنا چند آدمیوں کے بس کا روگ نہیں ہے اور اگر ہم شہر سے مدد طلب کرتے ہیں تو مدد آنے میں بہت دیر ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ ایک خیال یہ بھی ہے کہ جس لڑکی نے ہمیں ہیزل ہال سے ٹیلی فون کیا تھا، وہ اس عمارت میں نہیں رہتی ہوگی اور معلوم نہیں کہ وہ اتنے بڑے کیسپس کی کس عمارت میں مقیم ہوگی، کوئی شخص بھی ہیزل ہال کی عمارت میں داخل ہو کر ٹیلی فون بوتھ سے ہمیں فون کر سکتا ہے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ لڑکی یونیورسٹی کی طالبہ ہی ہو، ہو سکتا ہے کہ وہ شہر سے آئی ہو۔ خیر تم نے وائر لیس سے برٹن کو ولسن ہال پہنچنے کی ہدایت کر دی ہے؟“

”ہاں اس وقت ان کی گاڑی ولسن ہال سے آدھے فرلانگ کی دوری پر تھی اور اب تک وہ دونوں پہنچ چکے ہوں گے۔ برٹن آتش گیر مادوں کے بارے میں کافی سمجھ بوجھ رکھتا ہے۔ بم وہ سنبھال لے گا۔ اصل مسئلہ بم کی تلاش کا تھا، وہ حل ہو چکا ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ مگر ان بھی آتش گیر مادے کے بارے میں کافی تجربہ رکھتا ہے۔ خیر میں پہلے اس معاملے کی اطلاع مرکزی دفتر کو دے دوں.....“

میں نے مرکزی دفتر فون کر کے پورا معاملہ ان

آفتاب قرشی

AQUA SLIM

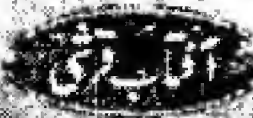
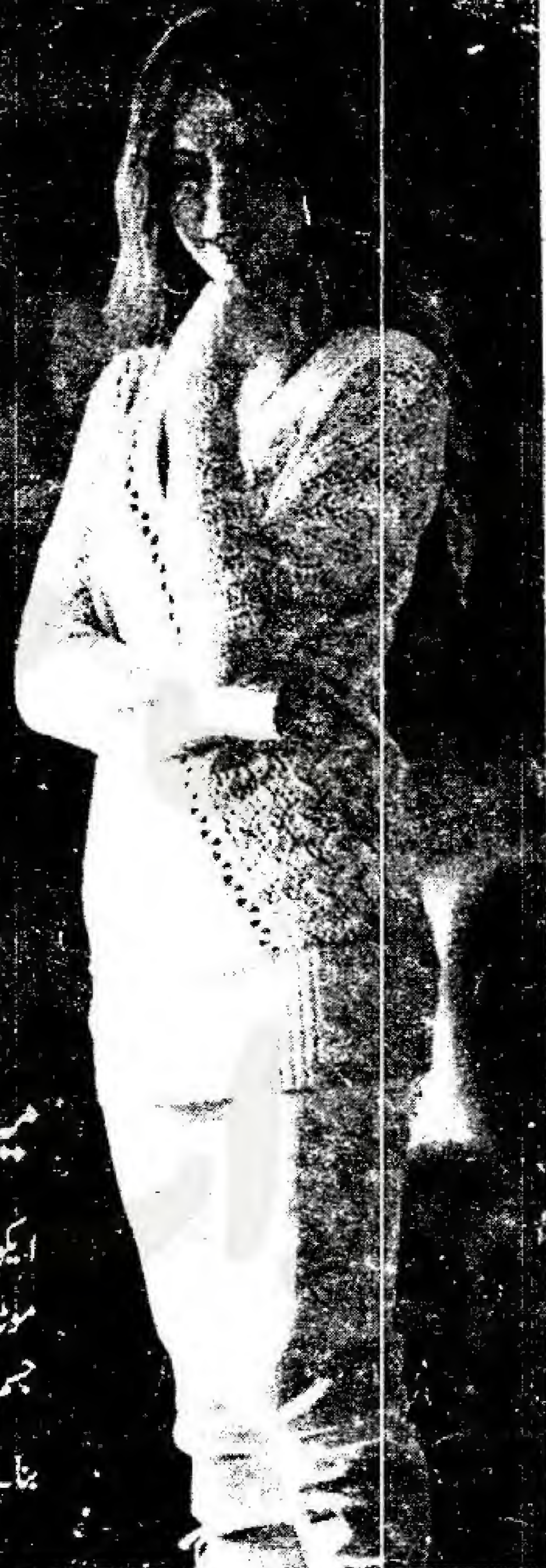
ANTI FAT HERBAL WATER

NO SIDE EFFECTS



میری فٹنس میرا راز

ایکوا سلیم، قدرتی جڑی بوٹیوں سے بنا
موٹاپے کا سب سے بڑا دشمن
جسم کی اضافی جڑی کو ختم کرنے اور
بنائے آپ کو سلیم، سمارٹ اور ایکٹیو



Aftab Carshi Dawakhana

Industrial Town, 20-Km, Multan Road, Chungi, Lahore. Ph: 492-42-375/11532-3

”پتہ نہیں، لیکن میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔“
سارجنٹ میرے قریب آگیا ”یہ پہلا موقع ہے
کہ کسی لڑکی نے ہمیں بم کی موجودگی سے مطلع کیا
ہے۔ اس سے پہلے کی تمام آوازیں مردانہ تھیں۔“
اس نے میری توجہ اس نکتے کی طرف مبذول کرائی۔
”مجھے احساس ہے اور میں خود بھی اسی پہلو پر غور
کر رہا ہوں“ میں نے جواب دیا اور کلائی کی گھڑی
میں وقت دیکھا چھ بج کر بیس منٹ ہو رہے تھے۔

”وہ لڑکی تنہا تو یہ بم نہیں بنا سکتی تھی۔“
”ہاں۔ اس کے ساتھ دو چار لڑکے ضرور شامل
ہوں گے“ میں نے کہا۔

”مجھے ابھی تک تو ولسن ہال سے کوئی شخص باہر نکلتا
دکھائی نہیں دیا۔“ صرف دس منٹ باقی ہے۔ آخر یہ
برٹن کیا کر رہا ہے؟“

”میرا خیال ہے عمارت میں چند طالب علم موجود
ہوں گے، جنہیں برٹن نے عقبی دروازے سے باہر
نکال دیا ہوگا۔“

”آخر کس قسم کے لوگ ایسی حرکتیں کرتے ہیں؟“
سارجنٹ نے فلسفیانہ انداز میں کہا ”آخر یہ کیسے
طالب علم ہوتے ہیں؟ انہیں پاگلوں کی کس قسم میں
شمار کیا جائے؟“

”اس قسم کے طالب علم عموماً کم گوا اور شرمیلے ہوتے
ہیں۔ اتنے کم ہمت کہ گاڑی چلاتے وقت ٹریفک
کے کسی معمولی قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے
بھی ڈرتے ہیں۔“ میں نے کہا ”ایسے لڑکے کھاتے
میتے گھرانوں سے آتے ہیں اور چونکہ انہیں منہاش کی
فکر نہیں ہوتی اس لیے اپنے ذہنوں میں زندگی کے
عجیب عجیب مقصد بنا لیتے ہیں اور اس مقصد کے لیے
بڑی لگن اور استقلال سے اس قسم کی حرکتیں کرتے
رہتے ہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ اس قسم کی حرکتیں
انہیں اپنے مقصد حیات سے قریب تر کر دیتی ہیں۔“
”لیکن وہ اس خطرے سے قبل از وقت مطلع کر

تھا کہ جیسے ولسن ہال میں کچھ بھی نہ ہو رہا ہو۔ برٹن نے
یقیناً اپنی گاڑی عمارت کے عقب میں کھڑکی کی ہوگی
اور وہ عقبی دروازے سے اندر داخل ہوا ہوگا۔ ورنہ اس کی
گاڑی یہاں سے ضرور نظر آتی اور یہ لڑکی مجھ سے یہ
سوال ہرگز نہ کرتی ”سنو ماریا!“ میں نے ناراضی سے
کہا ”تم مجھے تنگ مت کرو مجھے بہت سے ضروری کام
کرنے ہیں اس وقت میں بہت مصروف ہوں۔“

”میں تمہاری ماریاں ہیں ہوں“ لڑکی نے چلاتے
ہوئے کہا۔ ”میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ بارہ منٹ بعد
ولسن ہال کی عمارت بم کے دھماکے سے اڑ جائے گی۔“

”واہ وا! کیا کہنے ہیں کیا میں اپنی شریر بیٹیجی کی
آواز بھی نہیں پہچان سکتا؟“ میں نے کہا ”بس ماریا
اب فون بند کر دو۔ میں بہت مصروف ہوں۔“

غصے کی شدت سے لڑکی کی آواز کانپنے لگی ”سنو کتے!
میں تمام پولیس والوں سے نفرت کرتی ہوں۔ ان کی
کھوپڑیوں میں بیجے کی جگہ گوبر بھرا ہوتا ہے۔ میں کس

طرح تمہاری کھوپڑی میں یہ بات بٹھاؤں کہ میں
تمہاری بیٹیجی نہیں ہوں اور مذاق نہیں کر رہی۔ بارہ منٹ
بعد جب ولسن ہال تباہ ہو جائے گا تمہاری ہی عقل

درست ہوگی۔“ ٹیلی فون کا رابطہ منقطع کر دیا گیا۔
”مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمہاری کوئی بیٹیجی بھی ہے“
سارجنٹ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میری کوئی بیٹیجی نہیں ہے“ میں نے کہا اور کھڑکی
کے پاس جا کر ہیزل ہال کی عمارت دیکھنے لگا۔ میں سوچ
رہا تھا کہ کیا اس لڑکی نے یہ فون بھی ہیزل ہال ہی سے

کیا تھا اور کیا وہ ابھی تک اس عمارت میں موجود ہے
اور دھماکے کا انتظار کر رہی ہے؟ یا وہ کسی دوسری عمارت
میں چلی گئی ہے اور ولسن ہال کے داخلی دروازے پر

نظریں جمائے؟ پولیس کی آمد کی منتظر ہے؟
”چلیں؟“ سارجنٹ نے دروازے کی طرف
دیکھتے ہوئے کہا ”نہیں“ میں نے جواب دیا۔ ”ہم

یہیں انتظار کریں گے“ ”کس کا؟“

دوسری طرف چند لمحوں تک مکمل سکوت طاری رہا
 ”کیا اس وقت ولسن ہال میں سیمینار جاری ہے؟“
 ”ہاں اور اس میں تقریباً دو سو طلبہ شریک ہیں۔“
 ”دو سو طالب علم؟“ دوسری طرف پھر سکوت
 طاری ہو گیا۔ ”ہاں ماریا! پروفیسر ایرکس کے سیمینار
 طالب علموں میں بہت مقبول ہیں۔ اچھا اب فون بند
 کر دو میں بہت مصروف ہوں، سمجھ گئیں۔ اگر تم نے
 اب مجھے پریشان کیا تو میں تمہارے ڈیڈی سے
 شکایت کر دوں گا۔“

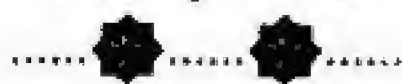
”سنو!“ لڑکی زور سے چیخی۔ ”میں تمہیں بتاتی
 ہوں کہ وہ بم کہاں چھپایا گیا ہے اور اسے کس طرح
 ناکارہ کیا جاسکتا ہے؟“

میں نے خاموشی سے ریسیور کریڈل پر رکھ کر
 سلسلہ منقطع کر دیا۔ دس سیکنڈ بعد فون کی گھنٹی زور
 سے چیخی۔ میں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔
 سارجنٹ غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ فون کی گھنٹی مسلسل
 بج رہی تھی۔ وہ غیر یقینی انداز میں ریسیور اٹھانے
 کے لیے ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

”مضمرب جاؤ مہرین!“ میں نے خشک لہجے میں کہہ کر ٹیلی
 فون کی گھنٹی مسلسل دو منٹ تک بجتی رہنے کے بعد بند ہو گئی۔
 اور کمرے پر اچانک قبرستان جیسی خاموشی طاری ہو گئی۔

دس سیکنڈ گزرے پھر بیس سیکنڈ پھر تیس سیکنڈ اور
 اچانک ایک لڑکی ولسن ہال کے مقابل کی ایک
 عمارت سے نکلی۔ وہ بے تحاشا ولسن ہال کی طرف
 بھاگ رہی تھی جیسے بم پھٹنے سے پیشتر عمارت میں
 جا کر اسے ناکارہ بنا دینا چاہتی ہو۔ بم اس کے خیال
 میں صرف چھ منٹ بعد پھٹنے والا تھا۔

میں نے ایک گہرا اور پراطمینان سانس لیا ”اب
 چلو مورین“ میں نے سارجنٹ سے کہا ”لیکن
 جھکڑیاں لینا نہ بھولنا۔ میں لڑکیوں کے لیے لمبے
 ناخنوں سے ہمیشہ ہی ڈرتا رہا ہوں۔“



دیتے ہیں۔“ سارجنٹ نے کہا ”اس سے یہ بھی ظاہر
 ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقاصد کی خاطر انسانوں کی
 ہلاکت پسند نہیں کرتے۔ ابھی ان کی نظروں میں
 انسانی جان کی قدر و قیمت باقی ہے۔“

”یابیوں کہہ لو کہ اس میں ان کی خوش قسمتی کو زیادہ
 دخل ہے کہ ان کی حرکتوں کے نتیجے میں اب تک
 ایک بھی انسانی جان تلف نہیں ہوئی لیکن جب کوئی
 مسلسل ایسے خطرناک ہتھیاروں کے کھیلتا ہے تو
 انسانی جان تلف ہونا لازمی ہے اور جب ایسا ہوگا تو
 انہیں حیرت زدہ ہونے کا حق حاصل نہیں رہے گا بلکہ
 انہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔“

ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔
 دوسری طرف وی نامعلوم لڑکی تھی ”تم لوگ کچھ
 کرتے کیوں نہیں؟ آٹھ منٹ بعد ولسن ہال تباہ
 ہو جائے گا۔ تم گدھوں کی عقل میں اتنی سی بات
 کیوں نہیں آتی کہ عمارت فوراً خالی کرائی جائے؟“
 میں نے جواب دینے سے پیشتر ولسن ہال کی
 طرف دیکھا۔ ”میں تمہارا کھیل سمجھ رہا ہوں ماریا!“
 میں نے پرسکون آواز میں کہا۔

”جہنم میں جائے تمہاری ماریا“ لڑکی نے پوری
 قوت سے چیختے ہوئے کہا ”میں ماریا نہیں ہوں۔“

”میں سب سمجھ رہا ہوں ماریا!“ میں نے پرسکون
 لہجے میں کہا۔ ”میں خوب جانتا ہوں کہ تم پروفیسر
 ایرکس کا سیمینار ناکام بنانا چاہتی ہو۔“

”کیا بکواس اگا رکھی ہے؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں
 آرہا کہ تم کیا بک رہے ہو؟“

”سنو ماریا!“ میں نے کہا ”تمہارے ڈیڈی نے مجھے
 سب کچھ پہلے ہی بتا دیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ کلاس میں
 تمہارے نمبر اچھے نہیں تھے اس لیے تمہیں پروفیسر کے
 سیمینار میں شامل ہونے سے روک دیا گیا ہے اور اب تم
 بم کے حملے کی انولہ اڑا کے سیمینار ناکام بنانا چاہتی ہو۔
 تمہاری یہ انتقامی کوشش بے حد طفلانہ ہے ماریا!“



پراسرار کہانی



اُچھلتی گڑوی

غلام نبی عارف

دودھ والی خالی گڑوی اُچھل رہی تھی،
ایک پراسرار رات کا حیرت انگیز قصہ

اور ادھر سے ادھر مگریں مار رہی ہے۔ میرا ایک سانس اوپر ایک سانس نیچے۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ چند ہی لمحوں کے بعد آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئیں اور غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک کالی سیاہ بلی کا منہ دودھ والی خالی گڑوی میں پھنسا ہوا ہے جو کہ نکل نہیں رہا اور بلی جان کے عذاب سے تڑپ تڑپ کر گڑوی منہ میں پھنسائے مگریں لگا رہی ہے اور اُس کی جان پر مبنی ہوئی ہے۔ صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد چار پائی سے نیچے اترا۔ باہر کا دروازہ کھولا، بلی برابر مشکل میں تھی آخر کار اچانک بلی کا منہ گڑوی سے آزاد ہوا اور وہ فوراً باہر کی طرف نکل کر غائب ہو گئی اور میری بھی جان میں جان آئی۔ حقیقت کچھ اس طرح آشکار ہوئی کہ رات کو ہی بلی کمرے میں چھپ کر بیٹھ گئی تھی۔ اور گڑوی میں جو بچا کھچا دودھ رہ گیا تھا اُس کو چاٹنے کے لیے گڑوی میں منہ ڈال دیا اور منہ تو پھر منہ سے پھنس کر رہ گیا اور بلی بے تاب ہو گئی۔ اس لیے تو کہتے ہیں کہ یہ منہ اور مسور کی دال۔ اُس دن کے بعد وہ کالی سیاہ بلی کچھ عرصہ تک نظر نہ آئی اور میں بھی دودھ پینے کے بعد اُچھلتی گڑوی کو اُلٹا کر رکھ دیتا تھا تا کہ اس قسم کا دل ہلا دینے والا واقعہ دوبارہ نہ ہونے پائے، جس نے بھی سنا دنگ رہ گیا۔

یہ واقعہ بالکل سچا سنسنی خیز اور میرے بینک میں بھرتی ہونے کے دس سال بعد کا ہے جب میرے والدین میری شادی کی تیاریوں میں مصروف تھے اور میں تنہا اپنے نئے کمرے میں سویا کرتا تھا، سردیوں کے دن تھے اخبار بنی ڈائجسٹ وغیرہ پڑھنے اور قسم قسم کی کتابیں رکھنے کا شروع سے شوق رہا ہے۔ دیے تو سردیوں کی لمبی اور سرد رات میں مطالعہ کرنا اور صبح سویرے نماز کے لیے اُٹھ جانا بہت لطف دیتا ہے۔ والدہ صاحبہ ایک جست کی گڑوی (دودھ کا برتن) میں خالص دودھ رکھ جاتی تھیں اور میں عادت کے مطابق مطالعہ کے دوران دودھ پی کر گڑوی چار پائی کے ساتھ فرش پر رکھ دیتا تھا جو کہ ڈھکنے کے بغیر ہوتی ہے۔ ایک روز نیند زوروں پر تھی دودھ پی کر کوئی کتاب وغیرہ پڑھی۔ ہاتھ استعمال کیا، باہر ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی بادل گرج رہے تھے سردی بہت زیادہ تھی، دروازہ بند کر کے لمبی تان کر سو گیا۔ میں عادت کے مطابق اندھیرے میں سونے کا عادی ہوں۔ روشنی اور شور میں نیند بالکل نہیں آتی۔ نہیں معلوم کیا وقت تھا کیا سماں تھا ایک عجیب سے شور میں نیند سے بیدار ہو گیا۔ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا کالا سیاہ اندھیرا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا آنکھوں کو ہاتھوں سے ملا۔ خوب غور کیا یا الہی یہ ماجرا کیا ہے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہ دودھ والی خالی گڑوی کمرے کے فرش پر اُچھل رہی ہے





جاوید رانی

پراسرار انتقام

نوری بے چینی کی حالت میں اپنی چارپائی پر کروٹیں بدل رہی تھی میں نے محسوس کر لیا تھا کہ شے کہیں قریب ہی ہے۔ اباجی پھٹی کے باہر پڑے سو رہے تھے اور اماں کی چارپائی میرے دوسری جانب تھی۔ میں نے کروٹ لیتے اپنی ماں کا کندھا ہلایا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی.....

بہن بھائی کا قصہ، ایک ”بچے“ نے اُن کی زندگی بدل کر رکھ دی تھی

کے بھی ریوڑ بنائے ہیں اور ساتھ میں چوری اور ڈکیتی کا بھی دھندہ شروع کر دیا ہے۔ پولیس مقابلے میں قتل و غارت گری بھی عام ہو کر رہ گئی ہے۔ خدا کا شکر ہے میرے گھر میں کوئی بھی ایسا کام نہیں جس سے شرمندگی اٹھانی پڑے۔ والد صاحب

میرا نام محمد بشیر ہے اور میں ذات کا اوڈھوں۔ ہمارا روز اول سے خاندانی روزگار بھیڑیں پالنا اور محنت مزدوری کرتا ہے۔ ہماری عورتیں بھی ہمارے ساتھ مل کر زیر تعمیر عمارتوں میں کام کرتی آرہی ہیں۔ مگر نئی نسل نے بھیڑوں کے ساتھ ساتھ گائے



نوری

دونوں بہن بھائی مال کو چرنے کیلئے چھوڑ کر برگد کے بڑے درخت کی چھاؤں میں آ بیٹھے۔

”بشیر، اماں تیری شادی۔۔۔۔۔“ میں نے بات کاٹتے اپنی بہن کا فخرہ پکڑ لیا ”ہم دونوں کی شادی۔“

”ہاں ہاں اماں حاجی ابراہیم کی گھر والی سے اسی کی بات کر رہی تھی، اماں کو فکر تو ہے نا“ نوری نے مجھے جواباً پھر بتایا۔

میں نے اٹھتے ہوئے مال کا رخ جو آگے کی طرف جارہا تھا واپس موڑنے کیلئے آواز لگائی۔ ساتھ ہی بوزو اٹھ کر بھیڑوں کی طرف بھاگا جو قبروں کے اوپر ادھر ادھر منہ مار رہی تھیں۔ ایک دو بار قبروں کے متولی سے ہمارا اس بات پر جھگڑا بھی ہو چکا تھا۔ بھیڑوں کو دوبارہ قبرستان کے کونے کی طرف موڑتے میں نوری کے پاس آن بیٹھا جو ہاتھ میں پکڑی ٹہنی سے زمین پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھی۔

نوری مجھ سے دو سال بڑی تھی مگر ہم دونوں میں بڑی ہمتی تھی۔ جب وہ اماں کے ساتھ شہر سودا سلف لینے جاتی تو میرے لئے جو بھی کپڑے خریدتی وہ اسی کی پسند کے ہوتے۔ میں اپنی بہن کی لائی ہوئی ہر چیز کو پسند کر لیتا تھا چاہے مجھے اچھی لگے یا نہ مگر اس کے سامنے میں تعریف ضرور کر دیتا۔

مال چرتے ہوئے جب بیٹھنے لگ جاتا تو ہمیں پتہ چلتا کہ اب ہمیں گھنٹہ بھر آرام کا موقع مل گیا ہے۔ نوری بہن ساتھ لائی ہوئی روٹی کھولتے مجھے پانی لانے کا کہتی اور میں قبرستان کے ہینڈ پمپ سے جو متولی کی کوٹھڑی کے قریب لگا تھا سے پانی لانے اٹھ جاتا۔

جب سے ہم سکھ پور گاؤں میں آ کر آباد ہوئے تھے اپنا مال زیادہ تر اس پرانے قبرستان میں ہی لایا کرتے تھے جبکہ ہماری کھیتی کے دوسرے لوگ اپنا اپنا مال شہر کی طرف لے کر جاتے تھے۔ ان کے مال میں ڈنگر ڈھور بھی تھے مگر ہمارے پاس اپنے گزارے کی صرف

سعودی عرب میں بطور کاریگر گئے اور کچھ ماہ بعد مجھ سے بڑے دواؤں بھائیوں کو بھی اسی کمپنی میں لیبر کے ویزہ پر بلوا لیا۔ پیچھے چھوٹا ہونے کے ناطہ میں گھر میں رہ گیا، مال ڈھور کو سنبھالنا میری ذمہ داری تھی۔ سب سے بڑی بہن کی شادی ہو گئی تھی۔ ایک مجھ سے بڑی بہن اور میں اپنی بھیڑوں کو دن بھر چراتے پھرتے۔ والدہ پیچھے رہ جاتی اس کے ذمہ گھر داری تھی۔

باہر سے والد روپیہ پیسہ بھجواتا تو والدہ بینک میں ڈال دیتی۔ جب بھیڑوں کے چھترے ذرا بڑے ہو جاتے تو میں بکر منڈی میں جا کر بیچ دیتا، ہم اوڈ برادری ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھتے کبھی اس گاؤں تو کبھی اس شہر۔ ہمارے مکان نہیں ہوتے ہم عارضی چھپر ڈال کر اس میں ہی رہتے آ رہے ہیں۔ مال کیلئے بڑے بڑے بازارے اور ان کی رکھوالی کیلئے خونخوار کتے پالنا بھی ہماری ریت میں شامل ہے۔ ہمارے کتے شیروں تک کا مقابلہ کرنے میں مشہور ہیں۔

نوری اور میں بھیڑوں کا ریوڑ لے کر پرانے قبرستان کی طرف جا رہے تھے میری بہن نوری نے مجھے آواز دی

”تو زود دکھائی نہیں دے رہا۔“

تو زود ہمارے کتے کا نام تھا۔ بوزو صرف بول نہیں سکتا تھا مگر ہر بات سمجھ کر باقاعدہ اس پر عمل بھی کرتا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا مگر بوزو دکھائی نہیں دیا تو مجھے بھی پریشانی لاحق ہو گئی کہ وہ ہمارے آگے پیچھے ہی مال کے ساتھ ہوتا تھا۔ جب ہم گھر سے مال لے کر چلے تھے اس وقت تو ساتھ تھا مگر اچانک کہاں غائب ہو گیا۔

قبرستان قریب آ گیا تو بوزو مخالف سمت سے ہماری طرف آتا دکھائی دیا۔

”یہ بھی اب آوارہ گردی کرنے لگا ہے“ نوری نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔

جواباً میں اپنی بہن کی بات پر زور سے ہنس پڑا۔ ہم

دن ڈھلنے سے پیشتر ہم دونوں بہن بھائی مال ہانکتے اپنی پکھیوں کی طرف چل پڑے تھے گاؤں سے باہر خالی زمین پر ہمارا قبیلہ کئی سالوں سے رہتا آ رہا تھا اور رہائشی اوڑ جانے جاتے تھے۔ اپنے مال کو باڑہ میں بند کر کے میں بھائی ظلیل کی پکھی کی طرف آ گیا نوری کھانا وغیرہ بنانے کیلئے اماں کا ہاتھ بٹانے لگی۔

روزمرہ کی طرح ہماری پکھی کی سب سہیلیاں کھانا کھانے کے بعد تھوڑی دور گپ شپ لگانے نکل جاتی تھیں۔ ہم مرد قبیلہ کے بیچ حاجی غفور کی پکھی کے سامنے اکٹھے ہو جاتے یوں رات گئے تک ادھر ادھر کی باتوں کا سلسلہ جاری رہتا۔

یکدم لڑکیوں کی گھبرائی ہوئی آوازیں سن کر ہم سب جو حاجی غفور کی پکھی کے آس پاس پڑی چار پائیوں پر بیٹھے تھے اٹھ کر ان کی طرف بھاگے۔ سامنے آئی لڑکیوں نے نوری کو اپنے بازوؤں میں اٹھایا ہوا تھا اور وہ بُری طرح پھل رہی تھی بار بار وہ سر گھما کر حلق سے بچوں جیسی آوازیں نکالتی اور ”مجھے چھوڑو میں نے جانا ہے مجھے چھوڑو میں نے جانا ہے“ کی تکرار کر رہی تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے لا کر اپنی پکھی کی چار پائی پر ڈال دیا۔ حاجی غفور اور دوسرے لوگ بھی میری پکھی پر جمع تھے نوری کی آنکھیں اُلٹی ہوئی تھیں اور وہ بدستور وہی فقرہ بولے جا رہی تھی کہ ”مجھے چھوڑو میں نے جانا ہے۔“

حاجی غفور کچھ پڑھنے میں معروف تھے وہ حافظ قرآن بھی تھے، پھر انہوں نے پانی کا گلاس جو انہوں نے میری اماں سے منگوایا تھا نوری پر اُلٹ دیا۔ پانچ سات منٹ بعد نوری جیسے ہوش میں آ گئی اور جلدی جلدی اپنا آپ درست کرنے لگ گئی۔ اماں گھبراتی ہوئی حاجی صاحب سے پوچھ رہی تھی کہ کیا ہوا میری بیٹی کو؟ تو انہوں نے آہستہ آواز میں بتایا کہ اسے

بھیریں ہی تھیں یا ان کے چھترے جو ہم عید قربان پر فروخت کرنے کیلئے پالتے تھے۔

میں جب پانی بھر کر نوری کے پاس لایا تو اس کے قریب سات آٹھ سالہ لڑکے کو بیٹھے پایا جو اس سے باتیں کر رہا تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا کہ شاید وہ قبرستان میں فائدہ پڑھنے والوں کے ساتھ ہو مگر دُور دور تک کوئی بھی نظر نہ آیا تو میں نے نوری کی طرف دیکھا۔ میری آنکھوں میں اس بچے کے بارے سوال تھا۔

”بشیر! یہ اپنی ماں کی قبر پر آیا ہے گاؤں میں ہی رہتا ہے۔“ نوری نے میرے چہرے پر اٹھنے والے سوال کو پڑھتے مجھے بتایا۔ پھر ہم کھانے میں لگ گئے۔ نوری نے اسے بھی روٹی اور چٹنی جو روٹی کیساتھ تھی دیتے ہوئے کھانے کیلئے کہا۔

ایک دونوں لے لیتے ہی تیز مرچ کے باعث اس کی زبان جل گئی اور اس نے مجھ سے پانی مانگا۔ میں نے ڈونٹی سے پانی ڈال کر دیتے اس کا نام پوچھا۔ اس نے میرے ہاتھ سے گلاس لیتے بتایا کہ اس کا نام شہباز ہے سارے شوا کہتے ہیں۔

”گاؤں میں کس جانب رہتے ہو؟“ میرے سوال پر اس نے جواب کہ دیا مسجد والی گلی میں ہمارا گھر ہے۔ اتنا بتا کر وہ اٹھنے لگا تو نوری نے اسے روک لیا۔ ”شعی بہت تیز دھوپ ہے تھوڑی دیر رُک جاؤ ہم بھی واپسی کیلئے اٹھنے والے ہیں۔“

”نہیں، گھر والے پریشان ہو جائیں گے پہلے ہی کب کا لکھا ہوا ہوں“ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر قبرستان سے باہر جانے والے راستے پر چل پڑا۔

”نوری! اسے ڈر نہیں لگا یوں اکیلے قبرستان آئے۔“ میں نے اسے قبرستان سے نکل کر گاؤں کی طرف جاتے دیکھ کر پوچھا۔

”بچہ ہے، ابھی اسے ڈر ور کا کیا پتہ“ نوری نے پانی والی ڈونٹی اور برتن باندھتے میری بات کا جواب دیا۔

جیسے وہ کسی کو پکڑتی اور کوئی اسے پکڑتا کبھی لیٹ کر اور کبھی بیٹھ کر اور کبھی چارپائی سے نیچے اتر کر ادھر ادھر بھاگنا شروع کر دیتی۔ مجھے اور خلیل کو دیکھ کر وہ بھاگتی ہوئی کبھی کے اندر چلی گئی اور پیچھے کبھی چٹائی پر لیٹ کر اوپر چادر اوڑھ لی جیسے ہم سے چھپ گئی ہو۔ میں سمجھ گیا تھا کہ شعی اسے دکھائی دے رہا ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے کو سب سے دُور رکھنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

میں نے لماں سے حاجی غفور کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ کہہ رہا ہے میرے بس کی بات نہیں کسی عامل کو لانا پڑے گا۔ لماں نے اپنی آنکھوں میں آئے آنسو اپنے ڈوٹے سے صاف کرتے مجھے بتایا۔

نوری کی حالت کل سے بھی بُری ہو رہی تھی۔ میں چلتا ہوا حاجی غفور کی کبھی میں آگیا اور نوری کے بارے میں جو حالات بن چکے تھے، اُن کی بابت پوچھا تو حاجی صاحب نے کہا کہ میں مسجد کے امام کے پاس گیا تھا مگر اس نے بھی یہی مشورہ دیا ہے کہ کسی ایسے عامل کے پاس جاؤ جو جنات اور بدروحوں کو اُتارنے کا ماہر ہو ہمارے بس کی بات نہیں مابھی تو پانی سر سے اوپر نہیں گیا اور اس کا سدباب ہو جائیگا ہوں ہوں دن گزرتے رہے نوری اس کے قبضہ میں آتی جا رہی۔

حاجی صاحب کے لہجہ میں پریشانی کا عنصر نمایاں تھا۔ ”حاجی صاحب مجھے تو پتہ نہیں کہ عالم، عامل کہاں ملے گا؟“ میں نے تذبذب میں ہاتھ مسلتے اپنی بے بسی کا اظہار کیا ساتھ ہی میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میری حالت دیکھ کر حاجی غفور نے میری ڈھارس بندھائی اور مجھے شہر میں سائیں شیر علی کا پتہ بتایا کہ اس کے پاس جا کر ساری حقیقت بیان کرو شاید وہ کوئی مدد کر سکے۔

وہ رات تو ہم نے ہوں ٹوں کر کے کافی صبح میں مال خلیل کے سپرد کرتے ہوئے خود شہر جانے کیلئے وینکین شاپ پر آگیا۔

سایہ کی شکایت ہو گئی ہے، فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائیگا میں پانی دم کر دیتا ہوں اسے وقفہ وقفہ بعد پلاتی رہنا۔

جب سب اپنی اپنی کبھی میں چلے گئے تو میں نے نوری کی چارپائی پر بیٹھتے پوچھا نوری یہ سب کیا تھا؟

اس نے میری طرف دیکھتے بڑی نقاہت بھری آواز میں بتایا کہ ”وا لڑکا جو قبرستان میں آج ملا تھا وہ

درحقیقت جنات میں سے تھا اور اس کا خاندان بھی اسی قبرستان میں رہتا ہے۔ ہم جب واپس گھر لوٹ رہی تھیں تو وہ اچانک مجھے اپنے سامنے کھڑا دکھائی دیا اور

پھر میرے کندھوں پر ادھر ادھر ٹانگیں رکھ کر سوار ہو گیا۔ میری گردن کو اس نے اپنے ہاتھوں میں اس طرح آہستگی سے پکڑ رکھا تھا کہ مجھے تکلیف بھی نہیں

ہو رہی تھی مگر میں اپنی گردن گھما نہیں سکتی تھی جب حاجی صاحب پڑھ رہے تھے تو وہ مجھ سے یہی تکرار کر

رہا تھا کہ میرے ساتھ چلو میرے گھر میں اپنے گھر والوں کو تم سے ملانا چاہتا ہوں“ یہ بتا کر نوری چپ ہو

گئی۔

میرے لئے یہ سب سن کر پریشان ہونا ایک لازمی بات تھی۔ میری اماں نوری کو ساتھ لگاتے اس کی

چارپائی پر ساکت بیٹھی تھی۔ پوری رات تمام ککھویوں کے لوگ نوری کیلئے پریشان رہے۔

اماں نے نوری کو میرے ساتھ جانے سے روک لیا تھا اور میرے ساتھ خلیل کو بھیج دیا۔ ہم دونوں چچا زاد

تھے اور ایک دوسرے کے بچے دوست بھی۔ اماں نوری کو خلیل کیساتھ اور خلیل کی بہن سمو کو میرے ساتھ

بیابان کا ارادہ رکھتی تھی۔ خلیل بھی نوری کو چاہتا تھا اور خاصا پریشان تھا میں نے جان بوجھ کر اس سے شعی

جن کے بارے میں کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

شام کو ہم واپس آئے تو ہماری کبھی میں آس پڑوس کی ککھویوں کی عورتیں جمع تھیں اور نوری اپنی چارپائی پر بیٹھی سب سے بے نیاز عجیب عجیب حرکتیں کر رہی تھی

سیارہ ڈائجسٹ کی عظیم الشان پیشکش

تحفۃ النساء

شائع ہو گیا ہے!

● خواتین اسلام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری پیاری باتیں!
● قرآن و حدیث کی روشنی میں عورتوں کے لئے اسلامی عقائد، ایمان، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، ذکر، تلاوت، وظائف اور دعا کے مفصل احکام!
● اس کے علاوہ ازدواجی زندگی، نکاح، طلاق، خلع، عدت، نفیبت، وراثت، توبہ، اخلاق، اولاد کی تعلیم و تربیت کے مسائل اور ان کا حل
● غرضیکہ خواتین کی دینی زندگی سنوارنے کے لئے جامع اور نایاب نسخہ جو ہر مسلمان گھرانے کی ضرورت ہے۔

قیمت: 175 روپے

سیارہ ڈائجسٹ 240- مین مارکیٹ ریوازا گاڑن لاہور۔ فون: 37245412

میں نے جلدی جلدی چائے کا کپ ختم کیا اور لڑکے نے مجھے اندر جانے کا کہا۔ اندر داخل ہوتے ہی مجھے ناگوار سی بدبو کا احساس ہوا، میرے سامنے گاؤں کی کاسہارائے ایک دو من وزنی پہلوان نما عامل بیٹھا تھا جس کے چہرے پر ٹھکن کے آثار نمایاں تھے۔

”آؤ بیٹا“، اس نے خمار آلود آواز میں میرا خیر مقدم کیا اور کارپٹ کے اوپر پڑی گدیوں میں سے ایک پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”ہاں بتاؤ میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“ عامل شہباز لیا تو نے میرے آنے کا مقصد پوچھا۔

میں نے سارا واقعہ پرانے قبرستان سے لیکر جو جو لوری کو پیش آیا اسے بتایا تو اس نے پچاس ہزار روپے کڑاہی کے نام پر اور آنے جانے کا خرچہ الگ مانگا۔ ٹیکسی اسٹینڈ ساتھ ہی تھا۔ اس نے لڑکے کو بھیج کر گاڑی کے مالک کو بلوایا اور سکھ پور کا کرایہ پوچھا۔ اُس نے آنے جانے کے تین ہزار علاوہ پٹرول اور روٹی پانی مانگے۔ عامل لیاقت نے خود ہی بھاؤ تاؤ کیا اور پچیس سو روپے پر ہات پکی کر لی۔

گھر سے چلتے وقت میں نے تھوڑے بہت پیسے پاس رکھ لئے تھے ان میں سے دو ہزار گاڑی والے کو دیئے اور باقی سکھ پور جا کر ادائیگی کرنے کا کہا۔

عامل شہباز آگے، میں اور لڑکا پیچھے بیٹھ گئے۔ گاڑی پٹرول پمپ پر آرکی دو ہزار کا پٹرول ڈلوانے کے بعد عامل صاحب نے لڑکے کو اور مجھے پٹرول پمپ سے کھانے پینے کی اشیاء لانے بھیج دیا۔ میرا سات آٹھ سو روپے کا خرچہ ہوا۔ پتہ نہیں اس کے جسم سے اتنی ناگوار بدبو کیوں اُٹھ رہی تھی۔ کھانے پینے کے بعد وہ خرائے لینے لگا۔ اگر گاڑی کے اندر اسی آن نہ ہوتا تو میں اس گندی بدبو جو عامل کے پھینسے نما جسم سے اُٹھ رہی تھی سے نجات پانے کیلئے گاڑی کا شیشہ نیچے کر دیتا۔

سائیں شیر علی ریلوے پھانک کے پاس اسلام بلڈنگ میں کرایہ کی دکان میں اپنا آستانہ بنائے ہوئے تھا اور کافی سارے لوگ ارد گرد موجود تھے۔ میں نے ان کے قریب بیٹھتے بڑے دُکھ کے ساتھ اپنی بہن کیساتھ گزرنے والے حالات سے انہیں آگاہ کیا۔

انہوں نے کہا کہ ”میں تو چل پھر نہیں سکتا میں تمہیں ایک عامل کا پتہ بتاتا ہوں تم اس کے پاس چلے جاؤ پھانک کے دوسری طرف شہزاد دواخانہ کے قریب وہ ملے گا۔ لیاقت عرف عامل شہباز نام ہے اس کا سنا ہے وہ جادو ثر نہ اور جنات اتارنے کا دھندا کرتا ہے“

میں سائیں شیر علی خان کا شکریہ ادا کرتے عامل شہباز کو تلاش کرتا اس کی جادوگری میں پہنچ گیا۔ باہر دوکان کے پاروں جانب خوفناک شکلوں کے جنات کی تصاویر آویزاں تھیں۔ دوکان کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہوا تھا پہلے حصہ میں ایک نو عمر اٹھارہ سالہ عامل کرسی میز پر موجود تھا جس سے میں نے لیاقت عرف عامل شہباز کالے علم کی کاٹ، محبوب آپ کے قدموں میں، امتحان میں بغیر پڑھے کامیابی وغیرہ وغیرہ کے بارے میں پوچھا۔ اس نے آنے کا مقصد پوچھا تو میں نے سارے حالات اس کے گوش گزارے۔ وہ اٹھ کر اندر گیا اور آکر مجھے انتظار کرنے کا کہا۔ مجھ سے چائے پینے کا پوچھا میں نے پینے کیلئے ہاں کر دی تو اس نے اُٹھ کر باہر کسی کو اشارہ کیا اور اندر آکر پھر اپنی کرسی پر آن بیٹھا۔ تھوڑی دیر بعد چائے آگئی اور میں آپ پکڑ کر پینے لگا۔

اسی دوران اندر سے ایک سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی نکلی جس کا چہرہ اُترا ہوا تھا اور سر کے بال اُلجھے ہوئے تھے جس کے ہاتھ میں پکڑی کتابیں دیکھ کر یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کوئی سٹوڈنٹ ہے اور بغیر پڑھائی کے لئے عامل شہباز لیاقت سے امتحان میں فیسٹ کلاس نمبر لگوانے آئی تھی۔

”بشیر تم کڑا ہی کی رقم کا بندوبست کرو میں اس بد بخت کو قابو کرتا ہوں“ اس نے ساتھ لائی مٹی کی ہنڈیا کا ڈھکن اُتارتے ہنڈیا زمین پر رکھتے جیب سے بڑا سارا چاقو نکالتے اسے کھولا۔

”اور ہاں تم کبھی سے دو سو قدم دور رہو گے اور جو حصار میں نے کھینچا ہے اس کے اندر کوئی نہ آنے پائے تمہیں سختی سے ہدایت ہے ورنہ اگر کسی کا نقصان ہو گیا تو وہ خود ذمہ دار ہوگا“۔

جی بہتر۔ میں نے اپنی بہن کی طرف دیکھتے کہا اور کبھی سے باہر آ گیا۔

باہر وہ لڑکا اوٹ پٹانگ کچھ اونچی آواز میں پڑھ رہا تھا سارے قبیلہ کے لوگ ایک جگہ بیٹھے نوری کیلئے دعائیں مانگ رہے تھے کبھی کے اندر مکمل خاموشی تھی۔ میرے سمیت ہر کسی کا دل ہی طرح دھڑک رہا تھا کہ دیکھیں اب کیا ہو؟

یکدم میری کبھی سے نوری کے گالی گلوچ اور مار پیٹ کی آوازیں آنے لگیں ہم سب نے سمجھا کہ اندر عامل شہباز لپاتی جنات کیساتھ ہاتھ پائی کر رہا ہے اسی اثنا میں نوری درختوں سے لکڑیاں کاٹنے والا کا پا لہراتی عامل شہباز کے پیچھے بھاگتی کبھی سے باہر نکلی۔ عامل کی شلوار پھروں میں تھی اور وہ چیخ و پکار کر رہا تھا۔

نوری نے بتایا کہ ”یہ مجھ سے بد تمیزی کرنے لگا تھا یہ کوئی عامل وال نہیں یہ تو کوئی بدکار مستنڈا ہے“ اس کے منہ سے یہ سب کچھ سن کر ہم سب قبیلہ والوں نے دونوں استاد شاگرد کو جوتوں پر رکھ لیا۔ حاجی غفور نے بڑی مشکل سے ہم سب پر قابو پایا اور وہ اپنا سارا جادو نہ چھوڑ کر مڑی میں لو دو گیارہ ہو گئے۔

نوری نے مجھے بتایا کہ ”بشیر، اس بچے سے مجھے کوئی خطرہ نہیں جتنا تم اس کے پیچھے پڑو گے وہ مجھے تنگ کرے گا“۔

سکھ پور آتے نیم تاریکی پھیل چکی تھی اور ہم اپنی کھیموں میں پہنچ گئے۔ اماں نے مجھے بتایا کہ نوری دن بھر اسی عالم میں رہی ہے اب تھوڑی دیر پہلے ہی اس کی آنکھ لگی ہے۔ گاڑی ایک سائیڈ پر کھڑی کروا کر میں نے خلیل کو پار پائی لانے کا کہا اور اماں کو چائے بنانے کا کہہ دیا۔

عامل لپاتی نے سب موجود لوگوں کو ہماری کبھی سے دور ہٹا دیا اور ساتھ ہی بکس سے ایک بڑی سی چادر جس پر خوفناک تصویر بنی ہوئی تھی جس کے بارے میں اس نے بتایا کہ شہنشاہ جنات کی تصویر ہے جو میں حاضر کرونگا اور اس کے ذریعہ سے نوری پر عاشق جن کو قابو کر کے ساتھ لے جاؤں گا تا کہ وہ پھر کبھی نوری کو تنگ نہ کرے۔ کچھ ایسا ہی لڑ پڑ اور بھی سامان تھا جو اس نے ہماری کبھی کے چاروں جانب پھیلا دیا اور خود اپنے جسم پر سیاہ رنگ کارٹونی لبادہ پہن لیا۔

اس کیساتھ آیا لڑکا کبھی کے باہر چٹائی پر بیٹھ گیا اور کوئی عمل پڑھنے لگا جبکہ عامل شہباز لپاتی ہمیں کبھی سے دور رہنے کی تلقین کرتا میری کبھی کے اندر داخل ہو گیا اور اکتھا کیا ہوا پردہ اس نے کھول کر کبھی کا داخلی حصہ کور کر دیا۔ نوری اٹھ بیٹھی تھی اور سبھی نظروں سے عامل شہباز بیاقت کی جانب دیکھ رہی تھی۔

میں نے اپنی بہن کو تسلی دیتے کہا کہ ”یہ بہت بڑے عامل ہیں یہ اس جن کو پکڑنے آئے ہیں“۔

”بشیر، تم یہ سب کڈ کر رہے ہو وہ مجھے کچھ نہیں کہتا وہ تو سارا دان میرے ساتھ بنتا کھیلتا پھرتا ہے مجھے آپنی کہہ کر مخاطب کرتا ہے خود ہی چلا جائیگا۔ میں نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔“ اس سے پہلے کہ میں بولتا عامل شہباز پتا تو نے نوری کے منہ پر پتھر بٹ دیا۔

”بد بخت چکمہ دیتے ہو میں بندوبست کرتا ہوں تمہارا“ نوری کو یہ توقع نہیں تھی کہ اس کے ساتھ یہ برتاؤ ہوگا و مارے ڈر کے سہم گئی۔

گنجان جھنڈ میں رہتے تھے اور وہ اس کے سارے گھر والوں کو مل چکی تھی۔ اس نے مجھے یہاں تک بتایا تھا کہ وہ بھی ہماری طرح زندگی بسر کرتے ہیں وہ باقاعدہ انسانوں میں رہ کر کام دھندہ کر کے اپنی روزی کھاتے ہیں نماز قرآن کی پابندی کرتے اور سب انسان دوست ہیں۔

میں نے نوری سے اظہار کیا کہ وہ شاہ زیب کو میرا دوست بنادے مگر اس نے یہ کہہ کر مجھے خاموش کر دیا کہ ”شمی تم سے سخت ناراض ہے جو تم اس بد معاش پاکھنڈی موٹے بھینسے کو لے آئے تھے جس نے مجھے بے آبرو کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہ تو خیر ہوئی کہ شمی اور شاہ زیب جا چکے تھے اگر ان کی موجودگی میں آجاتا تو دونوں نے اسے جان سے مار دیتا تھا۔“

جب سے نوری جنات میں رہ رہی تھی اس میں دن بہ دن بہت سی تبدیلیاں آگئی تھیں۔ کھانا کم کھاتی تھی سوتی بھی بہت کم تھی الگ تھلگ اپنے آپ میں مگن رہتی تھی۔ پہلے ہم بہن بھائی جب مال نکالتے تھے تو وہ چلتے چلتے دنیا جہان کی باتیں کرتی جاتی مگر اب وہ خاموشی سے آگے چلتی رہتی۔ پہلے پہلے بوزو شمی پر بھونکتا تھا مگر آہستہ آہستہ وہ بھی ان کا عادی ہو گیا نہ ان کے آنے کا کوئی ٹوٹس لیتا نہ جانے کا۔

میرے والد اور بھائی دو ماہ کی چھٹی پر آئے ہوئے تھے اور ان کی کوشش تھی کہ نوری کی اور میری شادی کر کے جائیں مگر ان کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ نوری کی بات چلائیں۔ نوری پر شمی کا دھبہ پڑا ہوا تھا کہ میں نے ہمت کر کے شمی کو مخاطب کیا۔

”ہاں بولو بھائی“ اس نے اپنی آواز میں جواب دیا۔ ”ابو نوری کی اور میری شادی کرنا چاہتے ہیں تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟“۔ جوابا اس نے خاموشی اختیار کر لی اور تھوڑی دیر بعد نوری کو چھوڑ کر چلا گیا۔

نوری جب ہوش میں آتی تھی تو اسے بالکل بھی یاد

میں اپنی بہن کی بات پر رضا مند ہو گیا اور زندگی آہستہ آہستہ پرانی ڈگر پر چل پڑی۔

اب نوری دوبارہ میرے ساتھ مال لے کر جانے لگ گئی تھی۔ قبیاء کی دوسری لڑکیاں جو نوری کی ہم عمر تھیں اس سے ملنے سے کترتی تھیں۔ میرا دھیان اپنی بہن پر رہتا، مجھے پتہ چل جاتا تھا جب شمی ہمارے درمیان آجاتا اکثر اوقات وہ مختلف شکلیں اختیار کر لیتا تھا کبھی کسی جانور کی شکل کبھی بڑے سے سانپ کی شکل نوری ان سب کو پہچان لیتی تھی۔ میں اس دوران نوری سے دور جا کر مال کی گمرانی میں لگ جاتا۔

نوری اور شمی کے معاملے کو دوسرا سال جا رہا تھا میرے والد اور بھائی اس صورت حال سے خاصے پریشان تھے مگر میری اماں اور میں انہیں مطمئن کر دیتے کہ نوری کی جان کو کوئی خطرہ وغیرہ نہیں وہ جنات کا چھوٹا سا بچہ ہے اور نوری کو آپی کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ ہماری باتوں کے باوجود میرے والد مطمئن نہیں ہو پاتے تھے۔

اب یہ ہونے لگا تھا کہ نوری راتوں کو کبھی سے نکل کر قریبی کھیتوں کی طرف چلی جاتی اور گھنٹوں شمی کے ساتھ گھومتی پھرتی۔ ہم ماں بیٹا بھی اس بات کے عادی ہو چکے تھے۔ جب کبھی نوری کے پاس شمی آتا تو میری اماں کو اماں اور مجھے بشیر بھائی کہہ کر مخاطب کرتا نوری کی آواز اس وقت بچے کی آواز میں بدل جاتی تھی اور وہ اسی لب و لہجہ میں ہم سے باتیں کرتی رہتی۔ نوری نے بتایا کہ شمی سے چھوٹا اس کا بھائی شاہ زیب بھی ہے کل رات کو اسے بھی ساتھ لایا تھا وہ بھی مجھ سے بڑے پیار سے ملا اور ہم تینوں کھیلتے رہے تھے۔

اب یہ سلسلہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ نوری مجھے مال کے پاس چھوڑ کر قبرستان کے آخری حصہ کی جانب چلی جاتی جہاں پہاڑی کیکروں کے گنجان جھنڈ تھے۔ نوری کی زبانی پتہ چلا کہ شمی اور اس کے گھر والے اس

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

سے دے رہی ہے۔

”اماں سن رکھا ہے کہ جنات جو کچھ دیتے ہیں بعد میں غائب ہو جاتا ہے“ میں نے سنی سنائی بات دہرائی تو نوری بیچ میں بول اٹھی۔

”بشیر! وہ میرے ماں باپ کی جگہ ہیں بہت پیار کرتے ہیں۔ تم نے شمی سے میری شادی کی بات کی تھی تو اس نے واپس جا کر اپنے گھر والوں کو بتایا تھا یہ جو اس کے آنے میں کئی دن لگ گئے وہ یہاں سے کسی اور جگہ گئے ہوئے تھے“ بتا کر وہ خاموش ہو گئی۔

ہمارے لوگ سونا بہت کم استعمال کرتے ہیں زیادہ تر ہماری شادیوں پر ہماری عورتیں اور لڑکیاں چاندی کے ہی بھاری بھر کم زیورات پہنتی ہیں۔ جو دھڑکا میرے دل کو لگا ہوا تھا وہ ختم ہو گیا کہ شمی نوری کی شادی میں روڑے نہ اٹکائے۔ میرے سر پر سے بوجھ اتر گیا تھا۔ دو چار روز بعد نوری کا غلیل سے اور میرا غلیل کی بہن رونی سے رشتہ پکا ہو گیا اور شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی۔

جوں جوں شادی کی تاریخ قریب آرہی تھی ہم بہن بھائی جہاں اپنی اپنی شادی کیلئے خوش تھے وہاں غلیل کی طرف سے بھی پریشان ہو رہے تھے جس نے دبی زبان میں اپنی برادری کے لوگوں کو نوری پر جن عاشق کا بھی شوشہ چھوڑا ہوا تھا جبکہ شمی نوری کو آپی کہہ کر پکارتا تھا۔ میں اور اماں شمی کے والدین کی طرف سے دیئے گئے کہنے جو خامسے سال خود رہے تھے کو لیکر سنار کے پاس آئے کہ ان کو دھو دے مگر سنار وہ خریدنے پر بغض تھا کہ میں ان کے بدلے جدید انداز کے زیورات آپ کو دو گئے وزن میں دے دیتا ہوں آپ انہیں مجھے دے دیں کیونکہ مجھے پرانی چیزیں اکٹھی کر نیکا شوق ہے مگر ہم نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور آخر کار اس نے ہمارے سامنے ان زیورات کو مختلف محلول میں ڈبو کر نکالا تو ان کے نکھار میں چمک آگئی۔ زیورات

نہیں رہتا تھا کہ شمی سے کیا باتیں ہوئیں یا کیا چلتا رہا۔ میرے والد صاحب نے نوری پر سختی کر دی تھی کہ خبردار جو رات کو اٹھ کر اکیلی باہر گئی، اپنی اماں کو ساتھ لے کر ہایا کرو۔ نوری حاجی صاحب سے بہت ڈرتی تھی۔

”جی اماں جی“۔

نوری بے ہوشی کی حالت میں اپنی چارپائی پر کروٹیں بدل رہی تھی میں نے محسوس کر لیا تھا کہ شمی کہیں قریب ہی ہے۔ اماں جی کھمبی کے باہر پڑے سو رہے تھے اور اماں کی چارپائی میرے دوسری جانب تھی میں نے کروٹ لیتے اپنی ماں کا کندھا ہلایا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔ میرا نے اشارے سے انہیں بتایا کہ نوری باہر جانا چاہتی ہے۔ اماں نے نوری کی جانب دیکھا جو اب اٹھ کر بیٹھ گئی تھی اماں سر ہلاتی اٹھی اور دونوں ماں بیٹی کھمبی سے باہر نکل گئیں۔

میں اپنی بہن کی زندگی میں اٹھنے والی اس صورتحال کے بارے میں طرح طرح کے دوسے لئے سوچتا رہا۔ کافی دیر ہوئی تھی انہیں گئے ہوئے ابھی تک ان کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ جب سے نوری کی شادی کے بارے میں میں نے شمی سے بات کی تھی اس کے آنے کی روٹین ذرا کم کم ہو گئی تھی۔ آج بھی وہ تین دن کے بعد آیا تھا۔ نوری اس کے نہ آنے پر کافی پریشان تھی کہ کہیں وہ ناراض تو نہیں ہو گیا۔ اماں اور نوری واپس کھمبی میں آئیں تو اماں کے پاس کپڑے میں کچھ تھا۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ شمی اور اس کے ماں باپ آئے تھے اور جاتے ہوئے یہ دے گئے ہیں۔ اماں نے کپڑے میں بندھے چاندی کے زیورات میرے سامنے رکھتے بتایا۔ وہ زیورات پرانے تھے مگر دیکھنے میں اچھے نظر آئے۔ یہ شمی نے نوری کی شادی کیلئے دیئے ہیں۔ شمی کی والدہ بتا رہی تھی کہ وہ زیورات اس کے ہیں اور اپنی بیٹی نوری کو اپنی خوشی

سے اس کا ڈر قدرے کم ہو گیا تھا پھر ان کی خانگی زندگی میں شمی کی کوئی مداخلت نہیں تھی۔

رہنے سہنے کا ڈھب قدرے بدلتا جا رہا تھا۔ ہوس زر نے دونوں کو اپنا غلام بنا ڈالا تھا۔ پہ در پہ بھینڑ چھترے قصابوں کے پاس بکنے لگے تھے۔ میں نے دبی زبان میں اس بات کا تذکرہ روشنی سے کیا تو اس نے یہ کہہ کر مجھے چپ کر دیا کہ ”بشیر تم نوری اور خلیل کو ان کے حال پر چھوڑ دو خلیل اپنی مرضی کا مالک ہے مگر اس کا ہی کنٹرول ہے لہا اماں اور دوسرے گھر کے لوگ اس کے ”اے میں بالکل بھی دخل نہیں دیتے“ روشنی نے مجھے سمجھایا۔ میں نے روشنی کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ خلیل اور نوری نے اپنی کھٹی ذرا دور ہٹ کر بیٹالی تھی۔ گو کہ وہ قبیلہ میں ہی تھے مگر سب سے الگ تھلک ویسے بھی نوری پہ جن کی وجہ سے سبھی ملنے جلنے سے کتراتے تھے۔

شمی کو نوری اور خلیل نے اپنے اشاروں پر چلانا شروع کر دیا تھا وہ دونوں اس سے سودا سلف منگوانے لگے تھے۔ پہلے پہل تو اسے پیسے دیکر بھیجتے پھر پیسوں کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔ اب جو بھی کھانے پینے کی چیز مانگتے شمی پل بھر میں لا حاضر کرتا۔ شمی نے دونوں کو سختی سے منع کر رکھا تھا کہ جب کبھی شاہ زیب میرے ہمراہ آئے تو تم لوگ کوئی بھی ایسی بات یا فرمائش نہیں کرنا میرے والدین اس بات پر سخت ناراض ہونگے۔ وہ ہم واصلوۃ کے پابند ہیں اور ان کو یہ بات ناگوار لگے گی۔

دونوں نے مجھے جب بات بتائی تو میں نے نوری کو منع کر دیا کہ وہ تمہیں کسی طرح پیار کرتا ہے اور پھر وہ فوق الفطرت مخلوق ہونے کے ناطے کبھی ناراض ہو گیا تو تمہیں نقصان پہنچائے گا جیسا کہ مجھے پہنچا رہا ہے میرا مال پر اسرار بیماری کا شکار ہے۔

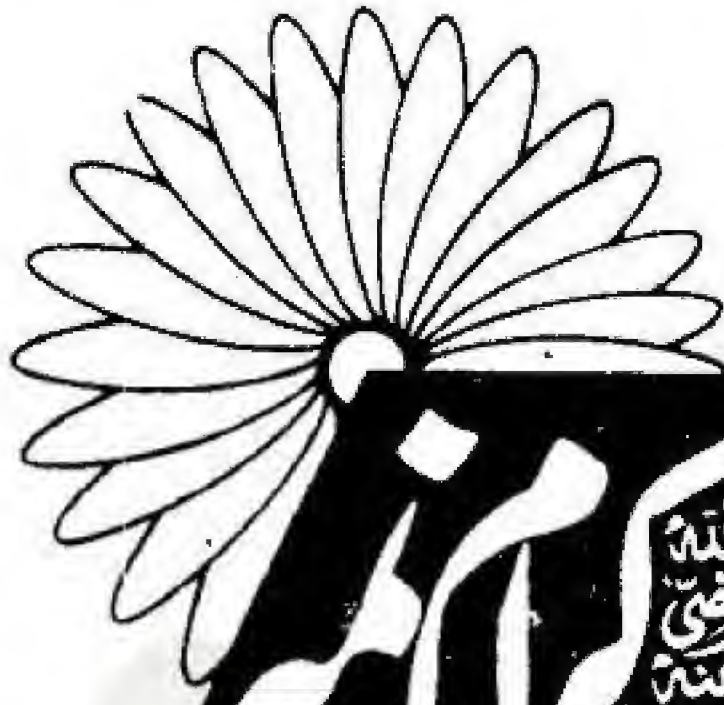
”ارے نہیں بشیر، وہ بھلا بچہ تمہارے مال کا کیوں نقصان کریگا؟“ نوری نے میرے دوسرے کو مسترد

لے کر ہم ماں بیٹا دوسری خریداری میں لگ گئے۔ آخر کار نوری خلیل کی بیوی بن گئی اور روشنی میری۔ وہ بارات لیکر ہماری کھٹی میں آئے اور دوسرے روز میری بارات ان کی کھٹی میں گئی۔ خوب خوشی منائی جارہی تھی نوری کی شادی میں شمی سمیت اس کے گھر والوں نے بھی شرکت کی اور دعوت میں ہمارے ساتھ شریک رہے۔

نوری خلیل کے ساتھ بہت خوش تھی۔ جو مال پہلے روشنی اور خلیل لے کر جاتے تھے اب روشنی کی جگہ نوری اور میرے ساتھ روشنی تھی۔ روشنی کے آجانے پر میری کھٹی کے طور طریقے بدل گئے تھے نوری کا میل سب سے الگ تھا، جبکہ روشنی کی عادتیں مختلف تھیں۔ جب سے شادی ہوئی میری سات بھینڑیں معمولی اونچ نیچ کی بنا پر ذبح ہو چکی تھیں۔ کبھی اچھا رہا ہو گیا کبھی چارہ لڑ گیا کبھی منہ خراب ہو گیا میرے والد اس صورتحال سے بہت دلبرداشتہ ہو چکے تھے۔ ان کا دھیان شمی کی طرف تھا کہ یہ سب کچھ جنات کی کارستانیوں ہیں مگر میرا دل نہیں مان رہا تھا لیکن اندر سے میں بھی پریشان تھا کہ یہ سارا کچھ صرف میرے مال کیساتھ کیوں؟ دوسرے لوگوں کے بھی اذیت نکڑوں بھینڑ چھترے تھے۔

گادوں کے سولوی صاحب سے دم جھاڑا بھی کر دیا حاجی خفیر صاحب سے بھی تعویذ لے کر بھینڑوں کے گلے میں ڈالے، کوئی کہہ رہا تھا کہ روشنی کا پیر بھاری کھلا وغیرہ وغیرہ۔ جتنے منہ اتار باتیں مگر میں کوئی نوش نہیں لے رہا تھا۔ حاجی صاحب کے جانے کا وقت ہو گیا وہ مجھے کئی ہدایتیں دیتے واپس چلے گئے۔

اب میں اور روشنی اپنے مال کو سنبھالنے میں لگ گئے تھے۔ خلیل نوری کے معاملات میں دخل نہیں دیتا تھا وہ اگر رات کو اٹھ کر کھٹی سے نکل جاتی تو وہ بیٹھ کر انتظار کرتا رہتا مگر اس کے پیچھے ہرگز نہیں جاتا تھا۔ شمی نے دو چار بار خلیل سے بات بھی کی تھی جس کی وجہ



صحابہ کرام

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور
ایمان افروز فخریہ پیشکش

قیمت: 175 روپے

۴۰ درخشندہ ستاروں کے
روح پرور اور بصیرت افروز
تذکروں پر مشتمل —

- جنہوں نے اپنی آنکھوں سے جلوۂ یار کا بے نقاب مشاہدہ کر کے شرف صحابیت پایا
- جنہوں نے منبع رشد و ہدایت ﷺ سے براہ راست کسب فیض کیا۔
- جنہوں نے صاحب قرآن ﷺ سے قرآن کے رموز و اسرار سمجھے۔
- جنہوں نے اپنے خون جگر سے چینستان اسلام کی آبیاری کی۔
- جنہوں نے اپنے ارفع سیرت و کردار سے چہرہ انسانیّت کی سیاہیاں دھو ڈالیں۔
- جنہوں نے انتھک مخلصانہ جدوجہد سے جنتِ نظیر معاشرہ کی صورت گری کی۔
- جنہوں نے فیصلہ کن اور غیر مصالحانہ ٹکڑے کر باطل کو تہہ و بالا کر دیا۔

۵۰۰ صفحات پر مشتمل مفید کاغذ، عمدہ کتابت اور دیدہ زیب سرورق

شائع ہو گیا ہے

کرتے تھے کسی طرفداری کی۔

خدا کرے ایسا ہی ہو میں نے خاموشی اختیار کر لی کہ جو بھی ہو اس سے سمجھوتہ تو کرنا پڑیگا۔

خلیل کے ٹھاٹھ ہاتھ بدل رہے تھے نوری بھی اس کے ساتھ شامل تھی اور اس نے دبی زبان میں یہ اظہار کر دیا تھا کہ بہت مال کی خدمت کر دیکھی اب ہم سکھ پور سے نقل مکانی کر کے شہر جانا چاہتے ہیں خلیل اب کوئی اور کام کریگا۔ اب نوری اپنے گھر والی تھی میں اس پر اپنی مرضی نہیں ٹھونس سکتا تھا اس لئے میں نے چپ سادھ لی کہ جو مرضی آئے کرو۔

خلیل تھوڑا بہت راج گیری کا کام جانتا تھا دونوں میاں بیوی سکھ پور سے شہر منتقل ہو گئے۔ کوئی بڑی عمارت بن رہی تھی دونوں کو کام مل گیا۔ نوری مزدوری کا اور خلیل کو مستریوں کا۔

اسی عمارت میں انہوں نے مالک سے پوچھ کر رہائش اختیار کر لی۔ انہیں سکھ پور سے گئے تین ماہ سے اوپر ہو گئے تھے میں کبھی کبھار ان کو جا کر مل آتا تھا کئی بار میں نے خلیل کو واپسی کا کہا مگر وہ دونوں میری بات نہ مانے اور میں مایوسی ہو گیا۔ خلیل اور نوری شہر سے ایسے کام لینے لگے تھے جس میں خلیل کی چالاکی شامل تھی وہ خود کو بڑا عامل تصور کرنے لگا تھا۔ سب سے پہلے بلڈنگ مالک، مامی نور احمد کو اس نے قائل کیا پھر یہ سلسلہ اس کے دوستوں رشتہ داروں تک پھیل گیا۔

شہر ان کے سامنے جو بھی کوئی ہوتا مختلف چیزیں ادھر ادھر کرتا تا کہ ان کو یقین آجائے کہ خلیل کے ہاتھ میں جنت ہیں اور وہ ان سے کام لے سکتا ہے۔ کم عقیدہ کے لوگ تو دونوں میاں بیوی کی ہر بات من و عن تسلیم کر لیتے تھے اگر کوئی بیمار ہوتا تو اس سے یہ کہا جاتا کہ تم پر کالے جادو کا وار کیا گیا ہے یہ تم کرنے کیلئے جنت کو حاضر کرنا پڑے گا وہ اس کا توڑ کریں گے ان کو بلوانے کیلئے کچھ چیزیں درکار ہوں گی اس پر یہ خرچ آئے گا۔

شہر کو بلایا جاتا تھا طرح طرح کے جھکندے دکھا کر سائل کو قہو کیا جاتا تھا۔ دن دو گنی لہر دلت چو گنی ترقی چل رہی تھی۔ دونوں میاں بیوی دھڑا دھڑ چاندی سمیٹ رہے تھے۔ جب لوگوں کے سامنے شہر کو بلایا جاتا تو خلیل اسے گلی گلیوں کرتا تا کہ وہیں موجود کام کروانے والوں پر اس کی دھاک جسے نوری نے بھی وہ رویہ اختیار کر لیا تھا۔

ایک دن شہر کو حاضر کرنے کیلئے آوازیں دیں تو وہ شاید کہیں دور تھا یا ویسے ہی وہ جان بوجھ کر سنی اُن سنی کر رہا تھا۔ جب وہ نوری کے پاس آیا تو وہ آپے سے باہر ہو گئی۔ شہر نے غصہ سے خلیل کو دھکا دیا جو اس سے بدتمیزی کر رہا تھا اور واپس چلا گیا۔

کئی دن تک شہر واپس نہ آیا دونوں کو تشویش ہوئی اور دونوں پریشان ہو گئے نوری دن رات شہر کو واپس بلانے کی کوشش کرتی رہی مگر وہ نہ آیا۔ اگر کوئی کام کے سلسلہ میں آتا تو وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتے۔

اب ان کی توجہ صرف بلڈنگ میں کام کی طرف تھی جب شہر کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو وہ نوری کو ملنے آ گیا دونوں بلڈنگ کی چوتھی منزل پر سامنے کی طرف گئے بڑے بڑے لکڑی کے پھنوں پر کام کر رہے تھے۔ خلیل کو اس کی آمد کا پتہ چل گیا تھا اس نے پھنکار کر اسے ڈانٹا کہ کہاں گئے تھے اتنے دن۔ نوری نے مداخلت کی تو اسے بھی اس نے جھڑک دیا۔

یکدم خلیل ہوا میں اچھلا لہر بچ سڑک پر گرتے تربیہ کی طرح بکھر گیا۔ نوری سکتی حالت میں اوپر کھڑی اس کی لاش کے گرد ہجوم کو دیکھ رہی تھی۔ نوری کے مطابق شہر کوئی بہت کئے بغیر چلا گیا تھا ہمیں پتہ چلا تو ڈیرہ کے دھڑے لوگوں سے مل کر ہم اس کی لاش لہو لہو کو لے کر واپس سکھ پور پر آ گئے۔ نوری آج بھی شہر کو یاد کر کے دُکھی ہو جاتی ہے اسے اُمید ہے کہ ایک دن شہر اچانک آ کر کہے گا۔

”آپنی کیا حال ہے؟“



جاوید احمد صدیقی

”وفاداری“

پھر مجھے آواز آئی، ”ہیلو مسٹر فاروقی!! گنڈ مارنگ“ اس آواز میں کوئی چیز محسوس کر کے میں نے فوراً پلٹا کھایا اور چیئر مین صاحبہ کو دیکھا، آ منا سامنا ہوتے ہی ہم دونوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ اور ہم دونوں بیک وقت بولے ”ارے تم، ارے تم!!“ میں تو دم بخود ایک نیک شہباز کے چہرے کو دیکھتا چلا گیا۔

دو دلوں کا ماجرا، وہ ایک دوسرے کیلئے بنے تھے مگر حالات نے انھیں جدا کر دیا تھا

کم نہ تھا اور نہ ہی ہے۔ اب تو عمر بھی آگے اور آگے چلتی جا رہی ہے۔ وہ پرانی باتیں بھی تو اب یاد آتی ہیں اور ایک ایک لمحہ شہباز کے ساتھ گزرا ہوا، تیر بن کر دل میں اترتا چلا جاتا ہے۔ باجی کی ڈانٹ ڈپٹ

آج بھی عرصہ کے بعد پیاری باجی کا ڈانٹ بھرا فون آیا۔ وہی رٹ کہ تم ابھی تک اکیلے ہو۔ میں انہیں کیسے سمجھاؤں کہ اُداسی جدائی اور غمگین راتوں کی کٹھن ترین لمحات کو گزارنا میرے لیے عذاب سے



جھمکتی ہوئی چاندنی راتوں کے حسین سایوں میں بیٹھے رنگین سپنوں کے جال بنا کرتے اور ایسا محسوس ہوا کرتا تھا کہ جیسے ہماری باتوں کے ساتھ گرد و پیش کی چیزیں بھی اسی طرح تبدیل ہوتی جا رہی ہیں۔ پھر خیالات کی سرسبز و شاداب راہوں پر پرواز کرتے کرتے اجنبی جزیروں پر اتر جاتے۔ الف لیلیٰ کے کرداروں کی طرح، نفاست بھرے بازاروں میں گھومتے اور نئی سجاویں دکانیں بھی خوب نظارہ دیتیں۔ اور اب احساس ہوتا ہے کہ وہ اتنے سارے وعدے و وعید جو کیے تھے وہ کیا ہوئے؟ لمبے لمبے پروگرام جو ہر روز مرتب ہوتے تھے اب کیسے پورے ہوں گے۔ ویسے یہ یادوں کی راہ گزر بھی کتنی عجیب ہوتی ہے، ہر وقت دھند چھائی رہتی ہے اور جب کبھی اتفاقاً یہ دھند چھٹ جائے تو ہم ذہن کی چوڑ کھڑکی سے ان یادوں کو دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں اور پھر وہی حالت جس کے ہم عادی ہو چکے ہیں۔ سوچ کی لہروں پر چلتے چلتے لگتا ہے کہ ابھی کوئی آواز دیگا اور میں پلٹ کر جواب دوں گا مگر سوائے ایک گہری خاموشی اور اداسی کے وہاں کیا ہوتا ہے۔

اور پھر میں بہت سی امیدیں لیے واپس گھر آ گیا۔ ابو اور امی نے زور لگا لیا کہ شادی کے بندھن میں بندھ جاؤ۔ خاندان میں ایک سے ایک بڑھ کر لڑکی ہے۔ مگر میرے ذہن کی سوئی وہیں انک گئی تھی۔ واپس آتے ہوئے نواز صاحب سے بات کی تو انھوں نے مجھے جواب دیا تھا کہ بھی تم اتنے نزدیک ہی کیوں آئے کہ بعد میں افسوس ہو۔ شیبہ کی کہیں بھی اور شادی ہو سکتی ہے کیوں کہ اسے ہم اپنے سے اور اس شہر سے علیحدہ نہیں کرنا چاہتے اور نہ کریں گے۔ شیبہ بھی کچھ کچھ بدلی بدلی سی لگی جس سے مجھے تو صدمہ کا گہرا جھٹکا لگا تھا!!

نے مجھے ایک بار پھر ماضی کی تلخ و خوشگوار یادوں کی طرف دھکیل دیا ہے۔

زندگی اچھی بھلی گزر رہی تھی۔ گھر میں خوب ہنگامہ رہا کرتا تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ انجینئرنگ کرنے کے بعد ابو نے مجھے آگے پڑھائی کے لیے اپنے جگری اور پرانے دوست نواز صاحب کے پاس سنگاپور بھیج دیا۔ نواز صاحب کوئی بیس پچیس سال قبل وہاں پہنچے تھے اور کاروبار کو جما لیا تھا۔ اب وہ بڑے مقامی کاروباروں لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ جن دلوں میں، میں وہاں پہنچا ان کی فیملی یورپ کی سیر کے لیے جا چکی تھی۔ نواز صاحب اور ان کے ایک کزن ہی تھے گھر میں۔ خیر میں نے داخلہ ہونے کے بعد پڑھائی میں دل لگا لیا۔ کونھی کی انیکسی پر میرا قبضہ تھا اور خوب آرام سے پڑھائی ہو رہی تھی۔ تین چار ہفتوں کے بعد فیملی بھی آگئی۔ نواز صاحب کے دوڑ کے اور دوڑ کیاں تھیں۔ چاروں ہی خوب پڑھ چکے تھے۔ ایک بیٹا انجینئر تھا اور دوسرا ڈاکٹر، جبکہ بیٹیوں میں بھی ڈاکٹر اور دوسری ایم بی اے تھی۔ وہ اپنے کاروبار کے علاوہ، کلینک چلاتے تھے اور فیکٹری کے ایچ آر اور اکاؤنٹس کی بھی دیکھ بھال کرتے تھے۔

ہماری سب کی آپس میں اتنی بے تکلفی نہ تھی مگر پھر بھی خوب چھنتی تھی۔ میرا پی ایچ ڈی کا آخری سال تھا، شیبہ جس نے ایم بی اے کر رکھا تھا، وہ میرے ساتھ وقت تو گزارتی تھی مگر ذرا لیے دیئے رہنے والی شخصیت تھی۔ پھر ذرا بے تکلفی ہوئی تو اکثر ہم مختلف مقامات پر سیر کے لیے نکل بیٹھا کرتے تھے اور یہ جذبہ محبت ایک دوسرے کے لیے بڑھتا ہی چلا گیا۔ ہم مختلف پارکوں اور کلبوں میں بیٹھے گھنٹے ہاتھ کرتے رہتے یا ایسا لگتا کہ جیسے راتیں مدھوش ہو چکی ہیں۔ ہم دونوں دیر تک

پور میں کھولنے گیا ہوا تھا۔ کئی ماہ گزر گئے اور تمام سیٹ اپ بہترین بن گیا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ کچھ عرصہ گزار لوں۔ دل کے اندر، شہیا کے ساتھ گزرے دنوں کی یادیں بھی تو شدت سے لوٹ آئی تھیں اور میں نے غیر ارادی طور پر ان جگہوں پر جانا شروع کر دیا تھا جہاں ہم ملا کرتے تھے۔ کبھی کبھی سوچتا تھا

وقت پر لگا کر اڑتا رہا۔ میں نے پہلے نوکری کی اور ترقی و تجربہ حاصل کرتے ہوئے آخر کار اپنی کمپنی بنا ڈالی۔ اپنی ناکامی اور تنہائی کے تمام دروازے کام کی ترقی پر کھول دیئے۔ اب تو گھر والے بھی بھول گئے کہ میری شادیاں بھی ہو سکتی ہے یا نہیں!!
ان دنوں میں اپنی کمپنی کی بہت بڑی برانچ سنگا

آپ کیا جمع کر رہے ہیں؟

ایک دن بادشاہ نے اپنے تین وزراء کو دربار میں بلایا اور تینوں کو حکم دیا کہ تینوں ایک ایک تھیلے لے کر باغ میں داخل ہوں۔ اور وہاں سے بادشاہ کے لیے مختلف اچھیا جھے پھل جمع کریں۔ وزراء بادشاہ کے اس عجیب حکم پر حیران رہ گئے اور تینوں ایک ایک تھیلہ پکڑ کر الگ الگ باغ میں داخل ہو گئے۔ پہلے وزیر نے کوشش کی کہ بادشاہ کے لیے اسکی پسند کے مزیدار اور تازہ پھل جمع کرے اور اس نے کافی محنت کے بعد بہترین اور تازہ پھلوں سے تھیلہ بھر لیا۔ دوسرے وزیر نے خیال کیا کہ بادشاہ ایک ایک پھل کا خود تو جائزہ نہیں لے گا کہ کیسا ہے اور نہ ہی پھلوں میں فرق دیکھے گا۔ اس لیے اس نے بغیر فرق دیکھے جلدی جلدی ہر قسم کے تازہ اور کچے اور گلے سڑے پھلوں سے اپنا تھیلہ بھر لیا۔ اور تیسرے وزیر نے سوچا کہ بادشاہ کی توجہ صرف تھیلے کے بھرنے پر ہوگی۔ اس کے اندر کیا ہے، اسے بادشاہ نہیں دیکھے گا۔ یہی سوچ کر وزیر تھیلے میں گھاس بھوس اور پتے بھر لیے اور محنت سے بچ گیا اور وقت بچایا۔ دوسرے دن بادشاہ تینوں وزراء کو اپنے تھیلوں سمیت دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ جب تینوں دربار میں حاضر ہوئے تو بادشاہ نے تھیلے کھول کر بھی نہ دیکھے اور حکم دیا کہ تینوں کو ان کے تھیلوں سمیت 1 ماہ کے لیے دور دراز جیل میں قید کر دو۔ اب اس دور دراز جیل میں تینوں کے پاس کھانے پینے کے لیے کچھ نہیں تھا، سوائے اس تھیلے کے جو انھوں نے جمع کیا تھا۔ اب پہلا وزیر جس نے اچھے اچھے پھل جن کر جمع کیے تھے، وہ مزے سے اپنے انہیں پھلوں پر گزارہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ 1 ماہ با آسانی گزر گیا۔ اور دوسرا وزیر جس نے بغیر دیکھے تازہ خراب تمام پھل جمع کیے تھے۔ اس کے لیے بڑی مشکل پیش آئی کچھ دن تو تازہ پھل کھا لیے لیکن پھر کچے اور گلے سڑے پھل کھانے پڑے، جس سے وہ بہت زیادہ بیمار ہو گیا اور اسے بہت تکلیف اٹھانی پڑی۔ اور تیسرا وزیر جس نے اپنے تھیلے میں صرف گھاس بھوس ہی جمع کیا تھا۔ وہ کچھ دن بعد ہی بھوک سے مر گیا کیونکہ اس کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔

اب آپ اپنے آپ سے پوچھیے..... آپ کیا جمع کر رہے ہیں؟ آپ اس وقت اس باغ میں ہیں۔ جہاں سے آپ چاہیں تو نیک اعمال اپنے لیے جمع کریں اور چاہیں تو خراب اعمال؟

مگر یاد رہے جب بادشاہ کا حکم صادر ہوگا، تو آپ کو اپنی جیل قبر میں ڈال دیا جائے گا۔ اس جیل میں آپ اکیلے ہو گئے جہاں آپ کے ساتھ صرف آپ کے اعمال کی تھیلی ہوگی۔ تو جو آپ نے جمع کیا ہوگا، وہی آپ کو وہاں کام دے گا۔ تو آج تھوڑی سی محنت کر کے اچھی اچھی چیزیں یعنی نیک اعمال جمع کر لیں اور وہاں آسانی اور آرام والی زندگی گزاریں۔

کوڈ

ایک صاحب تار گھر میں آپریٹر تھے۔ انہوں نے اپنی بیوی کو بھی تار کے کوڈ وغیرہ سکھا رکھے تھے۔ ایک دن ان کے ہاں میاں بیوی دو مہمان آ گئے۔ گھر میں جو کچھ موجود تھا ان کے سامنے رکھ دیا گیا۔ کھانے کے دوران میزبان نے محسوس کیا کہ کھانا کم پڑ جائے گا لہذا انہوں نے میز پر اپنی انگلی سے کھٹکھٹاتے ہوئے اپنی بیگم سے پوچھا ”کیمن میں کچھ اور بھی کھانے کے لیے موجود ہے یا نہیں؟“ میزبان اس کے کہ میزبان کی بیوی کچھ کہتی مہمان نے انگلی سے میز کھٹکھٹاتے ہوئے جواباً کہا ”شکریہ! ہم نے سیر ہو کر کھا لیا ہے۔“

(بسمہ ندیم طاقت خان / لاہور)

ساتھ انعام کیا جاتا ہے کہ ہماری چیئر مین صاحبہ ایک انتہائی اور ہائی لیول کی میٹنگ (جو کہ فلاں ملک کے سربراہ نے بلوائی تھی اور وہ بھی اچانک) میں شرکت کے لیے تشریف لے گئی ہیں اور ہمارے جنرل منیجر صاحب کو ہر طرح کے اختیارات سونپ کر گئی ہیں۔ انشاء اللہ ہفتہ میں آجائیں گی تو آپ کے چیئر مین غازی صاحب سے ضرور ملیں گی۔ بہر حال میٹنگ میں ہر طرح کے نکات اٹھائے گئے، ہر طرح سے تسلی سے کام پر بحث و مباحثہ ہوئے اور آخر کار جنرل منیجر صاحب نے معاہدہ کو حتمی شکل دیکر دستخط کر دیئے۔ مبارک باد کے پیغامات کے ڈیر لگ گئے! میں حسب معمول کمپنی کا کام دیکھ رہا تھا کہ اچانک ایک صبح آفس میں میری سیکرٹری نے اطلاع دی کہ محترمہ چیئر مین صاحبہ ملنے کے لیے ہمارے آفس آچکی ہیں اور انہوں نے فرمایا ہے کہ تمام لوگ باہر ہی ٹھہریں گے میں اکیلی فاروقی صاحب سے گفتگو کر لوں گی۔ میں تمام

کہ آخر نواز صاحب نے اتنی سختی سے کیوں انکار کیا اور پھر شبہا کیوں ان کے دباؤ میں تھی کہ ایک لفظ بھی میری حمایت میں نہ کہہ سکی!! اسے شاید احساس بھی نہ ہوگا کہ آج زندگی کے پندرہ سال اس کے بغیر میں نے تنہا گزار دیئے ہیں اور تنہائی کم کیا ہوتی بڑھتی چلی جارہی ہے۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے سینے کے اندر درد کا انکار دہک رہا ہے۔ حالاں کہ کمپنی کے کام کے سلسلے میں روزانہ ہی بڑے بڑے ہونٹوں یا کلبوں میں جانا ہوتا تھا، لیکن یہ سب میں دل سے نہیں کرتا تھا۔ میں تو جیسے روبوٹ بن کر رہ گیا تھا۔

اس دن میں چند ضروری کام نپٹانے کے لیے اپنے آفس جلدی آ گیا تھا۔ سیکرٹری نے فائل لا کر سامنے رکھی۔ چائے اور کافی بھی آگئی اور میرے ایک سینئر منیجر ساتھ بیٹھ گئے اور انہماک سے کام شروع ہو گیا۔ اصل میں یہ ایک نیا پراجیکٹ تھا جس کا میٹرل اور پروڈکٹ ہم ہی بناتے تھے، اربوں روپے کا یہ معاہدہ فائل سٹیج پر تھا۔ ظاہر ہے اس پر پوری محنت کرنا ضروری تھا۔ کئی گھنٹے کام کرتے گزر گئے تو سیکرٹری نے بتایا کہ جناب دو بج چکے ہیں اور لنچ پر آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ ہاں اسی معاہدہ کی چیف انچارج اور آڈر فائل کرنے کے لیے کل صبح ان کا وفد بھی آ رہا ہے۔ اس دن تو شام تک ہم لوگوں نے بہترین ورکنگ کر لی تھی اور انتہائی گہرائی سے جائزہ لیتے ہوئے قیمتوں میں اچھی خامی کی بھی کردی گئی تاکہ قیمتوں کو دیکھتے ہوئے بھی یہ پراجیکٹ ہمارا ہی رہے۔

اگلے دن میٹنگ سے پہلے اصل پارٹی والے لوگ تو سب آگئے اور جب میں خود اپنے نمائندوں کے ساتھ ہال میں آیا اور ہم سیٹوں پر براجمان ہو گئے تو دوسرے لوگوں نے اعلان کیا کہ انتہائی معذرت کے

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور بے مثال پیشکش

انکار قیامت

شائع ہو گیا ہے

قیمت: 75 روپے

✽ ”علامات قیامت“ قرآن کریم اور صحیح احادیث رسولؐ کی روشنی میں
✽ واقعہ شوق القمر..... سونے کا پہاڑ..... دمدار ستارے..... لشکر سفیانی کو
✽ شکست..... ظہور امام مہدی اور امام مہدی کی جنگیں..... قوم لوط.....
✽ قوم عاد..... ہیکل سلیمانی کی تعمیر نو..... فراموش کردہ شہر ریت کا سمندر
✽ فتنہ دجال..... پیغمبروں کی سرزمین عراق پر صلیبی امریکی حملہ جیسی
قیامت کی نشانیوں پر مکمل تفصیلات!
✽ گوانتانامو بے میں عیسائیوں کے ہاتھوں قرآن مجید کی بے حرمتی اور
عالم اسلام کی خاموشی سے قیامت کا تعلق

یہ ایک علمی، تاریخی، تحقیقی اور دلچسپ دستاویز ہے جس کے بغیر آپ کی لائبریری نامکمل ہے

سیارہ ڈائجسٹ 240 ریواڑ گاؤن لاہور فون: 042-37245412

شہد سے زیادہ مٹھاس اور فولاد سے زیادہ مضبوطی تھی، ایسے ساتھی کے لیے میں محض دولت، دنیاوی جاہ و جلال اور اپنی عمر سے بھی خاصے بڑے شخص سے زندگی کا بندھن باندھ لیتی.....“ وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر کہنے لگی، ”اور ہاں آپ بتائیں بیگم صاحبہ کہاں ہیں ساتھ رکھا ہوا ہے یا پاکستان میں ہیں؟ کتنے بچے وغیرہ ہیں۔“ میں بے بسی سے ہنس دیا۔ پھر کہا، ”شیبا جی آپ کیا سمجھتی تھیں کہ آپ عورت کی حیثیت سے ہی قربانی کی اعلیٰ مثال قائم کر سکتی ہیں۔ ہم جیسا مرد بھی آپ کے شانے بٹانے کھڑا ہے۔ میری زندگی میں کوئی بھی نہیں۔ آپ کی یاد میں زندگی گزارتا رہا ہوں۔ اکیلا اور تنہا ہوں!!“

شیبا، حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ بولی، ”تو جناب ہم بھی زندگی کا سفر اکیلے ہی بتا رہے ہیں!“

”تو پھر شیبا، یہ کونڈ ڈرنک لو اور آج ہی ہم ایک ہونے کا اعلان کرتے ہیں اور اگلے ہفتہ ہم دونوں ایک ہو جائیں گے۔ جتنی مدت اذیت اور تنہائی میں گزری ہے شیبا جی اللہ نے آخر کار یہ خوشیوں بھرا وقت ہمارے مقدر میں لکھ ہی دیا۔“

اور ہم دونوں اٹھ کر ایک دوسرے کے پاس آگئے۔ آنے والے کل کی خوشیاں اور گزرے ہوئے انمول مگر رایگاں وقت کے پچھتاوے آنسو بن کر آنکھوں میں جھللا رہے تھے۔

آج مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ ساری دنیا خوشی سے جھوم اٹھی ہے اور لاکھوں کروڑوں شمعیں جل اٹھی ہیں۔ شیبا کے گھر تو ایسا کوئی نہ تھا جس کو اتنی بڑی خوش خبری سنائی مگر میں نے اپنے والد اور والدہ کو یہ خبر ضرور سنائی اور وہ خوشی سے رونے لگے۔



تیار ہوں کے ساتھ تیار تھا۔ اٹھ کر اپنے آفس کے دواڑے کے پاس آکھڑا ہوا۔ اتفاق سے میرا چہرہ دواڑے کی طرف نہ تھا، سیکرٹری آئی اور کہا، ”سر محترمہ چیئر مین صاحبہ تشریف لے آئی ہیں“ اور وہ آفس سے باہر چلی گئی۔

پھر مجھے آواز آئی، ”ہیلو مسٹر فاروقی!! گڈ مارننگ“ اس آواز میں کوئی چیز محسوس کر کے میں نے فوراً پلٹنا کھایا اور چیئر مین صاحبہ کو دیکھا، آنا سامنا ہوتے ہی ہم دونوں کے منہ کھلے۔ کے کھلے رہ گئے۔ اور ہم دونوں بیک وقت بولے ”ارے تم، ارے تم!!“ میں تو دم بخود یک ٹک شیبا کے چہرے کو دیکھتا چلا گیا۔ اور شیبا بھی ٹھنر کر بے خود سی ہو کر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ چند لمحوں کے سکوت کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف والہانہ بڑھے اور ایک دوسرے کے ہاتھ تمام کر خاموش گلہ شکوہ کرنے لگے۔ میں نے سکوت توڑتے ہوئے کہا، ”شیبا خدا کی قسم آپ آج بھی اتنی ہی خوبصورت اور پرکشش ہیں جتنی پندرہ سولہ سال پہلے تھیں۔“ شیبا بولی ”اور آپ جناب بھی اور گریس فل ہو گئے ہیں۔“ ہم دونوں آمنے سامنے کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔ خاصا وقت ایک دوسرے کے حالات جاننے میں نکل گیا۔ شیبا نے بتایا کہ ابو تو کاروباری لحاظ سے میری پسند ناپسند کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنے ایک پارٹنر سے میری شادی کرانا چاہتے تھے، مگر میں نے سختی سے کبھی بھی شادی نہ کرنے کا عندیہ دے دیا اور کاروبار کو ہی اپنا سب کچھ بنالیا، اس دوران خوب ترقی ہوئی۔ اب تو ابو کو فوت ہوئے بھی 10 سال ہو گئے۔ والدہ پہلے ہی نہ تھیں۔“ میں نے پوچھا، ”تو..... آپ کے وہ کہاں ہیں؟ اور کیا کرتے ہیں۔“

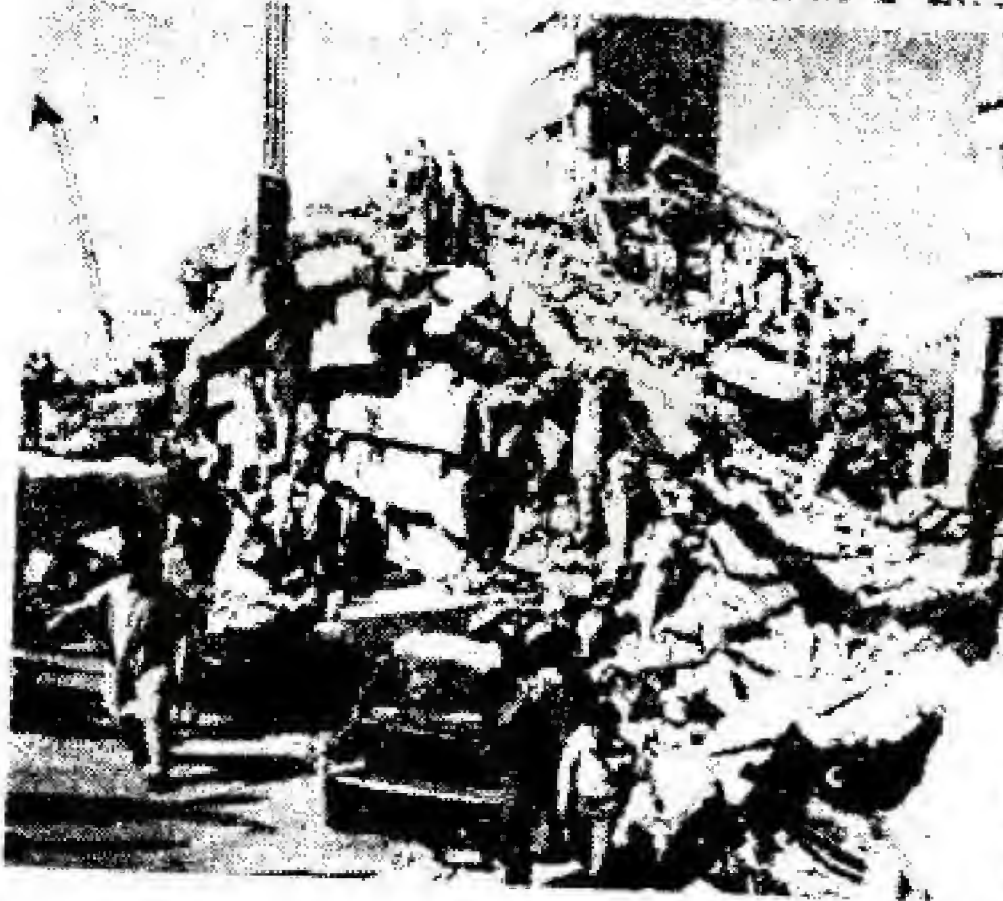
شیبا بولی، ”غازی آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میری محبت جو آپ کے ساتھ آسمانوں تک اونچی تھی اور جس میں



عارف محمود اظہل

”زلزلے“

اس خوفناک قدرتی آفت سے دنیا بھر میں ہر سال لاکھوں افراد لقمہ اجل بن جاتے ہیں



قدیم ترین ریکارڈ 580 قبل مسیح میں یورپ اور 464 قبل مسیح میں یونان کے شہر اسپارٹا کے زلزلے کا ملتا ہے۔ مورخین کا خیال ہے۔ یہ زلزلہ اسپارٹا اور ایتھنز کے درمیان لڑی جانے والی پولینیشن جنگ

تاریخ کا قدیم ترین زلزلہ کب اور کہاں آیا، یہ تو وثوق سے نہیں کہا جاسکتا، البتہ وہ پہلا زلزلہ جو انسان نے اپنی تحریر میں ریکارڈ کیا تقریباً تین ہزار برس قبل 1177 قبل مسیح میں چین میں آیا تھا۔ اس کے بعد

افراد جاں بحق ہوئے۔ اسی سال یونان کے شہر گورنہ میں بھی زلزلے سے 45 ہزار جانیں ضائع ہوئیں۔ 893ء میں تاریخ کے تین بڑے زلزلے آئے۔

ایک کاؤکاسس Caucasus شہر میں جس سے 84 ہزار نفوس ہلاک ہوئے۔ دوسرا ایران کے شہر ارادبل میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ جانیں ضائع ہوئیں اور تیسرا زلزلہ ہندوستان میں وادی سندھ کے قدیم شہر دے پور Daipur یعنی دہلی میں آیا اور تقریباً ایک لاکھ اسی ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ تاریخ ابن کثیر میں تحریر ہے کہ اُس وقت سندھ پر عبدای بن عمر ہباری کی حکومت تھی جو خلیفہ بغداد کی جانب سے مقرر کردہ تھے یہ زلزلہ 14 شوال 280 ہجری میں برپا ہوا اور اس دوران چاند گرہن اور تیز آندھی کے آثار بھی رواجوں میں بیان ہوئے ہیں، ابن کثیر کے مطابق نصف شب یکے بعد دیگرے پانچ زلزلے آئے اور بمشکل سو مکان ہی سلامت رہ سکے۔ طبری اور ابن کثیر مرنے والوں کی تعداد ایک لاکھ پچاس ہزار بتاتی ہے۔

گیارہویں صدی عیسوی کے دوران 1036 میں چین کے شہر شاکی میں زلزلے سے 23 ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ 1042ء میں شام میں حمیر، پالر اور اہلک کے مقام پر زلزلے سے 50 ہزار افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور حمیر شہر کی نصف آبادی ختم ہو گئی۔ ماہرین کے اندازے کے مطابق یہ زلزلہ 7.3 میگنیٹیو ڈ کی شدت کا رہا ہوگا۔ 1057ء میں چین کے شہر چہلی Chihli میں 25 ہزار افراد زلزلے کی زد میں آکر ہلاک ہوئے۔

بارہویں صدی عیسوی کے سال 1138 میں شام میں گنزہ Ganzah اور الہپو Aleppo کے مقام پر خوفناک زلزلہ آیا اور تقریباً 2 لاکھ تیس ہزار افراد ہلاک ہوئے، اس کی شدت کا اندازہ ریکٹر

کے دور میں آیا تھا۔ پورے شہر کو ملیا میٹ کر دینے والا زلزلہ 226 قبل مسیح یونان کے جزیرے رھوڈس میں آیا تھا، جس نے یہاں کے شہر کیرپوس کو نیست و نابود کر دیا اور ساتھ ہی اس شہر کے ساحل پر نصب عظیم الشان مجسمہ جیلوس بھی تباہ ہو گیا جس کا شمار دنیا کے سات عجائبات میں ہوتا ہے۔ 63 عیسوی میں اٹلی کے شہر پومپائی میں زبردست زلزلہ آیا جس سے اس کی تمام عمارتیں خاک میں مل گئیں۔ پھر اس شہر کی از سر نو تعمیر میں 16 سال لگ گئے مگر 24 اگست 79ء کو یہاں زلزلہ آیا اور اس شہر کے پہاڑ کوہ سیوس کا آتش فشاں پھٹ پڑا چنانچہ پومپائی اور ہرکولینم شہر مکمل طور پر تباہ ہو گیا۔ تاریخی حوالوں کے مطابق تقریباً 25 ہزار افراد لقمہ اجل بنے۔

365ء میں یونان کے جزیرہ کریٹ میں زلزلہ آیا جس سے اس کا شہر کنوس کل 50 ہزار نفوس کے ساتھ برباد ہو گیا۔ اس زلزلے کی شدت کا اندازہ 8.1 میگنیٹیو ڈ لگایا گیا۔ تاریخ میں اسی سال لیبیا کے شہر سیرین Cyrene میں بھی ایک زلزلہ کا تذکرہ ملتا ہے۔ 20 مئی 526ء کو شام کے شہر اطاکہ Antochia میں خوفناک زلزلے سے ڈھائی لاکھ افراد جاں بحق ہو گئے۔ 844ء میں دمشق شہر میں شدید زلزلہ آیا جس سے تقریباً 50 ہزار جانیں ضائع ہوئیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ ریکٹر اسکیل کے مطابق اس کی شدت 6.5 رہی ہوگی۔ 847ء میں دمشق میں دوبارہ زلزلہ آیا۔ 70 ہزار افراد ہلاک ہوئے اور تقریباً نصف شہر تباہ ہو گیا۔ سائنسدان اس زلزلہ کی شدت 7.3 میگنیٹیو ڈ سے زیادہ بتاتے ہیں۔ اسی سال عراق کے شہر موصل میں بھی زلزلہ آیا جس سے 50 ہزار افراد لقمہ اجل بنے۔ 22 دسمبر 856ء کو ایران میں زلزلے سے جابھی ہوئی جس سے دمعان اور قومیہ شہر کو نقصان پہنچا اور کل دو لاکھ

آئے۔ 26 جنوری 1700 میں امریکہ کی پلیٹ کا
سکاڈیا میں حرکت کی وجہ سے زلزلہ آیا جس کا اثر
تارتھ کیلیفورنیا سے وان کورڈر آئی لینڈ تک پہنچا۔ یہ
زلزلہ 9 میگنیٹیو ڈ شدت کا تھا۔ 1703ء میں
جاپان کے شہر جے ڈو Jeddo میں زلزلہ سے ایک
لاکھ 90 ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ 1707ء میں
جاپان میں زیر سمندر زلزلہ آیا جس سے تیس ہزار
افراد کی اموات ہوئیں۔ 30 ستمبر 1730 کو
جاپان کے ہوکا نیڈ و آئی لینڈ کے ایک لاکھ 37 ہزار
افراد زلزلہ کی زد میں آئے اور اگلے سال چین کے
شہر بیجنگ میں زلزلے سے ایک لاکھ افراد ہلاک
ہوئے۔ 11 اکتوبر 1737ء میں کلکتہ شہر میں
خوفناک زلزلہ سے 3 لاکھ افراد ہلاک ہوئے۔ اس
کے پانچ دن بعد ہی کچا نکا (روس) میں 9.3
میگنیٹیو ڈ کا زلزلہ آیا۔ 7 جون 1755ء کو شمالی ایران
میں زلزلے سے 40 ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ اس
کے ایک ہفتے بعد 18 نومبر کو بوسٹن میساچوسٹس میں
بھی زلزلہ آیا تھا مگر خوش قسمتی سے کوئی جانی نقصان
نہیں ہوا۔ 28 فروری 1780ء میں ایران میں
زلزلہ سے دو لاکھ افراد جاں بحق ہوئے۔ فروری
1783ء میں اٹلی کے شہر کلبریا Calabria میں
زلزلے سے 35 ہزار افراد لقمہ اجل بنے۔ 4 فروری
1797ء میں اکیو اڈور اور ہیرو میں زلزلے سے
41 ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ ایک ہفتے بعد 10
فروری کو الیسٹ انڈیز (موجودہ انڈونیشیا) کے صوبہ سماٹرا
میں زلزلہ آیا جس سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد
300 تھی اس زلزلے کی شدت 8.4 میگنیٹیو ڈ تھی۔
انیسویں صدی میں دسمبر 1812ء کے دوران
کیلیفورنیا میں ریکٹر اسکیل پر 7.0 کی شدت کے
زلزلے سے 40 افراد کی اموات ہوئی۔ 23 جنوری
1855ء میں نیوزی لینڈ میں زلزلے سے 4 افراد

اسکیل پر 8.1 میگنیٹیو ڈ کے برابر لگایا گیا ہے۔
1156ء اور 1157ء کے دوران بھی شام میں
زبردست زلزلے سے تیرہ شہر برباد ہو گئے 1169ء
میں شام میں شدید زلزلہ آیا اور کل 80 ہزار افراد
جاں بحق ہوئے۔ 1170ء میں سسلی میں زلزلے
سے 15 ہزار افراد موت کا شکار ہوئے۔

تیرہویں صدی عیسوی میں 5 جولائی 1201ء
کے دوران ہالائی مصر اور شام میں تاریخ کا بدترین
زلزلہ برپا ہوا۔ جس میں کل گیارہ لاکھ افراد ہلاک
ہوئے۔ 1268ء میں ترکی کے شہر اناطولیہ اور
سلسیہ Cilcia میں زلزلے سے 60 ہزار افراد
جاں بحق ہوئے۔ 27 ستمبر 1290 جمہلی (چین)
میں 6.7 میگنیٹیو ڈ کا زلزلہ آیا۔ جس سے ایک لاکھ
انسانوں کی اموات ہوئیں۔ اس کے تین سال بعد
20 مئی 1293ء میں جاپان کے شہر گاما کورا میں
آنے والے زلزلے سے تیس ہزار افراد ہلاک
ہوئے۔ چودھویں اور سترھویں صدی کے دوران 6
بڑے زلزلے آئے۔ 18 اکتوبر 1356ء میں سوئٹزر
لینڈ کے علاقے باسل میں زلزلے سے ایک ہزار
افراد ہلاک ہوئے۔ امریکی تاریخ کا سب سے بڑا
زلزلہ 1471ء میں ہیرو میں آیا تھا۔ مگر اس کی
تفصیلات نہیں ملتیں۔ 26 جنوری 1531ء میں
پرتگال کے علاقے لسمین میں زلزلے سے تیس ہزار
افراد ہلاک ہوئے۔ تاریخ کا دوسرا بڑا زلزلہ 23
جنوری 1556ء کو شاگسی (چین) میں آیا، جس
سے 8 لاکھ تیس ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ نومبر
1667 میں شکھا (آذربائیجان) 80 ہزار
افراد زلزلے سے جاں بحق ہوئے 17 اگست
1668ء میں اناطولیہ (ترکی) میں زلزلے سے
8 ہزار افراد لقمہ اجل بنے۔

اٹھارہویں صدی میں تقریباً 13 بڑے زلزلے

1908ء میں تاریخ کے بدترین زلزلوں میں سے ایک زلزلہ اٹلی میں آیا تھا جس میں ایک لاکھ 60 ہزار افراد ہلاک ہوئے۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں 1918ء میں پورٹوریکو (براعظم امریکہ) میں 116 افراد کی ہلاکت ہوئی۔ 1920ء میں تاریخ کا نواں بڑا زلزلہ آیا جس میں چین کے علاقہ تگشیر اور کنسو کے 2 لاکھ افراد لقمہ اجل بنے۔ اس زلزلے کی شدت 8.6 مسکنیو ڈتھی۔ 1923 میں جاپان میں زلزلے سے ایک لاکھ 43 ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ 1927 میں کیلیفورنیا میں زلزلے سے 13 اموات ہوئیں۔ مگر 1927 میں دو بڑے زلزلے بھی آئے جس سے جاپان کے 3 ہزار اور چین کے دو لاکھ افراد ہلاک ہوئے۔

1931ء میں نیوزی لینڈ سے 258 افراد کی جانیں ضائع ہوئیں۔ 1932ء اور 1933ء کا سال دوبارہ چین اور جاپان کے لئے برا ثابت ہوا جس میں وہ زلزلوں سے چین کے 70 ہزار اور جاپان کے تقریباً 3 ہزار افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ 1933 میں ہی کیلیفورنیا میں معمولی شدت کے زلزلے سے 115 افراد موت کا شکار ہوئے۔ 1934 میں ہندوستان کے صوبہ بہار میں زلزلے سے 13 ہزار افراد لقمہ اجل بنے۔ 1935 میں تائیوان میں زلزلے سے 3279 افراد ہلاک ہوئے۔ 1935 میں پاکستان کے شہر کوئٹہ میں تباہ کن زلزلہ آیا جس سے کوئٹہ شہر بڑی طرح تباہ ہو گیا۔ یہ زلزلہ 7.8 مسکنیو ڈ کی شدت کا تھا جس سے مستونج، لورالائی قلات کے پشین اور چمن کے علاقے بھی متاثر ہوئے تھے۔ زلزلہ کا مرکز چمن فالٹ کا مقام تھا۔ اس زلزلے نے 30 سیکنڈ میں پورے شہر کو ملیا میٹ کر کے رکھ دیا اس زلزلے سے

اور 4 جنوری 1867ء میں کیلیفورنیا میں ایک فرد ہلاک ہوا۔ اسی سال اٹلی میں زلزلہ سے 11 ہزار افراد ہلاک ہو گئے تھے۔ 1868ء میں ہوائی (امریکہ) میں زلزلے سے 77 اور کیلیفورنیا میں 30 ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ 1872ء کیلیفورنیا (امریکہ) میں 27، 1888ء کیلیفورنیا (امریکہ) میں 60 اور 1892ء کیلیفورنیا میں ایک فرد ہلاک ہوا۔ اس کے علاوہ جاپان کے علاقے مینو۔ اوواری Owari-Mino میں 1891ء کے دوران زلزلے سے 7273 افراد ہلاک ہوئے اور آسام (انڈیا) میں 1897ء میں زلزلہ سے ڈیڑھ ہزار افراد جاں بحق ہوئے۔ اسی صدی میں امریکہ میں 17 مزید زلزلے بھی آئے جن کی شدت کا اندازہ ماہرین نے 6 سے 8 مسکنیو ڈ کے درمیان لگایا ہے اور ایسٹ انڈیز (انڈونیشیا) میں 2 زلزلے آئے مگر کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ برصغیر میں بھی اس صدی کے دوران 5 بڑے زلزلے آئے۔ 1819 میں پنجاب، اور کچھ Kutch کے مقام پر 32 ہزار افراد زلزلے کا شکار ہوئے۔ 1838 میں خیال میں زلزلہ آیا جس سے 2 ہزار اموات ہوئیں۔ کشمیر میں 1885ء میں تین ہزار افراد ہلاک ہوئے اور آسام میں ڈھائی ہزار افراد 1897ء میں لقمہ اجل بنے۔ 1827ء میں لاہور میں زلزلے سے ایک ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ 1827ء سے 1931ء تک بلوچستان میں 9 زلزلے آئے لیکن ان کی تفصیل نہیں ملتی۔

بیسویں صدی کا پہلا بڑا زلزلہ ہالیوڈ پٹی پر کاغذہ کے مقام پر آیا جس میں 20 ہزار افراد لقمہ اجل بنے۔ 1909ء میں 3 زلزلے آئے جس میں کولمبیا اور ایکواڈور کے ایک ہزار، سان فرانسسکو کے تین ہزار چلی میں 20 ہزار افراد کی جانیں گئیں۔

(امریکہ) میں زلزلے سے 66 ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ اسی سال بھڑوچ (انڈیا) کے مقام پر زلزلے میں 90 افراد جاں بحق ہوئے۔ 1971 میں کیلیفورنیا میں زلزلے سے 65 افراد ہلاک ہوئے۔ 1974 میں پاکستان کے علاقے مالاکنڈ اور تہن میں زلزلے سے کل 6 ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ 1975 میں چین کے علاقے ہائی چنگ میں زلزلے سے 10 ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ اسی سال جریمہ ہوائی میں اس سے زیادہ شدت کے زلزلے نے صرف 2 افراد کی جانیں لی۔ 1976 میں گوئے مالا میں زلزلے سے 23 ہزار افراد جاں بحق ہوئے۔ اسی سال تانگ شان (چین) میں آنے والے تباہ کن زلزلے سے اندازاً 6 لاکھ 55 ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ یہ تاریخ کا تیسرا بڑا زلزلہ تھا۔ 1977 کے دوران رومانیہ میں زلزلے سے پندرہ سو افراد لقمہ اجل بنے۔ 1980 میں نیپال میں زلزلے سے 1500 افراد ہلاک ہوئے۔ 1981 میں گلگت میں زلزلے سے 220 افراد کی جانیں ضائع ہوئیں۔ 1983 میں امریکہ کے علاقہ رہو میں 2 افراد زلزلے سے جاں بحق ہوئے۔ اسی سال پاکستان کے شمالی علاقے میں زلزلے سے 14 افراد ہلاک ہوئے۔ 1984 میں بھارت کے علاقے کاچھر میں زلزلے سے 500 افراد ہلاک ہوئے اور 1985 پاکستان میں سوات و چترال میں زلزلے سے 5 اموات ہوئیں۔ 1985 میں میکسیکو (امریکہ) میں زلزلے سے 9 ہزار 5 سو افراد ہلاک ہوئے۔ 1987 میں کیلیفورنیا میں 8 افراد زلزلے سے جاں بحق ہوئے۔ 1988 میں آرمینیا (ترکی) میں 25 ہزار افراد زلزلے کے باعث ہلاک ہوئے۔ 1989 کیلیفورنیا میں زلزلے سے 63 افراد کی جانیں گئیں۔

ہونے والی اموات کی تعداد اندازاً 60 ہزار تک بتائی جاتی ہے۔ 1939 میں ترکی میں زلزلے سے 32 ہزار 7 سو افراد کی جانیں گئیں۔ 1940 میں کیلیفورنیا میں غیر معمولی یعنی 7.1 شدت کے زلزلے سے صرف 9 افراد ہلاک ہوئے۔ 1944ء میں جاپان میں زلزلہ آیا جس سے 1223 افراد کی ہلاکتیں نوٹ ہوئیں اس زلزلے کا اندازہ ریکٹر اسکیل پر 8.1 لگایا گیا ہے۔ 1945 میں مکران کے ساحلی علاقوں میں سمندری زلزلہ سونامی آیا جس کے باعث اٹھنے والی سمندری لہریں کراچی ممبئی اور کچھ تک گئیں۔ مغربی محقق سینچ رے کی کتاب "ورلڈ ویب آف نیچرل ہیزرڈ" کے مطابق اس سونامی سے کل 4 ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ 1946 میں تین زلزلے آلاسکا ڈومنین اور جاپان میں آئے۔ جس سے تقریباً 1600 افراد ہلاک ہوئے۔ 1949ء میں واشنگٹن میں زلزلے سے صرف 8 افراد موت کا شکار بنے۔ 1950 میں امریکہ، یونان اور منگولیا میں معمولی شدت کے 6 زلزلے آئے۔ جس میں یونان کے 476 امریکہ کے 48 اور منگولیا کے 30 افراد ہلاک ہوئے۔ 1960ء کے دوران مراکش میں زلزلے سے 10 ہزار افراد لقمہ اجل بنے۔ اسی سال چلی میں زلزلے سے 5700 افراد کی جانیں ضائع ہوئیں۔ 1964 میں آلاسکا (امریکہ) میں 9.2 شدت کا زلزلہ آیا لیکن صرف 125 افراد ہلاک ہوئے۔ جاپان میں اسی سال زلزلے سے 26 افراد ہلاک ہوئے۔ 1967 میں واشنگٹن میں زلزلے سے 7 افراد کی جانیں گئیں۔ اسی سال ہندوستان کے علاقے کوپانا میں زلزلے سے 900 افراد ہلاک ہوئے۔ 1969ء میں کیلیفورنیا میں زلزلے سے ایک فرد کی جان ضائع ہوئی۔ 1970 میں بھارت

زٹرلے سے ایک ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ اسی سال
الجزیرہ میں بھی زٹرلہ آیا تھا جس سے 2266 اموات
ہوئیں۔ 2002 میں پاکستان کے شہر گلگت میں
3 زٹرلے آئے جس سے کل 41 افراد ہلاک
ہوئے۔ 2003 میں کیلیفورنیا میں آنے والے
زٹرلے سے 2 افراد ہلاک ہوئے۔ اسی سال ایران
میں زٹرلے سے 31 ہزار افراد لقمہ اجل بنے۔
2004 میں جاپان، تیمور (انڈونیشیا) ڈومینیکا اور
کوسٹاریکا (امریکہ) میں معمولی شدت کے زٹرلے
آئے جس سے کل 61 افراد ہلاک ہوئے۔ اسی
سال مراکش میں بھی زٹرلے سے 500 افراد ہلاک
ہوئے۔ 2004ء میں سب سے بڑی تباہی 26
دسمبر کو انڈونیشیا کی ریاست سائر میں زیر سمندر
زٹرلے سونامی سے آئی۔ جس سے اٹھنے والی لہریں
انڈونیشیا، ملائیشیا، بنگلہ دیش، بھارت، تھائی لینڈ،
سری لنکا، مینار (برما) مالدیپ، صومالیہ، کینیا،
ترالیہ، سیٹلو (مدغاسکر) اور جنوبی افریقہ تک گئیں۔
اس تباہی سے ہونے والی اموات 5 لاکھ سے زائد
ہیں۔ جبکہ سرکاری طور پر ہلاکتوں کا اندازہ 2 لاکھ
83 ہزار ایک سو چھ لگایا گیا ہے۔ 2005 میں
انڈونیشیا میں زٹرلے سے 1313 افراد ہلاک
ہوئے۔ اسی سال ایران میں زٹرلہ آیا جس میں
790 افراد لقمہ اجل بنے جبکہ جاپان میں ایک اور
چلی میں گیارہ افراد اسی سال زٹرلے سے جاں بحق
ہوئے۔ 18 اکتوبر 2005 کو اب تک کا شدید ترین
زٹرلہ پاکستان کے شمالی علاقہ میں آیا ریکٹر اسکیل پر
اس کی شدت 7.6 تھی۔ اس زٹرلے سے کشمیر،
اسلام آباد، بالاکوٹ، مانسہرہ، ہزارہ سمیت بہت
سے چھوٹے بڑے دیہاتوں اور قصبوں کو شدید
نقصان پہنچا ہے۔

1990 میں ایران میں زبردست زٹرلہ آیا جس
سے 35 ہزار (بعض اندازوں کے مطابق
50 ہزار) افراد ہلاک ہوئے۔ 1991 میں
ہندوکش سے افغانستان تک زٹرلے میں
500 افراد ہلاک ہوئے اسی سال بھارت کے
علاقے اتر کاشی (بنارس) میں زٹرلے سے 3 ہزار
جائیں ضائع ہوئیں اور کیلیفورنیا میں آنے والے
زٹرلے سے 3 افراد لقمہ اجل بنے۔ 1993 میں
بھارت میں اثر کے مقام پر زٹرلے سے 9748
افراد ہلاک ہوئے۔ 1994 کیلیفورنیا میں زٹرلے
سے 60 افراد لقمہ اجل بنے۔ ایک زٹرلہ بولیویہ میں
بھی آیا اور 5 افراد ہلاک ہوئے۔ 1995 میں
جاپان کے علاقے کو بے میں آنے والے
زٹرلے سے 5582 افراد ہلاک ہوئے۔ 1997
میں بھارت کے علاقے بے پور اور جبل پور میں
زٹرلہ آیا۔ اسی سال پاکستان کے صوبہ بلوچستان میں
بھی زٹرلہ آیا اور ہلاک ہونے والوں کی کل تعداد
تقریباً ایک ہزار تھی 1998 میں نیو کینیا میں زٹرلہ
سے 2183 افراد لقمہ اجل بنے۔ 1999 میں 4
بڑے زٹرلے آئے جس میں کولمبیا کے 1185،
ترکی کے 17118، تائیوان کے 2400 اور ترکی
ہی کے 895 افراد ہلاک ہوئے۔ 1999 ہی میں
بھارت کے علاقے چولی میں زٹرلے سے ایک
ہزار افراد ہلاک ہوئے۔

26 جنوری 2001 میں بھارت کے علاقے
گجرات میں زبردست قسم کا زٹرلہ آیا جس کی شدت
ریکٹر اسکیل پر 7.7 تھی۔ اس زٹرلے کی شدت
پاکستان میں بھی محسوس کی گئی۔ اس زٹرلے سے
بھارت کے 25 ہزار اور پاکستان کے کل 20 افراد
ہلاک ہوئے۔ اسی سال ہیرو میں زٹرلے سے 75
افراد جاں بحق ہوئے۔ 2002 میں افغانستان میں



گھر تو آخر اپنا ہے

درخشاں انجم

سارے بلب روشن تھے پچھلے دھڑا دھڑ چل رہے تھے لیکن ان کے چہروں پر خوشی
نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ایسا لگ رہا تھا وہ کوئی جرم کر رہے ہوں۔ ضمیر کچھو کے لگا
رہا تھا کہ قوم کی دولت کا ضیاع ہو رہا ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا کیا کوئی اپنے
گھر کو یوں برباد کرتا ہے؟

بجلی کے بلوں کے ستارے ایک گھرانے کا ماجرا، جو تک آ کر انتہام لینے چلے تھے



چلاتے ہی کیا تھے۔ دو انرجی سیور، دو بکھے، پانی کی
موٹر اس پر اس علاقے میں ہفتوں ہفتوں بجلی کا غائب
ہونا۔ آج ادھر کی تار ٹوٹ گئی کل ادھر کی اس میں آنے
سے پہلے ذرا بھی نہیں اس بات کا علم ہوتا تو یہاں
مکان لینے کی غلطی کبھی نہ کرتے۔ جب ہی انہوں نے

اتنا لبا چوڑا بجلی کا بل دیکھ کر تو جیسے شاہ جی کے
ہوش ہی اڑ گئے۔ یقین تو نہیں آ رہا تھا بار بار بل کے
کاغذ کو الٹ پلٹ کر دیکھتے دیکھتے تسلی نہ ہوئی تو بیگم
کے فرسٹ ایڈ باکس سے میٹنی فائر گلاس لے کر بغور
دیکھنا شروع کیا۔ بلاشبہ یہ ان کا ہی تھا۔ پراتنا زیادہ، وہ

دیکھ کر وہ بھی گنگ سی ہو گئیں۔ ”شاید ہو سکتا ہے اتنے دنوں کے بعد بڑی چھان کر کے تو نیم پلیٹ لگانے کی اجازت ملی تھی کیونکہ اس جگہ کو کلینک کا بورڈ لگا کر کمرشل کروانے کا ارادہ نہیں تھا کہ پتہ نہیں حالات کیسے ہوں؟ ہنگامے، فساد، ہڑتالیں تو اس شہر کا معمول بن کر رہ گیا تھا۔ اس کے لیے علیحدہ جگہ کی تلاش جاری تھی۔ بڑی منتوں، سماجیوں کے بعد تو ابھی صرف نیم پلیٹ لگائی ہی تھا اور اس پر یہ افتاد۔

یہ حسرتیں دل میں یونہی پختی کہ ان کا بھی اپنا ذاتی کلینک ہوتا۔ بچپن ہی سے شوق مسیحائی جو سر پہ سوار تھا۔ دسویں کے بعد ہا قاعدہ فرسٹ ایڈ میں داخلے کے لیے آخری حربے کے طور پر بھوک ہڑتال بھی کی اور نہ جانے کس کس طرح سے والد والدہ کو منانے کی کوشش کیں۔ مگر اس تمام جدوجہد کا نتیجہ صفر ہی نکلا۔ لڑکیاں اپنے گھروں ہی میں اچھی لکھتیں ہیں کہتے ہوئے انہوں نے انہیں رخصت کر کے ہی دم لیا۔ خدا نخواستہ ان کے گھروالے کوئی ٹوٹے مرے نہیں تھے زمیندار فیملی سے تعلق تھا بلکہ اس وقت کے رسم و رواج بھی ان کے ہی تھے اتنی ہی تعلیم کے لڑکیوں کے لیے کافی تھی۔

خیر وہ بھی اپنی دھن کی پکی تھیں۔ سسرال آ کر اپنے شوق کی تکمیل شروع کر دیں۔ میاں نے صاف کہہ دیا تم جانو اور تمہارا کام۔ بس ہمارے سارے کام مکمل ہونے چاہئیں۔ ہمارے سے مراد سارے کنبے کا کام تھا۔ اور واقعی انہوں نے زندگی کے پندرہ خوبصورت سال گھر سے لے کر اپنے آپ تک کو ایک کامیاب انسان بنانے میں گزار دیے۔ نہ صبح کی خبر رہی نہ شام کی نہ مہینے کی نہ سال کی۔ اپنے دلکش وجود، نازک مزاج، لطیف احساسات کو اپنی شوق پہ قربان کر کے ایک کامیاب مسیحا کی صورت مسز شاہ کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آئیں تو شاہ جی کو ان کا یہ روپ اچھا نہیں لگا۔ بھلا مرد کب عورت کو اپنے

بجلی سے چلنے والی بہت ساری اشیاء کو ڈبوں میں بند کر کے الماریوں میں لاک کر دیا تھا۔ یہاں آنے کے بعد UPS تو ٹالاعی نہیں گیا تھا۔

عذر سے بل دیکھا تو پتہ چلا کہ کم بجلی استعمال کرنے پر کنڈا استعمال کرنے کے شہبے میں ان پر بجلی کا بل ہزاروں کے حساب سے لاد دیا گیا تھا۔ اب تو وہ تھے اور ان کا غصہ۔ گرجتے برستے پہلے تو اپنے جہازی سائز کچن میں داخل ہوئے جہاں بیگم صلیبہ شام کو آنے والے مہمانوں کے لیے کھانے پکانے میں مصروف تھیں۔ وہ زیادہ ادھر ہی پائی جاتی تھیں۔ یہاں آ کر آرام کا ایک لمحہ بھی جو میسر ہوا ہو لیکن بس کلینک یا کچن۔ کلینک بھی کیا عورتوں کی بیشک کو بنا چھوڑا تھا جس میں محلے بھر کی عورتیں علاج کروانے کم اور ٹینیاں بکھارنے زیادہ آتی تھیں۔ دن میں کم ہی رات کے نوبت کے بعد سے ان کی آمد کا سلسلہ شروع ہوتا۔ کتنا ہی کہا گیا کہ نوبت کے بعد کوئی نہ آئے مگر پھر بھی کوئی نہ کوئی بارہ ایک بجے تک کھکا ہی ملتا۔ اب کیا کیا جاسکتا تھا۔ ان کا تعلق تو ایسے شہر سے تھا جہاں ایک منظم زندگی گزری جاتی تھی ہر چیز کے اصول و ضوابط تھے وہ ہر بات میں شاہ جی کو کوستی رہتیں جنہوں نے ان کی آرام طلب زندگی کو ختم کر کے اس صحرا میں لاپھینکا تھا۔ کیونکہ ان کے خاندان کے زیادہ تر لوگ ادھر ہی رہائش پذیر تھے۔

”کیا ہوا شاہ جی“ انہیں اس طرح گرجتے برستے دیکھا تو سب کچھ چھوڑ کر ان کی طرف مڑیں ”وہ دیکھو..... دیکھو..... یہ کیا ہے؟“ مجھے تو بجلی کا بل نظر آ رہا ہے۔ انہوں نے ان کے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے نہ چاہتے ہوئے بھی بل کی طرف دیکھا ”یہ سب کچھ! تمہارے اس نیم پلیٹ لگانے کا نتیجہ ہے، میرے ہزار منع کرنے کے باوجود بھی تم پر کوئی اثر نہیں ہوا“۔ انہوں نے سارا ملہ ان پر ہی ڈال دیا۔ اب وہ کیا کہیں ایک لمحے کے لیے بل

”میں تو کل واپڈا آفس جاؤں گا۔ ہم نے جلایا ہی کیا ہے صرف دو بلب اور موٹر وہ بھی ہر دوسرے دن صرف 10 منٹ کے لیے۔ انہوں نے ہمارے ساتھ زیادتی کی ہے“ ان کا غصہ کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

”کچھ بھی کر لیں شاہ جی یہ کسی کی نہیں سنتے۔ بہتر ہے آپ قسط کروالیں۔“ ہمدانہ مشورہ دے کر ان کی بات ختم کی۔ ”یا پھر آپ بھی کنڈے استعمال کریں۔“

”توبہ..... توبہ.....“ انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگایا، وہ ہمیشہ ایسے کاموں سے دور رہے، پانچوں وقت کے کچے نمازی تہجد گزار۔ بھلا انہیں ایسی باتیں کہاں زیب دیتیں وہ جدی پشتی رزق حلال طلب کرنے والوں میں سے تھے۔

غصہ بھی ان کا بجا تھا اس مہینے تو وہ سب بجلی کی آنکھ پھولی کی وجہ سے باہر ہی محن میں سوتے رہے تھے وہ تو شکر ہے مکان بلکہ حویلی کہنا زیادہ مناسب ہوگا ہوا کی رہ گزر تھا سورج ڈھلتے ہی محن میں چار پائیاں ڈال دی جاتیں محن کے ایک طرف مٹی زمین پر لیٹوں، چیکو، امرود کے درختوں کے علاوہ لوگن اور دوسرے موکی پھولوں کے پودے ہر موسم میں اپنی بہار دکھاتے رہتے۔ بڑے درخت ٹھنڈی چھاؤں مہیا کرتے۔ ویسے بھی اس ستمبر کی خاص بات ہی تھی کہ دن بھر سورج خواہ آگ برساتا رہا ہو۔ شام ڈھلتے ہی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلنا شروع ہو جاتیں اور سارے دن کی کوفت ختم ہو جاتی۔

خدا خدا کر کے اگلے دن سورج طلوع ہوا اور شاہ جی اپنے روزمرہ کے کاموں سے جلدی جلدی فراغت پا کر واپڈا آفس کو چلے۔ وہ شاہ جی بھی کیا جو جائز کاموں میں بھی دس گھنٹہ سناٹیں۔ ریٹائرمنٹ کے کاغذات جمع کروا دیئے، گریجویٹی کی رقم اور کچھ پرانے مکان کو بیچ کر اپنے بھائی بہنوں کے قریب ہی اپنا اچھا سا مکان خرید لیا۔ اب سارا دن خلیل خان کی طرح قاخہ تو اڑاتے تھے بلکہ بیگم کے پالتو پرندوں

سے بڑھ کر دیکھنا چاہتے ہیں۔ حکم نامہ جاری ہو گیا بس اپنی خواہشوں کے گھوڑے کو لگام دے کر چپ چاپ گھر بیٹھ جاؤ۔ ”ایں کیا کہہ رہے ہیں آپ، اپنی ہستی کو فنا کر کے یہ جو میں نے اتنے ڈپلے میسجی کے حاصل کیے ہیں ان کا کیا ہوگا“ شدت کرب سے ان کا وجود کپکپا اٹھا۔ ”میں نے نہیں کہا تھا یہ سب کچھ کرنے کو، لگا سا جواب ملا.....“ اگر اتنا ہی شوق ہے میسجی کا تو گھر پہ ہی میں سارے انتظامات کروائے دیتا ہوں۔ بس محلے ٹولے کی حد تک، وہ بھی صرف خواتین اور بچوں کے لیے، بورڈ بھی نہیں لگوانا۔ مجھے سارے مکان کو کمرشل بل ادا نہیں کرنا۔ دیکھیں گے پھر کبھی آس پاس کوئی خالی دکان کلینک کے لیے۔“ لا پرواہ سے انداز میں کہتے ہوئے کھسک گئے۔ بہت کہہ سن کر صرف نیم پلیٹ لگانے کی اجازت دی۔ اب جس کا غبار وہ نکال رہے تھے۔

بیگم کو جو سنا تھا سنا کر باہر جو نکلے تو یہاں جگہ جگہ لوگ اسی طرح کے زائندہوں سے متعلق باتیں کرتے ہوئے نالر آئے۔ شاید سب ہی کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔ بیگم کی جان میں جان آئی چلو..... سب ایک ہی کشتی کے مسافر ٹھہرے۔

ادھر شاہ جی کے ہاتھ میں بل دیکھ کر سب ادھر ہی لپکے ”آپ کو کیا ہوا شاہ جی؟“ دل تو چاہا کہہ دیں کہ ”بجلی والوں نے میرا کچھ مر نکال دیا بغیر کسی جرم کے۔“ ”ہم نہ کہتے تھے کہ آپ بھی کنڈا استعمال کریں اور دل کھول کر بجلی چلائیں۔“ کسی نے ان کے ہاتھ سے بل لے کر تاسف سے کہا۔ پھر تو سب اپنی اپنی چھوڑ کر شاہ جی ہی سے افسوس کرنے لگے ”واقعی آپ کو تو کنڈے کے ٹیمپ میں اتنا مل بھیج دیا گیا ہے۔“

شاہ جی کے ساتھ ساتھ سب کو افسوس اسی بات کا تھا۔ انہیں تو کنڈا لگانا بھی نہیں آتا تھا نہ ہی ان کے گھر میں کوئی اور ان کی مدد کرنے والا تھا۔

سارے بلب روشن تھے عکسے دھڑا دھڑ چل رہے تھے لیکن ان کے چہروں پر خوشی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ایسا لگ رہا تھا وہ کوئی جرم کر رہے ہوں۔ ضمیر کچوکے لگا رہا تھا کہ قوم کی دولت کا ضیاع ہو رہا ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا کیا کوئی اپنے گھر کو یوں برباد کرتا ہے؟..... یہ ملک..... یہ شہر تو اپنا ہے اس کی ایک ایک شے کی حفاظت اپنا فرض ہے۔ ان کی آنکھوں میں ندامت تھی۔ تب شاہ جی نے اچانک آگے بڑھ کر کمرے کا سوچ آف کیا۔ یہ کیا ہوا شاہ جی! بیگم جس کا حال بھی تقریباً انہیں جیسا تھا۔ تھوڑا ڈرتے ڈرتے پوچھ بیٹھیں۔

”ہم..... ہم..... اچھا نہیں کر رہے۔ ہم قوم کی امانت کو اتنی بیدردی سے ضائع کر رہے ہیں۔“ شرمندگی سے کہتے ہوئے وہ سارے سوچ آف کرنے لگے۔ اب بیگم بھی ان کے ساتھ تھیں..... صرف دو لائیں چھوڑ کر سب کچھ آف کر دیا یہ سوچتے ہوئے ”گھر کی خاطر سوڈھ بھیلیں گھر تو آخر اپنا ہے۔“

لیکن ان بلوں کا مسئلہ کیسے حل ہوگا؟ انہوں نے بیگم صاحبہ کی آنکھوں میں چھپے سوالوں کو جیسے پڑھ لیا تھا۔ تب ہی کہنے لگے۔ ”اللہ مالک ہے وہ ہمیں بیٹھے بٹھائے رزق فراہم کر رہا ہے نا..... آئندہ بھی دیتا رہے گا۔ اس سے ہمیشہ اچھی امیدیں رکھنی چاہئیں۔“ انہوں نے خلاف معمول بڑے تسلی بھرے انداز میں کہا اور..... پھر کچھ وہاں کے لیے بھی تو ہونا چاہیے، بلوں کی یہ رقوم جن کی جیبوں میں جائے گی کیا ان کی نیکیاں ہمیں نہ ملیں گی؟ یہاں بھی وہ چھوٹا سا لیکچر دینے سے باز نہیں آئے۔ کم از کم ضمیر تو مطمئن ہوگا۔ ہمارے دل میں یہ خلش تو نہیں رہے گی کہ ہم ملک و قوم کی دولت ضائع کر رہے ہیں۔ سوائے صحن کے ساری لائیں آف تھیں مگر ان کے ضمیر مطمئن اور دل روشن تھے۔

سے انہیں چڑھ ہی رہی۔ ان کا بس چلتا تو یہ پرندے اڑاڑا لیتے اور تمام ہرے بھرے درختوں کو کاٹ چھانٹ کر صحن کا سارا حسن ماند کر ڈالتے۔ انہیں موضوعات پر تو سارا ان لیکچر دیتے رہتے۔ ”کنواڈ ان درختوں کو، اڑاڈوان بے زبان پرندوں کو“ ایک حد تک ان کی بات درست بھی تھی لیکن صرف ہندوں کی حد تک۔ درختوں سے کیا صدیں..... ہاں۔ بڑے بڑے سایہ دار پھل دار درخت تھے، نوکرے بھر بھر کر لیموں چیکو وغیرہ کے، پورے خاندان اور محلے والوں کو بانٹے جاتے مگر ساتھ ساتھ لیکچر بھی دیتے رہتے۔

اور اب تو خیر سے دونوں مل کر کوچنگ سنٹر بھی چلانے لگے۔ خود سائنس اور ریاضی کے لیکچر بنے اور باقی بیگم صاحبہ کے حوالے۔ بینک بیلنس بھی اللہ کی رحمت سے کافی تھا۔ ہاں! تو شاہ جی نے آفس میں قدم رکھتے ہی وہ شور شرابہ کیا کہ واپڈا والوں کو ان کی طرف متوجہ ہونا ہی پڑا۔ بہت سارے کاغذات پر حلفیہ بیان دیتے ہوئے لکھا کہ ان کے گھر سوائے دو بلب دو پنچے اور دس منٹ موٹر کے سوا کچھ بھی نہیں چلتا۔ وہ بھی اس علاقے میں صیبا میں تین ہفتے بجلی ہوتی ہی نہیں۔ رات میں وہ ساری گرمیاں باہر صحن میں سوتے ہیں۔ واپسی پر محکمہ بجلی کے دو بندے بھی ساتھ تھے۔ انہوں نے سارے گھر کا جائزہ لیتے ہوئے بجلی سے چلنے والی، کبھی نہ استعمال ہونے والی اشیاء کے نام بھی نوٹ کیے۔ سب کا اندراج کر کے محکمے کو پہنچا دیا۔

پھر ہر چار پانچ ماہ کے بعد کنڈا استعمال کرنے کے لیے صحن میں لہبا چوڑا مل پہنچنے لگا۔ اس روز بھی تقریباً ہفتوں کے بعد بجلی صاحبہ کی آمد ہوئی تو شاہ جی نے غصے سے سارے بلب عکسے آن کر دیئے۔ دھڑ دھڑ سے لیکر باہر صحن گیلری سب کچھ جمعہ نور بن گیا۔ مطلوبہ پونٹ تک پہنچنے کے لیے اس کے علاوہ بھی ہر چیز چلانے کا حکم دے دیا۔ کیونکہ ابھی تو شروعات تھیں۔ 50 پونٹ بھی نہیں ہوا تھا کہاں 200 پونٹ پورے کرنے تھے۔



کاشی چوہان

گھٹن

وہ تو اکثر اندر اسٹور میں جا کر اپنی تسلی کرتی ہی تھی۔ فوراً اٹھی اور اندر چلی گئی۔
 قمیص بازوؤں کے پاس سے کچھ ڈھیلی تھی۔ ابھی وہ پہن کر چیک کر رہی تھی
 اچانک کہیں بجلی گری۔ اس کے ساتھ ہی بارش کی آواز..... بہت تیز آواز اندر
 آنے لگی۔ ”جو گندر با.....“ وہ ابھی اتنا ہی بول پائی تھی کہ.....

ایک عورت کی کہانی جس کے دل پر ایک غلطی کا بوجھ تھا

آج وہ لازمی تھوڑا سا سے نکال کر ”جو گندر باؤ“ کی
 دکان جا کر اپنے کپڑے لے آئے گی۔ کتنے سارے
 دن تک تو وہ سلائی کے کپڑوں میں سے ہنسی
 ”ہا کیوں“ کو جمع کر کے تھیلے میں بھرتی رہی تھی۔

بڑے زور کی برسات لگی ہوئی تھی۔ کوشلیا کے لیے
 آج کا دن ہی بڑا ”عجیب“ ثابت ہوا تھا۔ کتنے دن
 سے وہ اپنی مصروفیت میں سے گھڑی بھر بھی نہ نکال
 سکی تھی۔ وہ ہر روز سلائی فیکٹری جاتے ہوئے سوچتی



آسمان صاف تھا۔ ذرا بھی تو بادل نہ تھے صبح۔ جیسے جیسے سورج ڈوبنے لگا، اپنے ساتھ کالی گھٹائیں بھی لائے لگا۔ چھٹی ہوتے وقت بوندا باندی تھی۔ اور پھر جیسے جیسے وہ جوگندر ہابو کی ٹیلر شاپ تک پہنچی بادل اپنا کام دکھا چکے تھے۔

اُس کی سوتی ساڑی کا سوت برکھا پانی سے تر ہر ہو چکا تھا۔ اُس نے دکان میں قدم رکھا۔ لائٹ نہیں تھی۔ جوگندر موم بتی استری اسٹینڈ پر سجائے لیٹا ہوا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔

”آئیے آئیے“ اُس نے اسٹول اُس کی طرف کھسکایا۔ ”پدھاریے دیوی جی۔“ وہ بیٹھ گئی۔

”باقی لوگ کدھر گئے۔ آج میلہ نظر نہیں آرہا۔“ اُس نے بھائیں بھائیں کرتی دکان دیکھتے پوچھا۔

”موسم ایک دم کھراب ہوئی گوا۔ اور پھر لائٹ بھی چلی گئی۔ سمس (سبھی) موج مستی کے لیے پاس ہوٹل ما چائے کے واسطے نکل گئے۔ کبھی کبھی موقع دینا چاہیے“ جوگندر نے کہا۔

”ہمارے کپڑے سی دیے یا نہیں۔ آپ کو معلوم ہے ہم کتنی مشکل سے سسے نکال کر یہاں آتے ہیں۔“

”بھگوان کی رک پاپا ہے۔ بڑی دُور دُور سے لوگ آتے ہیں۔“ وہ عاجزی سے ہاتھ جوڑتے بولا۔

”لا کر دکھا دیئے نا۔ ہم بہت بے چین ہیں۔ جیسے ہم نے آپ کو بتایا تھا، ویسا ہی ڈیزائن بنایا ہے نا۔“ وہ بچوں کی طرح اُتاوولی ہو کر بولی تھی۔

”ابھی لاتے ہیں۔ بالکل آپ کے بنائے ڈیزائن کے الو سارسیا ہے۔“ جوگندر اندر جا کر اسٹور سے ایک کاغذ کا تھیلا اٹھائے چلا آیا۔

”اب آپ دیکھ لو۔ لائٹ تو جانے کب آئے۔“

پھر بھی ہم ایک اور موم بتی کا پر بندھ کر دیتے ہیں۔“

جوگندر دوبارہ اندر جا کر ایک موم بتی اور لے آیا۔

اُس کا دماغ بڑا آرٹسٹ تھا لیکن سسے نہیں تھا۔ اُس نے ان ٹائیوں کو جمع کر کے اپنے نخیل سے نئے طرز کی قمیصیں متعارف کرانے کی آرزو کی تھی۔ آج صبح وہ اپنے پتی کو بچ بنا کر دیتے ہوئے اپنے دیر سے آنے کا سبب بھی بتا چکی تھی۔ لکشمی اُسے صرف مسکراتا ہوا ہی دیکھتا رہا تھا۔ شادی کے پانچ سال بعد بھی وہ دواؤں ابھی تک ”ماتا پتا“ نہیں بن سکے تھے۔ کیوں کہ کوشلیا جب تک اپنا اور لکشمی کا کھوٹا مضبوط نہ کر دیتی ”سنتان“ کے بارے میں سوچتا بھی نہیں چاہتی تھی۔ لکشمی اگر کبھی اس کی کا تذکرہ کرتا بھی تو کوشلیا ”موٹی والی گیتا“ بن جاتی اور اُسے اس طرح قائل کرتی کہ لکشمی کو پرنام کرتے ہی بنتی۔ وہ اپنی روشن ہونے پیشانی جو آج کل کچھ زیادہ ہی چمکنے لگی تھی سسے پانی کے ننھے ننھے پیدا ہوتے قطرے اپنی شرٹ کے کلف سے پونچھتا، کافی بنانے رسوئی میں چلا جاتا اور کوشلیا اپنے سپنوں کے تاج محل کو چمکاتی چمکاتی کسی اور جہان میں پہنچ جاتی۔

اُس کے نزدیک مرد اور عورت۔ گاڑی کے ایسے پیسے تھے جن کے مضبوط ہونے پر ہی ’پریوار‘ کا تاج اپنے ماتھے پر تھانا زیادہ بہتر تھا۔

روز کی روٹین کے مطابق وہ انھی، جلدی جلدی فیکٹری جانے کے لیے تیاری کی۔ خاکی سوتی ساڑی پہنے لمبا گردن کو مزید اونچا کرنے کے لیے بالوں کا بھڑا بنایا۔ تیز سرخ رنگ کی لپ اسٹک لگا کر وہ تیار تھی۔ لکشمی نے چائے کا پانی رکھ دیا تھا۔ اُس نے تیار ہو کر تین سینڈوچز بنائے اور بھاجی کو گرم کر کے اسٹیل کی چھوٹی کٹوری میں ڈالا اور لکشمی کا بچا کس تیار کر دیا۔

دواؤں نے بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ اور اپنے اپنے کاموں پر جانے کے لیے نکل گئے۔

☆.....☆.....☆

”بہت دیر کی۔ کہاں رہ گئی تھیں؟“ لکشمین نے اُسے دیکھتے ہی کہا۔ اُس کے ہاتھ میں تولیہ تھا۔ جس سے وہ سر کے بال خشک کر رہا تھا۔ مطلب لکشمین ابھی گھر پہنچا ہے۔ کوشلیا نے دل میں سوچا۔

”جو گندر جی کی طرف گئی تھی۔ آج وعدہ تھا قسمیں دینے کا اُن کا۔“ بہت کوشش کے باوجود وہ نظروں کو چوروں کی طرح ادھر ادھر گھمانے سے باز نہ رکھ سکی۔ آج لکشمین کی نظریں، اُس کے پتی کی نظریں وہ نظریں کہ اُس کا انگ انگ جن کا رکھیل تھا، محفوظ پناہ گاہ اور محبت بھری میٹھی نظریں اُسے اپنے وجود کے آر پار ہوتی محسوس ہوئیں۔ ایک خوف نے کالا ناگ بن کر اُس کے من میں ڈنک مارا وہ سہم کر سٹ سی گئی۔

”ارے واہ! چلو پہن کر دکھاؤ پھر قسمیں۔ دیکھوں تو کیسی لکھیں گی دلاری بیگم چاہ سے بنی قسمیں میں!“ لکشمین نے معمول کی طرح جیسے وہ روز ہی کرتا تھا اُس کے گالوں پر پیار سے ایک چٹکی بھرتے ہوئے کہا۔

”کھانا پروس دوں پہلے۔ پھر پہن کر دکھاؤں گی قسمیں۔“ کوشلیا نے من من بھر کے قدم رسوئی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

وہ سوچنے لگی اُس نے مزاحمت کیوں نہیں کی۔ شور کیوں نہیں مچایا۔ فوراً ہی ہار کیوں مان لی؟ لکشمین بھی اُس کے پیچھے پیچھے ہی رسوئی میں چلا آیا تھا۔

”طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟“

”آں۔ ہاں ہاں۔ بالکل ٹھیک ہے“ وہ عقب میں سے لکشمین کی آتی ہوئی آواز سے یکدم چونک پڑی۔

”بس مجھے باہر بھی آپ ہی کی چتا ہو رہی تھی۔“ لکشمین نے اُسے ہانہوں میں بھر لیا۔ لکشمین کی گرفت

کوشلیا نے کاغذ کے تھیلے سے قسمیں نکال کر دیکھنا شروع کر دی تھیں۔

”جو گندر بابو“ وہ قسموں کو ہاتھ سے ٹٹولتے دیکھ کر بولی۔

”جی جی۔ پسند آئیں۔ ہم نے جی جان سے محنت کی ہے۔“ جو گندر ہاتھ جوڑتے بولا تھا۔

”ہم نے جو ناپ دیا تھا۔ یہ سب آپ نے اُسی الو سار کیا ہے۔ ہم کو کچھ کمی لگ رہی ہے۔“ کوشلیا کا چہرہ جو ابھی کچھ دیر پہلے کھلا ہوا تھا اچانک مرجھا سا گیا۔

”بالکل۔ اُسی ناپ کے الو سار کیا ہے ہم نے۔ آپ کو سک (ٹانک) ہے تو آپ ایسا کرو۔ اندر جا کر چیک کر لو۔“

وہ تو اکثر اندر اسٹور میں جا کر اپنی تسلی کرتی ہی تھی۔ فوراً اٹھی اور اندر چلی گئی۔ قسمیں باؤں کے پاس سے کچھ ڈھیلی تھیں۔ ابھی وہ پہن کر چیک کر رہی رہی تھی اچانک کہیں بجلی گری۔ اس کے ساتھ ہی بارش کی آواز..... بہت تیز آواز اندر آنے لگی۔

”جو گندر بابو.....“ وہ ابھی اتنا ہی بول پائی تھی کہ سامنے والے اندر سے سائے کو پہچان کر لفظ حلق میں ہی دھم سے گرا بیٹھی۔

”ہم یہاں ہیں۔ کہیے کیا کہہ رہی تھیں۔“

”وہ۔ وہ یہاں سے کچھ ڈھیلی ہے قسمیں۔“ وہ ہکھکاتے ہوئے بولی تھی۔

”ابھی ٹھیک کرے دیتے ہیں۔“

جو گندر کے سوئی دھاگہ پکڑنے والے ہاتھ اور پائیدان پر رکھے ہیر۔ تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ باہر موسلا دھار برسات کا زور اور بڑھ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ جب گھر پہنچی تو برسات ختم چکی تھی۔ اُسے لکشمین کی چتا ہو رہی تھی۔ لکشمین دہلیز پر ہی مل گیا۔

”ہیلو!“ اُس نے کہا۔
 ”کرم بابو۔ نمستے۔ کیسے ہیں آپ؟“
 ”اوہ اچھا۔ کیسے کیسے فون کرنا ہوا۔“
 ”ہاں۔ لکشمی تو ابھی آئے ہیں دفتر سے۔“
 ”کیا کہا؟ دفتر گئے ہی نہیں؟ مگر وہ تو..... ابھی آئے ہیں گھر۔“
 ”اچھا.....“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں کرم بابو!“
 ”وہ لڑکی دفتر صرف آج ہی نہیں آئی۔“
 ”اچھا۔ سرویندر باغ میں اُس کے ساتھ لکشمی کو کس نے دیکھا تھا؟“
 ”آپ کا بہت شکریہ کرم بابو کہ آپ نے بتا دیا۔
 ”کبھی آئے نا بھائی کو لے کر ہمارے گھر۔“
 ”جی بالکل۔ گھر گرہستی والا ہی اس نیاے کو سمجھ سکتا ہے۔“

جی اچھا۔ میں اب دیکھ لوں گی۔ نمستے۔“
 اُس نے فون رکھ دیا۔ کرم بابو کی معلومات افزا باتیں سن کر اُس کے رگ و بے میں غم و غصے کی آگ دوڑ گئی تھی۔ وہ طعنائی ہوئی کمرے کی طرف بڑھی، جہاں لکشمی اُس کا انتظار کر رہا تھا۔
 ”جی میں کہوں کہ آج پتی پر میٹھورا تنے مہربان کیوں ہو رہے ہیں۔ اُس نے سوچا۔ لیکن پھر ایک دم اُس کے قدم ٹھک کر رُک گئے۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ بوجھ جو کچھ دیر پہلے اُسے ڈس رہا تھا اب غائب ہو چکا تھا۔ اُس کے ہاتھ اب ناگ نہیں ہاتھ ہی لگ رہے تھے۔ اپنا وجود اُسے مہکتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ مسکرائی اور قمیض تبدیل کرنے واش روم میں داخل ہو گئی۔ وہ بڑبڑا رہی تھی۔
 ”کبھی کبھی موقع دینا چاہیے ورنہ لکشمی بہت بڑھ جاتی ہے۔“

اتنی مضبوط نہ تھی، بہت آسانی سے اُس نے کسما کر خود کو چھڑا لیا تھا۔
 ”کھانا بعد میں کھانا۔ پہلے قمیض تو پہن کر دکھاؤ۔ مجھے بھوک بھی نہیں ہے۔“ لکشمی محبت جتاتے ہوئے بولا۔

”آپ چلیں۔ میں آ رہی ہوں۔“ اُس نے بچھے بچھے لہجے میں کہا۔

”آج آپ جلدی آ گئے؟“
 ”ہاں۔ طبیعت کچھ بوجھل بوجھل تھی۔ سوچا شریعتی جی کے ہاتھ کی چائے پی جائے۔“ لکشمی نے رسوکی کے دروازے پر ہی جے ہوئے کہا۔
 اُسے آج کوشلیا کا رویہ عجیب سا لگ رہا تھا۔
 ”اچھا چائے بھی بتلاؤ اور قمیض بھی پہن آؤ۔ پھر باتیں کریں گے۔“ لکشمی نے اُسے مسکراہٹ بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

اُس نے چائے کا پانی چڑھایا۔ پتی کا ڈبہ ریک میں سے نکالا۔ اُس کے ذہن پر بوجھ تھا۔ شدید بوجھ۔ شدید بے دلی، اکتاہٹ۔ اور وہ خود کو اپنے ہی گھر میں اجنبی محسوس کر رہی تھی۔
 کیا ساری زندگی اس ذہنی بوجھ کا شکار رہے گی؟ اُس نے سوچا۔

یہ ذہنی اذیت جو اُس کے دل و دماغ اُسے پہنچا رہے تھے اب عمر بھر کا مقدر رہے گی؟ اُسے اپنے ہاتھ ناگ، لگ رہے تھے۔ پہنچناتے ہوئے ناگ۔

کیا اب وہ عمر بھر لکشمی کی نظروں کا سامنا نہیں کر پائے گی؟ پانی اُٹنے لگا تھا۔ اُس نے پتی نہر کا دی۔

فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری آواز پر وہ رسوکی سے نکل اور اُس نے فون اٹھالیا۔





نواز خان

نصوم لڑکی

نواز خان

”معصوم لڑکی“

”وہ ایک معصوم اور سادہ دل لڑکی کا متلاشی تھا۔ طویل انتظار کے بعد اُسے ایسی لڑکی مل گئی لیکن.....!“

کے قدم نہیں پڑیں گے اور وہ ایک کنواری زندگی گزار کر اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔ لیکن ایک روز بلال شاہ نے مجھے ان کے بارے میں ایک اہم بات بتائی۔ گرمیوں کے دن تھے وہ جتن اٹھا کر میرے کمرے میں چلا آیا۔ میرے کمرے میں پٹکھا لگا ہوا تھا اور بلال شاہ اکثر بہانے بہانے سے ہوا لینے چلا آتا تھا۔ پہلے تو میں نے یہی سمجھا کہ وہ پسینہ خشک کرنے کے چکر میں آیا ہے لیکن پھر اُس کا چہرہ دیکھ کر اندازہ ہوا کہ کوئی اہم بات بھی اس نے کرنی ہے۔ اُس کے چہرے پر سرخی تھی اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں چغل خوروں کی سی چمک تھی۔ کہنے لگا ”خان صاحب! کچھ دنوں سے میں ایک عجیب بات محسوس کر رہا ہوں۔ پہلے تو میرا خیال تھا کہ شاید مجھے غلط فہمی ہو رہی ہے لیکن اب شک شبہ یقین میں بدلتا جا رہا ہے۔“ میں نے کہا ”کہیں تیری گھر والی کا جی پھر سے خراب تو نہیں ہونے لگا۔“ ”نہیں خاں صاحب“ وہ سر جھٹک کر بولا ”آپ کو تو بس ایک بات سوچتی ہے۔ میں کچھ اور کہہ

یہ کہانی دلچسپ انداز میں شروع ہوئی میں امرتسر کے ایک دیہان علاقے میں کام کر رہا تھا۔ گاؤں کا نام جاٹڑی پورا تھا۔ یہاں کے ماسٹر ریاض صاحب بڑی جانی پہچانی شخصیت تھے۔ عمر پچاس پچپن کے قریب تھی تاہم صحت اچھی تھی روز صبح ورزش کرتے تھے۔ بکے نمازی اور خدا ترس شخص تھے۔ گاؤں میں ہر کوئی اُن کا نام عزت سے لیتا تھا۔ ماسٹر صاحب میں اگر کوئی خامی تھی تو اتنی کہ انہوں نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ جوانی میں انہیں اپنی پھوپھی زاد کے ساتھ عشق ہوا تھا۔ پھوپھی زاد کی شادی کہیں اور ہو گئی۔ ماسٹر صاحب نے عمر بھر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ خاندان کی کئی دوسری لڑکیوں نے اُن کی یہ ضد توڑنی چاہی لیکن کسی کو کامیابی نہ ہوئی۔

بہر طور اب ان باتوں کو ایک طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ ماسٹر صاحب کی کنپٹیوں پر سفید بال آچکے تھے اور ان کے طور اطوار سے بزرگوں والی سنجیدگی جھلکنے لگی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اُن کی زندگی ایک ایسی ڈگر پر چل نکلی ہے جس پر آنے والے دنوں میں کسی عورت

میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”نشان اُلٹے تو نہیں تھے کیونکہ سنا ہے ہوائی چیزوں کے پاؤں اُلٹے ہوتے ہیں“۔ وہ بولا ”خاں صاحب! آپ مذاق مت سمجھیں میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ اُس گھر میں کوئی نہ کوئی رہ رہا ہے۔ ابھی کل شام میں نے ماسٹر صاحب کے صحن میں دروازے کے پاس بالوں کا ایک گچھا دیکھا ہے۔ آپ کو پتہ ہی ہے عورتیں کبھی کرنے کے بعد سرے اترے ہوئے بال اُنکلی پر لپیٹ کر گول کرتی ہیں اور کوڑے میں پھینک دیتی ہیں بعض اوقات یہ بال ہوا کی وجہ سے ادھر ادھر چکرانے لگتے ہیں۔ ایسے ہی بال مجھے ماسٹر صاحب کے صحن میں نظر آئے ہیں“۔

میں نے کہا ”یار! مجھے تو لگتا ہے کہ تمہیں کوئی وہم ہو گیا ہے اور اگر وہم نہیں ہے تو کسی طرح اس بات کی تصدیق کر لو۔ اپنی بیوی یا کسی دوسری عورت کو ماسٹر کے گھر میں بھیجو۔ وہ اندر کی ساری بات باہر نکال لائے گی۔“

بلال بولا ”یہی تو مصیبت ہے ماسٹر صاحب کسی کو گھر میں گھسنے ہی نہیں دیتے۔ پہلے انہوں نے کھانا وغیرہ پکانے کے لیے بوڑھی ملازمہ حمیدن رکھی ہوئی تھی۔ حمیدن کو بھی انہوں نے اسی لیے چھٹی دے دی تھی کہ اُس کی وجہ سے عورتوں کا گھر میں آنا جانا تھا۔“ میں نے کہا ”تو پھر خود چلے جاؤ تمہیں وہ کھا تو نہیں جائیں گے۔“

وہ بولا ”خاں صاحب! مجھے تو ڈر لگتا ہے۔ موڈی بندے ہیں کہیں کوئی ایسی ویسی بات کہہ دی تو گھر والی کے سامنے بے عزتی ہو جائے گی۔“ پھر ذرا سوچ کر کہنے لگا، ہاں ایک طریقہ ہے۔ ہمارے صحن میں دھریک کا ایک درخت ہے جو کافی پھیل چکا ہے۔ میں اُس کی چند ایک موٹی موٹی ٹہنیاں کاٹ دیتا ہوں۔ یہ ٹہنیاں ماسٹر صاحب کے صحن میں گریں

رہا ہوں..... ماسٹر ریاض کو تو جانتے ہیں ناں آپ؟ میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ وہ بولا ”پچھلے کچھ دنوں سے ماسٹر صاحب کچھ بدلے بدلے سے ہیں۔ بڑے بن ٹھن کر رہتے ہیں۔ اب تو کبھی کبھی سرمہ بھی لگانے لگے ہیں۔ میں نے کئی بار انہیں خود ہی خود مسکراتے اور گنگناتے دیکھے ہیں۔ میرے پڑوسی ہیں اس لیے اُن کی جتنی خبر مجھے ہے اور کسی کو نہیں ہو سکتی۔ مجھے تو لگتا ہے ماسٹر جی کا کہیں ٹانکا جڑ گیا ہے۔“

میں نے کہا ”اگر جڑ گیا ہے تو اس میں بُرائی کی کون سی بات ہے، بندے کو کسی بھی وقت اپنا جنازہ جائز کرنے کا خیال آ سکتا ہے۔“

وہ بولا ”بہن یہ تو زیادتی ہے ناں جی اس گاؤں میں میرے ہی ساتھ والے گھر میں کوئی چکر چلتا رہے اور مجھے خبر نہ ہو۔ یہ تو چراغ تلے اندھیرے والی بات ہو گئی۔“

میں نے کہا ”تم کہنا چاہتے ہو کہ ماسٹر صاحب اپنے گھر میں کوئی چکر چلا رہے ہیں۔“

”بالکل“ بلال شاہ نے اقرار میں سر ہلایا۔

”وہ تو گھر میں اکیلے رہتے ہیں“ میں نے کہا۔

”لیکن اب اکیلے نہیں ہیں..... مجھے شبہ ہے خاں صاحب کہ اُن کے گھر میں اُن کے علاوہ بھی کوئی رہ رہا ہے۔“

”اس شبہ کی وجہ؟“ میں نے پوچھا۔

”وجہ کوئی نہیں جی، بس یہ میرے دل کی آواز ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ پچھلے ایک ڈیڑھ ہفتے سے ماسٹر صاحب کے گھر میں کوئی ہے۔ آپ کو پتہ ہی ہے کہ ہمارے کوٹھے سے ماسٹر صاحب کے صحن کا کچھ حصہ صاف نظر آتا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا پانچ چھ روز پہلے رات کو بارش ہوئی تھی۔ اگلے دن صبح ماسٹر صاحب کے کچے صحن میں میری نظر پڑی تو وہاں مٹی پر کسی عورت کے قدموں کے نشان نظر آئے۔“

وہ بولا ”کامیاب تو ہوئی ہے لیکن حاصل کچھ نہیں ہوا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ماسٹر صاحب پہلے سے تازہ گئے تھے۔“ میں نے کہا ”بات کیا ہوئی ہے ذرا مکمل کر بتاؤ۔“ وہ کہنے لگا ”کم از کم اس وقت تو ماسٹر صاحب کے گھر میں کوئی دوسرا بندہ نہیں ہے۔ میں نے گھر میں اچھی طرح گھوم پھر کر دیکھا ہے۔ کوئی ایسی نشانی بھی نظر نہیں آئی جس سے اندازہ ہو کہ یہاں کوئی عورت رہ رہی ہے یا رہ رہی تھی۔“

میں نے کہا ”ہوسکتا ہے وہ سچ مچ کوئی ہوائی چیز ہو اگر وہ واقعی کوئی ہوائی شے ہے تو پھر تمہیں اس معاملے میں ٹانگ نہیں اڑانی چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ ماسٹر صاحب کو چھوڑ کر تم پر عاشق ہو جائے.....“

بلال شاہ ہوائی چیزوں سے بہت ڈرتا تھا۔ ذرا گھبرا کر بولا ”میں نے آپ سے بہت دفعہ کہا ہے کہ مجھ سے ایسا مذاق مت کیا کریں کبھی کبھی مذاق میں منہ سے نکالی ہوئی بات سچ بھی ہو جاتی ہے۔“

بات آئی گئی ہو گئی۔ بیس پچیس روز اور گزر گئے۔ بلال شاہ سے اس موضوع پر دوبارہ بات نہیں ہوئی نہ ہی ماسٹر ریاض سے میرا آنا سا منا ہوا۔ یہ مئی کی آخری تاریخیں تھیں۔ ان دنوں جانڈی پورا کے نواح میں پیر مست کا میلہ لگتا تھا۔ یہ بڑا بارونق میلہ ہوتا تھا۔ دُور دراز سے لوگ یہاں پہنچتے تھے۔ بڑا زبردست بازار لگتا تھا اس کے علاوہ کھیل تماشے ناچ گانے سرکس بہت کچھ ہوتا تھا۔ ایسے میلے ٹھیلوں میں اکثر جرائم پیشہ لوگ بھی گھس آتے ہیں۔ مقامی پولیس کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ایسے لوگوں پر نظر رکھے اور امن وامان کو خراب نہ ہونے دے۔

یہ میلے کے آخری دن کا واقعہ ہے۔ میں سادہ لباس میں گشت پر تھا۔ اچانک میری نگاہ ایک شخص پر پڑی۔ وہ منہ دوسری طرف کیے کھڑا تھا۔ مجھے وہ ماسٹر ریاض کی طرح لگا۔ میں چند قدم چل کر بائیں طرف آیا اور

کی۔ ظاہر ہے ماسٹر صاحب خود تو ٹہنیاں اٹھا کر باہر نکالنے سے رہے۔ اس کام کے لیے مجھے ہی اُن کے گھر جانا پڑے گا۔ بات ختم کر کے وہ معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے کہا ”صرف ماسٹر صاحب کے گھر جانے کے لیے تم ایک سایہ دار درخت کٹوا دو گے۔“

وہ مسکرا کر بولا ”اس میں دہرا فائدہ ہے جی، ایک تو ماسٹر صاحب کے گھر جانے کا موقع ملے گا دوسرے میری گھر والی کی ایک بُری عادت بھی چھوٹ جائے گی۔“

میں نے کہا ”تمہارے علاوہ بھی کوئی بُری عادت لگی ہوئی ہے اُسے۔“

”کوئی ایک ہو تو بتاؤں جی۔ وہ بھی خوشگوار موڈ

میں بولا ”اب یہ دھریک والا معاملہ ہی لیں۔ اللہ کی بندی گیارہ بجے ہی چارپائی ڈال کروہاں بیٹھ جاتی ہے۔ ساری دوپہر وہاں گزرتی ہے۔ اب مجھے کہیں آنا جانا ہوتا ہے وہ محن میں ہوتی ہے اس لیے فوراً دیکھ لیتی ہے پھر سوال جواب کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ کہاں جا رہے ہو؟ کیوں جا رہے ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔ نہ دھریک رہے گی اور نہ وہ میری چوکیداری کے لیے وہاں بیٹھے گی..... کیسا ہے؟“ اس نے داد طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”بہت دُور کی سوچتے ہو شاہ جی“ میں نے کہا۔

اگلے روز بلال شاہ نے وہی کیا جو اُس نے کہا تھا میں صبح تھانے کی طرف آتے ہوئے اُس کے گھر کے پاس سے گزرا تو وہ مجھے دھریک کی ایک بلند شاخ پر بیٹھا نظر آیا۔ تھانے آکر میں بلال شاہ کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کوئی دلچسپ خبر لے کر آئے گا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ قریباً بارہ بجے تھانے آیا۔ سخت ٹھکا ہوا اور مایوس نظر آ رہا تھا۔ میں نے پوچھا ”کیا بات ہے؟ تدبیر کامیاب ہوئی۔“

حقوق العباد

شائع ہو گیا ہے

ہمارے انسانیت کی شاہکار دستاویز جس میں

- ▶ جنگ و جدل اور مذہب کے ہاتھوں استحصال انسانیت کب، کیوں اور کیسے ہوا؟
 - ▶ انسان کے ہاتھوں انسان کی تذلیل کب، کیوں اور کیسے ہوئی؟
 - ▶ نظام کائنات کے اندر موجود عدل و مساوات کے رنگارنگ مناظر کو انسان نے کیسے کیسے روپ دیئے؟
 - ▶ حقوق انسانی اور فرائض انسانی کی تشریح و توضیح مذاہب انسانی میں کیا ہے؟
 - ▶ اسلام میں حقوق انسانی کی غرض و غایت اور اس کی انقلابی اصلاحات کیا ہیں؟
 - ▶ دنیائے عالم میں حقوق انسانی کا احترام کیسے، کیوں اور کب پیدا ہوا؟
 - ▶ پاکستان میں حقوق انسانی کی صورتحال کا کیا منظر ہے؟
 - ▶ ان سب سوالات کا جواب آپ کو اس عظیم نمبر میں ملے گا جو سیارہ ڈائجسٹ کی ایک عظیم روایت کا دلکش اور اچھوتا اقدام ہے۔
- قیمت: 160 روپے

سیارہ ڈائجسٹ: 240 مین مارکیٹ ریواڑ گاؤں لاہور۔ فون: 042-37245412

گاؤں ”سلطان کے“ میں جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اب مجھے بلال شاہ کی بات یاد آئی۔ ایک روز اُس نے کہا تھا کہ اُس نے ماسٹر ریاض کو سائیکل پر سوار ”سلطان کے“ کی طرف آتے دیکھا تھا۔

نجانے کیوں مجھے محسوس ہونے لگا کہ ماسٹر ریاض کے کسی اہم راز سے پردہ اٹھنے والا ہے۔ تاہم بان نے میری ہدایات کے مطابق ماسٹر ریاض کا تعاقب کامیابی سے جاری رکھا۔ ہم ایک گھنٹے کے اندر اندر نہر کا ہل پار کر کے سلطان کے گاؤں پہنچ گئے۔ سلطان کے گاؤں سے زیادہ قصبہ کہنا مناسب رہے گا۔ یہاں کچے مکانوں کی نسبت پختہ اور نیم پختہ مکان زیادہ تھے۔ آبادی دو ڈھائی ہزار نفوس سے کم نہیں تھی۔ یہاں ایک چھوٹی سی فروٹ منڈی بھی تھی۔ اس منڈی کے پاس پہنچ کر ماسٹر ریاض اپنی سائیکل سے اتر گیا۔ یہاں ایک طرف رہائشی مکانات بھی تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ماسٹر ریاض انہی مکانات میں سے کسی کے اندر جائے گا۔ منڈی کے ناکے پر بہت سے ریڑھے کھڑے تھے۔ سائیکل پر وہ بھاری بھر کم تھیلے لٹک رہے تھے۔ ظاہر تھا کہ ان میں وہ سامان ہے جو میلے سے خریدا گیا ہے۔ ماسٹر ریاض نے اپنی سائیکل گلی کے پہلے مکان کے سامنے روک کر دو تین مرتبہ گھنٹی بجائی۔ دروازہ کھلا اور گلی میں چلتے بلب کی روشنی میں مجھے کچھ عورت کا ہیولا نظر آیا۔ یقیناً وہ عورت ہی تھی۔ دروازہ کھلنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ عورت ہے۔ ماسٹر ریاض نے سائیکل کے ہینڈل سے بھاری بھر کم تھیلے اُتار کر عورت کو تھمائے۔ پھر سائیکل بغل میں دہائی اور تین چار میٹر حیاں چڑھ کر خود بھی دروازے میں داخل ہو گیا۔

میں نے تیزی سے فیصلہ کیا کہ ماسٹر ریاض کو رستے ہاتھوں پکڑا جائے۔ حوالدار اور تانگہ بان میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے اُن سے کہا

اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ وہ ماسٹر ریاض ہی ہے۔ وہ ایک نیاری والے کی دکان پر کھڑا تھا۔ بڑی جلدی جلدی اُس نے دکاندار سے ایک دو چیزیں خریدیں اور لوگوں کی بھڑ میں شامل ہو گیا۔ ماسٹر ریاض کی خریداری دیکھ کر میرا ہاتھ اُڑی طرح ٹھنکا۔ اس نے جو اشیاء خریدیں وہ زنانہ استعمال کی تھیں۔ میں تمام اشیاء تو ٹھیک سے نہیں دیکھ سکا تھا لیکن سرخ رنگ کا ایک پراندہ اور دوپٹے کو لگانے والی ایک لیس مجھے دُور سے ہی نظر آئی تھی۔ نجانے کیوں میرا دل چاہا کہ ماسٹر ریاض کا پیچھا کروں۔ میں مناسب فاصلہ رکھ کر ماسٹر کے پیچھے چل دیا۔ اُس کی چال ڈھال سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اپنی خریداری مکمل کر چکا ہے اور اب اُسے میلے کی گھاگھی سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ میرا ایک حوالدار بھی میرے ارد گرد موجود تھا۔ میرا انداز دیکھ کر ہمانپ گیا کہ مجھے کوئی مشکوک بندہ نظر آ گیا ہے۔ وہ میرے پیچھے پیچھے چل دیا۔ ہم ماسٹر ریاض کے پیچھے چلتے میلے کی گھاگھی سے باہر نکل آئے۔ سائیکل سٹینڈ سے ماسٹر ریاض نے اپنی سائیکل نکالی اور روانہ ہو گیا۔ قریب ہی ایک تانگہ کھڑا تھا۔ تانگہ بان جاڑی پورا گاؤں ہی کا تھا۔ میں حوالدار کے ساتھ فوراً تانگے میں بیٹھ گیا اور تانگہ بان سے کہا کہ ماسٹر ریاض کا پیچھا کرے تانگہ بان میرے اس حکم پر حیران ہوا تاہم اس نے اپنی حیرت کا اظہار زبان سے نہیں کیا۔

جب ہم سینے سے نکلے شام ہو سنے والی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سورج غروب ہو گیا اور کھیت کھلیاں تاریکی میں ڈوب گئے۔ میں اور حوالدار تانگے کی پچھلی نشست پر بیٹھے تھے لہذا اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ ماسٹر ریاض ہمیں دیکھ سکے گا تاریکی پھیلنے کے بعد تو یہ امکان بالکل ختم ہو گیا تھا۔ ماسٹر ریاض کے رخ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ نہر پار کے

کسی مصور کا حسین خیال ہو۔ اس کے لیے سیاہ بال ایک شانے پر آبشار کی طرح گر رہے تھے اور آنکھوں میں کسی بچے کی سی حیرت اور دہشت تھی۔

میں نے لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ماسٹر ریاض سے کہا 'میرا خیال ہے تمہیں اپنے سوال کا جواب مل گیا ہو گا میں اس لڑکی کے لیے یہاں آیا ہوں۔'

ماسٹر ریاض کا چہرہ ایک دم ہی زرد ہو گیا تھا۔ مجھے لگا جیسے وہ ابھی چکرا کر گر جائے گا۔ لڑکی جلدی سے اندر بھاگ گئی تھی۔ ماسٹر ریاض کچھ دیر خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن الفاظ اُس کی زبان تک نہیں آ رہے تھے۔ پھر اُس نے بولنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور آگے بڑھ کر دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

”آئیے..... انسپکٹر صاحب اندر آجائیے۔“ وہ

حیرت انگیز طور پر ٹھہری ہوئی پرسکون آواز میں بولا۔

میں اُس کے عقب میں چلتا مکان کے برآمدے میں پہنچا اور ایک ٹیبل فین کے سامنے بیٹھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ویسے میں ماسٹر ریاض کی طرف سے پوری طرح ہوشیار تھا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا اور گھبراہٹ کی زیادتی میں میرے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ اس بات سے انکار نہیں کہ وہ شریف تھا لیکن جو شریف گھر میں ایک خوبصورت جوان رکھیل پال سکتا ہے وہ اپنی جان اور عزت بچانے کے لیے کئی بڑا ہریم بھی کر سکتا ہے۔

وہ اپنے پورے وزن کے ساتھ ٹیم پختہ فرش پر گر رہا ہے۔

ماسٹر ریاض لپک کے اندر گیا۔ میں نے اس

افرا تفری سے فائدہ اٹھایا اور خود بھی اندر چلا گیا۔

کمرے کے عین وسط میں ایک میز تھی میز پر وہ دو

تھیلے رکھے تھے جو ماسٹر ریاض میلے سے بھر کر لایا

تھا۔ سرخی پاؤڈر چوڑیاں چمکیلے گہنے پراندے دوپٹے

کہ وہ دونوں یہاں میرا انتظار کریں اور میرے واپس آنے تک یہاں سے نہ جائیں۔ اس کے بعد میں اُس مکان کی طرف بڑھا جہاں چند لمحے پہلے ماسٹر ریاض داخل ہوا تھا میں نے دروازے پر دستک دی۔

”کون ہے؟“ تھوڑی دیر بعد ماسٹر ریاض کی ڈری ڈری آواز آئی۔

”دروازہ کھول دیجی، آپ سے ایک ضروری بات

کرنی ہے“ میں نے بھاری بھر کم آواز میں کہا۔ میں

نے محسوس کیا کہ کوئی دروازے کی جھری میں سے

جھانک کر مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں

دروازے کے بالکل ساتھ لگ گیا تاکہ جھانکنے والا

میری صورت نہ دیکھ سکے۔ میری دوسری دستک پر

ماسٹر ریاض کو دروازہ کھولنا پڑا۔ جونہی ماسٹر ریاض کی

شکل نظر آئی میں نے اسے دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

”کیا بات ہے؟ کون ہو تم؟“ ماسٹر ریاض نے سخت

گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ اُس کے دونوں ہاتھ

میرے سینے پر تھے اور وہ مجھے پیچھے کی طرف دھکیل رہا

تھا۔ پھر اس نے مجھے پہچان لیا اس کے ساتھ ہی اُس

کی بڑی بڑی آنکھوں میں ڈر اور اندیشوں کے گہرے

سائے سمٹ آئے، وہ ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔

میں نے اطمینان سے کہا ”کیا بات ہے میرے

جسم سے کرنت، لگا ہے تمہیں؟“ وہ ہٹکایا ”آ.....“

آپ یہاں انسپکٹر صاحب، لی..... لیکن کس لیے؟“

میں نے اس کی آواز کو دہرے دہرے کر کے دہرایا۔

میں نے اس کی جھکی ہوئی آنکھوں میں دیکھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

ہوئی اور اس نے کراہ کر آنکھیں کھول دیں۔ ماسٹر ریاض صراحی میں سے ٹھنڈا پانی لے کر آیا اور گلہاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ چند گھونٹ لینے کے بعد لڑکی کے حواس بحال ہوئے اس نے ایک اجنبی مرد کے سامنے اپنے جسم کو سمیٹنا اور ڈھانپنا شروع کر دیا۔

”کک..... کون ہیں یہ؟“ وہ اپنی انگلی میری طرف اٹھا کر خوفزدہ لہجے میں بولی۔ اُس کی آواز بھی اُسی کی طرح نازک اور سریلی تھی۔

”چلو تم اندر چلو“ ماسٹر ریاض سنی اُن سنی کر کے بولا۔ اُس نے شانوں سے تمام کر لڑکی کو اٹھایا اور پھر سہارا دے کر اندر لے گیا۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ بالکل ٹھیک ٹھاک نظر آنے لگی تھی۔ کسی قسم کی بیماری یا کمزوری کے آثار اُس میں نظر نہیں آتے تھے۔

ماسٹر ریاض کو واپس آنے میں چار پانچ منٹ لگ گئے۔ اس دوران میں گھر کا جائزہ لیتا رہا۔ یہ تین چار مرلے کا نیم پختہ مکان تھا۔ دو کمرے ایک برآمدہ اور چھوٹا سامن۔ میں اس وقت برآمدے میں بیٹھا تھا۔ یہاں ٹیبل فین کے سامنے ساتھ ساتھ دو چار پائیاں چمچی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ان چار پائیوں پر ماسٹر ریاض اور تارا نامی اُس لڑکی کو سونا تھا۔ ساتھ ساتھ چمچی ہوئی یہ چار پائیاں مجھے بہت کچھ سمجھا رہی تھی۔

ماسٹر ریاض کمرے سے باہر نکلا تو اس کا چہرہ بجھا بجھا تھا۔ ایک گہری سانس لے کر میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا ”انسپکٹر صاحب! مجھے نہیں معلوم کہ آپ میرے پیچھے کیوں لگے اور کیا سوچ رہے ہیں میرے بارے میں لیکن میں آپ کو جو کچھ بتاؤں گا سچ بتاؤں گا“ شاید آپ میرے گھر پر چھاپہ نہ مارتے تو بھی میں چند روز تک خود تھانے پہنچ کر آپ کو سب کچھ بتا دیتا اور میں یونہی خالی خالی بات نہیں کر رہا۔ جانڈی پورا کے رہنے والے جانتے ہیں کہ میں نے مشکل سے مشکل وقت میں بھی سچ بولا ہے۔“ اس

اور اس کے علاوہ کھانے پینے کی چیزیں، بہت سا سامان نکلا تھا اُن دو تھیلوں میں سے لیکن جس کے لیے یہ سامان الایا گیا تھا وہ فرش پر بے ہوش پڑی تھی، اُس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا مٹھائی والا لفافہ گر گیا تھا اور جلیبیاں دُور تک بکھری ہوئی تھیں۔ ماسٹر ریاض نے جیسے تڑپ کر لڑکی کے شانے تھامے اور اُسے جھنجھوڑنے لگا۔ ”تارا..... تارا“ وہ اُسے پکارتا جا رہا تھا۔ پھر نہایت بے تابی سے اُس نے لڑکی کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ لڑکی کی پتلیاں اوپر چڑھی ہوئی تھیں اور سارا جسم لرز رہا تھا۔ ہونٹ عجیب سے انداز میں بھیج گئے تھے۔

ماسٹر ریاض ہانپتی ہوئی آواز میں بولا ”پھر دورہ پڑ گیا ہے۔“

”کیا پہلے بھی ایسا ہوا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں دو دفعہ ہو چکا ہے۔“

”کیسے ٹھیک ہوئی تھی؟“

”بس خود بخود ہو گئی تھی“ ماسٹر ریاض نے کہا۔ پھر

اُسے شانوں سے تھامتے ہوئے بولا ”آپ اس کی ٹانگیں پکڑیں پچھلے کے سامنے لے چلتے ہیں۔“

ایک طرف سے، میں نے اور دوسری طرف سے ماسٹر ریاض نے اُسے اٹھایا۔ وہ کسی گڑیا ہی کی طرح ہلکی پھلکی اور لچکدار تھی۔ جب میں نے اس کی ٹانگیں پکڑیں میری نگاہ اُس کی ہوتی پر پڑی۔ یہ بالکل نئے فیشن کی جوتی تھی یوں لگتا تھا کہ پہننے والے نے ہوتی کی بجائے کسی چمکی میں پاؤں گھسیڑا ہوا ہے۔ ہم نے اُسے برآمدے میں لا کر پچھلے کے عین سامنے چار پائی پر ڈال دیا۔ قیص اُس کے پیٹ سے اوپر ہوئی تھی۔ دودھیا بدن چاندی کی طرح دک رہا تھا۔ ماسٹر ریاض نے اس کی ہتھیلیاں ملنی شروع کیں جبکہ میں اپنے رومال سے اُس کے تلووں کی مالش کرنے لگا۔ ٹھوڑی دیر بعد اُس کی پلکوں میں لرزش

کوشش کی کہ وہ یہاں تک کیسے پہنچی ہے وہ کچھ بھی بتانے پر تیار نہیں تھی۔ اگر میں زیادہ اصرار کرتا تھا تو رونے لگتی تھی۔ تین چار دن میں ہی وہ مجھ سے اس قدر مانوس ہو گئی کہ میرے لیے اُسے تھوڑی دیر کے لیے اکیلا چھوڑنا مشکل ہو گیا۔ بس وہ بار بار ایک ہی بات کہتی تھی اور اب بھی کہہ رہی ہے میں آپ کے گھر سے باہر نہیں جاؤں گی۔ اگر آپ زبردستی کریں گے تو اُسی وقت جان دے دوں گی۔ اُس کے پاس ایک پڑیا میں تنکھیا ہے۔ پتہ نہیں کہاں سے لیا ہے اُس نے۔ پڑیا کو اپنے لباس کے اندرونی حصے میں چھپا کر رکھتی ہے کہتی ہے کہ فوراً یہ تنکھیا کھالوں گی۔

ماسٹر ریاض کے لب و لہجے میں سچائی جھلک رہی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ لیکن تم تو نادان نہیں تھے۔ تمہیں پتہ ہونا چاہیے تھا کہ یہ کتنا بڑا اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔ بجائے اس کے کہ تم پولیس کو اطلاع کر کے اپنا قانونی فرض پورا کرتے تم نے اسے دس بارہ روز گھر میں چھپائے رکھا اور جب تمہیں خطرہ محسوس ہوا کہ بھید کھل جائے گا تو اسے لے کر یہاں ”سلطان کے“ آگئے اور کرائے کا مکان لے لیا۔

ماسٹر ریاض نے بے بسی سے سر ہلایا ”انسپکٹر نواز! تم سمجھ نہیں رہے ہو کہ میرے لیے کتنی مشکل بنی ہوئی تھی۔ میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ یہ لڑکی وہی کرتی جو کہہ رہی ہے میں نے بتایا ہے ناں کہ یہ جتنی خوبصورت ہے اتنی ہی نادان اور جذباتی بھی ہے۔ تم خود اُس سے بات چیت کر کے دیکھ لو تمہیں پتہ چل جائے گا کہ کیا چیز ہے وہ۔“

میں نے کہا ”بات چیت تو میں کروں گا لیکن تم بھی بتاؤ ناں کہ اُس کے ساتھ کس حیثیت سے رہ رہے ہو؟“

میں نے پہلی بار ماسٹر ریاض کے چہرے پر رنگ ساہراتے دیکھا۔ وہ گہری سانس لے کر بولا ”ابھی

نے جیب سے سفید بے داغ رومال نکال کر گردن اور سینے سے پسینہ پونچھا اور بولا ”اُس لڑکی سے میری پہلی ملاقات کوئی ڈیڑھ مہینہ پہلے ہوئی تھی۔ آپ نے میرا گھر دیکھا ہی ہوا ہے۔ گھر کے پچھواڑے میں کھیت ہیں اور میں نے اس طرف بھی ایک چھوٹا سا دروازہ رکھا ہوا ہے۔ اُس رات تیز آندھی کے بعد بارش ہوئی تھی اور میں چھت سے نیچے کمرے میں آکر سو گیا تھا۔ کوئی دو ڈھائی بجے کا وقت ہوگا۔ اس چھوٹے دروازے پر دستک ہوئی جو کھیتوں کی طرف کھلتا ہے۔ میں نے اُٹھ کر کنڈی اُتاری، میرے سامنے یہی تارانا می لڑکی ہانپتی کانپتی کھڑی تھی۔ جونہی میں نے دروازہ کھولا یہ تیزی سے اندر آگئی اور خود ہی دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ ہاتھ جوڑ کر مجھ سے کہنے لگی کہ میرے پیچھے غنڈے لگے ہوئے ہیں مجھے پناہ دو۔ میں نے کہا ”میں کیسے پناہ دے دوں مجھے کیا معلوم کہ کہاں سے آئی ہو تم اور کون ہو؟“ وہ ہکلا کر بولی ”میں سچ کہتی ہوں کہ سخت مصیبت میں ہوں اگر آپ نے میری مدد نہ کی تو صبح میری لاش کسی کھیت میں پڑی ملے گی۔“

میں نے کہا ”ہاں تمہیں مسجد میں لے جاسکتا ہوں یا امام مسجد کے گھر میں چھوڑ آتا ہوں۔ اس گھر میں میں اکیلا رہتا ہوں اس لیے تمہیں یہاں نہیں رکھ سکتا۔“

ایک دم اُس کی حالت غیر ہونے لگی اور اُسے دورہ پڑ گیا۔ میں بڑی مشکل اور کوشش سے اُسے ہوش میں لایا۔ وہ شکل و صورت سے گجراتی لگتی تھی لیکن لباس پنجابیوں والا تھا اور ٹوٹی پھوٹی پنجابی بھی بول لیتی تھی۔ وہ جتنی خوبصورت، ہے اُس سے زیادہ بھولی اور معصوم ہے۔ اُس کی باتیں سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ اُسے کوئی بھی شخص آسانی سے ورغلا کر اپنے ساتھ لے جاسکتا ہے۔ میں نے اُس کا اتھ پتہ پوچھا اور یہ جاننے کی

لڑکی کو گلی کوچوں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا اور یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں کہ ماسٹر ریاض کی پناہ سے محروم ہو کر وہ خودکشی ہی کر لیتی۔

میں نے وقتی طور پر لڑکی کو اُس کے حال پر چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور ماسٹر ریاض سے کہا کہ وہ اگلے روز تھانے آ کر مجھ سے ملے..... اگلے روز ماسٹر ریاض آیا تو میں نے اسے سمجھایا کہ وہ پیار محبت اور نرمی کے ساتھ تارا سے کچھ اگلوانے کی کوشش کرے اور اس دوران اُن لوگوں سے بھی باخبر رہے جو بقول تارا اُس کا پیچھا کر رہے تھے۔

بلال شاہ اس بات پر بہت خوش تھا کہ اُس کا اندازہ درست ثابت ہوا ہے اور ماسٹر ریاض کے گھر سے پھڑا، نکل آیا ہے۔ مجھے خدشہ تھا کہ وہ اپنی اس ذہانت کا ڈھنڈورا ہر کس و ناکس کے سامنے پیٹ ڈالے گا۔ میں نے اُسے تنہائی میں بٹھا کر اچھی طرح یہ بات سمجھادی کہ فی الحال ماسٹر ریاض اور لڑکی کے بارے میں کسی کو پتہ نہیں چلنا چاہیے۔ یہی بات میں نے اپنے ساتھ جانے والے تانگہ بان اور حوالدار سے بھی کر دی۔

قرباً ایک مہینہ اسی طرح گزر گیا۔ ماسٹر ریاض اکثر جاٹری پورا گاؤں سے غائب رہتا تھا۔ اس نے دوست احباب کو بتا رکھا تھا کہ وہ امرتسر میں اپنی بہن کے گھر رہتا ہے اور اس کی بیٹیوں کو ایف اے کی تیاری کروا رہا ہے۔ سکول میں چونکہ گرمیوں کی چٹمپلیاں نہیں تھیں اس کا بالائی پورا رہتا اور ضروری بھی نہیں تھا۔ ماسٹر ریاض اکثر کچھ سے ملنے آتا رہتا تھا۔ میں نے اُس پر گہری نظر رکھی ہوئی تھی۔ نبھانے کیوں مجھے محسوس ہوتا تھا کہ ماسٹر ریاض ایک زبردست امتحان سے گزر رہا ہے۔ ایک کشمکش سی تھی جس میں وہ دن رات مبتلا رہتا تھا۔ وہ ایک پچاس سالہ کنوارا تھا۔ اب تک زندگی کی رنگینیوں سے بہت دور رہا تھا۔ اُس نے

تک تو کوئی حیثیت نہیں۔“

میں نے کہا ”یہ کیسے ہو سکتا ہے آخر تم نے یہ مکان کرائے پر لیا ہے۔ مالک مکان یا محلے والوں کو کچھ تو بتایا ہوگا کہ یہ لڑکی تمہاری کون ہے۔“

ماسٹر ریاض نے کہا کہ ”لوگوں کی نظر میں تو..... ہم میاں بیوی ہیں۔“

ماسٹر ریاض کے اعتراف کے بعد میں نے لڑکی سے گفتگو کی۔ اُسے دیکھ کر ایک چھوٹی سی ڈری سہی ہوئی چڑیا کا خیال آتا تھا یا پھر کانچ کی ایک نازک گڑیا جو ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ سکتی تھی۔ اُس نے اپنی ساری ڈوریں ماسٹر ریاض کے ہاتھ میں تھما رکھی تھیں اور اُس کی ہر بات پر ”جی جی“ کہتا اُس کی عادت ہو گئی تھی۔ ماسٹر ریاض نے کہا کہ ”برآمدے میں آؤ“ وہ آگئی۔ ماسٹر ریاض نے کہا ”بیٹھ جاؤ“ وہ بیٹھ گئی۔ ماسٹر ریاض نے کہا ”سیدھی ہو کر آرام سے بیٹھو“ وہ سیدھی ہو کر آرام سے بیٹھ گئی۔ وہ بڑی فرمانبرداری سے میرے مختلف سوالوں کے جواب دیتی رہی لیکن جو ٹہنی میں نے پوچھا کہ وہ کہاں سے آ رہا ہے اور اس کے وارث کون ہیں؟ وہ چپ ہو گئی۔ ماسٹر ریاض نے بتایا تھا کہ کوشش کے باوجود اس چپ کو نہیں توڑ سکا اور جب وہ نہیں توڑ سکا تو میں کس گنتی میں تھا۔ ہم اُس پر زیادہ دباؤ بھی نہیں ڈال سکتے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہی مشکل سے

کچھ عجیب سی لڑکی تھی وہ، اور اس کی سس اس سے بھی زیادہ عجیب تھی۔ یوں لگتا تھا کہ یہ شخص ہر کسی سے اس کی سفارش کر رہا ہے اور اس سفارش کی وجہ سے سنگدل شخص بھی اس لڑکی پر بخشنے نہیں کر سکتا۔ کسی حد تک ماسٹر ریاض کی مجبوری بھی میری سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ فطرتاً ایک رحمدل شخص تھا۔ اس کے لیے بے حد مشکل تھا کہ وہ ایک بے سہارا کمزور

یہ فقرہ اُس کی شکست کا اعتراف تھا جس سے ماسٹر ریاض پچھلے تیس برس سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ فقرہ جلد یا بدیر ماسٹر ریاض کے ہونٹوں سے ادا ہونے والا ہے لہذا مجھے یہ فقرہ سن کر زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا ”لیکن ماسٹر ریاض! وہ تو تم سے تیس پینتیس برس چھوٹی ہے۔“

”وہ بولا“ یہ بات میں اُس سے سینکڑوں مرتبہ کہہ چکا ہوں اور وہ باتیں بھی کہہ دی ہیں جو اس وقت تمہارے ذہن میں سر اٹھا رہی ہوں گی، یعنی یہ کہ اُس کا اتہ پتہ کیا ہے، اُس کا ماضی کیا ہے، اس کے والدین کہاں ہیں لیکن وہ مجھے اس کے سوا اور کچھ نہیں بتا رہی کہ وہ مسلمان ہے، اُس کا نام طاہرہ عرف تارا ہے وہ غیر شادی شدہ ہے اور مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔۔۔۔۔“ ماسٹر ریاض نے حسبِ عادت جیب سے سفید رومال نکال کر اپنے چہرے سے پانی پوچھا اور بولا ”انسپکٹر صاحب! آخر میں بھی انسان ہوں اور انسان خطا کا پتلا ہے۔ مجھے خوف آرہا ہے کہ مجھ سے بھی کوئی ایسی خطا نہ ہو جائے جس کی وجہ سے مجھے ساری عمر آنسو بہانے پڑیں۔ اب میرے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ اُس لڑکی سے جان چھڑالوں یا اُس سے شادی کر لوں۔“

میں نے کہا ”ماسٹر ریاض، لڑکی بالغ اور ہوش مند ہے اگر تم سے شادی کرنا چاہتی ہے تو اس سے کہہ دو کہ اس سے اجازت مانگ لے۔ میں تو پھر کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ لیکن میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ ایک بار اس کی اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔“

وہ بولا ”سوچ سمجھ کر ہی بات کی ہے۔“ میں نے اپنی سکراہٹ کو بمشکل ہونٹوں تک آنے سے روکا۔ ماسٹر ریاض جیسا پتھر دل مرد پچاس سال کی عمر میں ایک نازک سی لڑکی کے ہاتھوں چاروں

دھیرے دھیرے اپنی خواہشات کا گلا گھونٹ دیا تھا اور خود کو ایک ایسی ڈگر پر لے گیا تھا جہاں شاید اُسے عورت کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی لیکن اب ایک عورت اُس کی اجاڑ سنان زندگی میں آئی تھی اور عورت بھی ایسی جسے دیکھ کر سو سالہ زاہد خشک بھی توبہ توڑنے پر مجبور ہو جائے۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ لڑکی ایک دھیمی دھیمی آگ کی طرح اُس برف کو پگھلا رہی ہے جو تیس سال سے ماسٹر ریاض کے سینے میں جمی ہوئی تھی۔ ماسٹر ریاض ایک بہت بڑے برفانی تودے کی طرح سخت اور اُس تھا۔ بہت سی جوان اور نو جوان لڑکیوں نے اس تودے کو اپنے شباب کی کرنوں سے پگھلانا چاہا تھا۔ لیکن ناکام رہی تھیں لیکن اب اس تودے کے ”قدم“ اُکھڑ چکے تھے اور وہ گزرنے والے ہردن کے ساتھ پانی بنتا جا رہا تھا۔

میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ بھی ماسٹر ریاض کی سخت جانی تھی کہ وہ بھاپ بن کر اُڑ نہیں گیا تھا ورنہ تارا جیسی حسین لڑکی کے ساتھ ایک تنہا مکان میں رات گزارنا اُس کی چارپائی کے ساتھ چارپائی بچھا کر سونا اور صبح اپنا ایمان سلامت لے کر اُٹھ جانا ممکن ہی نہیں تھا۔ آخر ساون کی ایک بڑی سہانی شام کو ماسٹر ریاض نے ہتھیار ڈال دیے۔ رات سے بارش ہو رہی تھی۔ کھیتوں، کھلیاؤں، گلیوں، مکانوں میں ہر طرف جل جھل نظر آ رہا تھا۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے ماسٹر ریاض پتھری لیے تھانے میں داخل ہوا۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی فیضی دازھی بڑی خوبصورتی سے ترشی ہوئی تھی۔ بال بھی سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔ اُس نے کچھڑ سے نیچے کے لیے گلے بوٹ مہین رکھے تھے۔

میں نے اس کے لیے گرم چائے اور سکٹ وغیرہ منگوائے۔ وہ بہت کھویا کھویا نظر آتا تھا، آنکھوں میں ریت جکے ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک طویل سانس لے کر بولا ”انسپکٹر نواز اس تارا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

کوڑی کو محتاج ہو گئے وہ لوگ۔ میں نے جائیداد کھو کر بھی اپنا حوصلہ نہ کھویا اور اپنی محنت سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ سکول کی زمین میں نے اپنی محنت کی کمائی سے خریدی اور اسی کمائی سے عمارت کھڑی کی۔ اب تک ہزاروں بچے اس سکول سے علم کی روشنی حاصل کر چکے ہیں اور انشاء اللہ ہزاروں آئندہ کریں گے.....“ سگریٹ کو پاؤں تلے مسل کر ماسٹر ریاض نے کہا ”درحقیقت مجھے نجمہ اور خاص طور پر اُس کی ماں سے شدید نفرت ہو چکی تھی۔ دیرے دیرے یہ نفرت میرے اندر جڑ پکڑ گئی مجھے عورت کی چالاکی، ہوشیاری اور دو غلے پن سے گھن آنے لگی۔ اگر مجھے کوئی سیدھی سادی عام عورت بھی ملتی تو میں اُس میں عقلمندی اور چالاکی کے جراثیم ڈھونڈ لیتا اور اُس سے نفرت کرنے لگتا اور میں سچ کہتا ہوں میں نے سیدھی سادی معصوم عورتیں دیکھی بھی بہت کم ہیں۔ جو نظر آتی ہیں وہ اکثر ایسی نہیں ہوتیں۔ عورت فطرتاً خراٹ اور دُور اندیش ہے، مرد عام طور پر جذباتی اور نادان ہوتے ہیں..... میرے من کے مندر میں ایک معصوم اور حد سے زیادہ بھولی بھالی لڑکی کی صورت تھی اور میں اُس کا پجاری ہوں۔“

ماسٹر ریاض بڑے جذباتی انداز میں بول رہا تھا۔ اُس کا گلا رندھ گیا اور آنکھوں میں آنسو چمک اُٹھے۔ وہ کہنے لگا ”میں نے بہت غور کیا ہے اسپیکٹر نواز اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے قدرت کی طرف سے ہو رہا ہے اور اُس کی دین ہے، ورنہ میں اس قابل کہاں تھا کہ تارا جیسی لڑکی مجھ جیسے بڑھے کو پسند کرتی، شادی پر اصرار کرتی، اور شادی نہ ہونے کی صورت میں خودکشی پر کمر بستہ ہو جاتی اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ قدرت نے اب میرے دل میں اُس لڑکی کی محبت ڈال دی ہے۔ میں سچ کہتا ہوں اسپیکٹر! کہ پچھلے تین ماہ میں میں نے اپنے

شانے چت، ہو گیا تھا۔ میں نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے کہا ”ماسٹر ریاض ایک بات تو بتاؤ؟“

”پوچھو“ ماسٹر ریاض نے بھی جوابی طور پر سگریٹ سلا لیا۔

میں نے کہا ”تم نے اپنی ساری جوانی عورت سے دُور رہ کر گزار دی۔ آخر اس کی کوئی توجہ ہوگی“

وہ بولا ”کہانیاں تو لوگوں نے بہت سی کھڑ رکھی ہیں..... لیکن سچی اور مختصر بات یہی ہے کہ میں اپنی پھوپھی زاد سے شادی کرنا چاہتا تھا یہ شادی نہ ہو سکی اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ شادی نہیں کروں گا۔“

”پھر اب کیوں کر رہے ہو؟“

”اس لڑکی میں مجھے وہ بات نظر آگئی ہے جسے دیکھنے کو میری آنکھیں ترس گئی تھیں۔“

”میں کچھ سمجھا نہیں۔“

ماسٹر ریاض نے ایک گہرا کش لے کر کہا ”نجمہ بے حد چالاک، ذہین اور پڑھی لکھی لڑکی تھی اُس کی ماں یعنی میری پھوپھی میں بھی یہ ساری صفات موجود تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نجمہ سے میری شادی نہ ہونے میں صرف زمانے کا قصور نہیں اُس میں نجمہ بھی بڑی حد تک شریک تھی۔ وہ اپنی ماں کے کہے کو حکم کا درجہ دیتی تھی اور اُس کی ماں نے کہہ دیا تھا کہ ریاض جائیداد کا مقدمہ ہار جائے گا اور اُسے اپنے باپ کے ترکے میں سے پھوٹی کوڑی نہیں ملے گی۔ اُس کی ماں بڑی جہاندیدہ عورت تھی۔ اُس نے ٹھیک کہا تھا مجھے جائیداد میں سے پھوٹی کوڑی نہیں ملی لیکن جہاں بہت سوچ سمجھ کر اُس نے بیٹی کی شادی کی وہاں کون سی دودھ کی نہریں بہہ نکلیں۔ نجمہ کا شوہر امرتسر میں کاروبار کرتا تھا۔ اُس کے کارخانے میں آگ، بجھانے والے آلات اور سلنڈر وغیرہ بنتے تھے۔ ایک روز اُسی کارخانے میں آگ لگ گئی۔ لاکھوں کا کاروبار جل کر خاک ہو گیا۔ کوڑی

خدا نے دین اسلام میں تنگی نہیں بلکہ آسانیاں پیدا کی ہیں

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور دینی پیشکش



شائع ہو
گیا ہے

قیمت: 160 روپے

سماجی زندگی کو درپیش چھوٹے چھوٹے

مسائل سے لے کر عبادات کے

بنیادی مسائل تک —

ہر مسئلے کا قرآن و حدیث کی روشنی میں انتہائی آسان الفاظ میں حل

اپنے اقربا کی بکسٹال یا ہا کر سے طلب فرمائیں

سیارہ ڈائجسٹ: 240 مین مارکیٹ

ریواز گارڈن لاہور۔ فون 7245412

تار نے ماسٹر ریاض کا گھر آئینے کی طرح چکا دیا تھا اور اس جگہ گاتے گھر میں وہ کسی رنگین تلی کی مانند لہراتی پھرتی تھی۔ محلے بھر کی عورتیں اُس گھر کی معصوبیت اور سادگی کی گردیدہ تھیں اور ماسٹر ریاض تو جیسے اُس میں کھو کر رہ گیا تھا۔ وہ خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین شخص سمجھ رہا تھا اور ایسا سمجھ کر وہ کوئی غلطی نہیں کر رہا تھا۔ اس عمر میں اتنی خوبصورت خوش اخلاق اور راہوں میں آنکھیں بچھانے والی بیوی کا مل جانا خوش بختی نہیں تو اور کیا تھا۔

بلال شاہ کا جل جل کر اور گڑھ گڑھ کر بُرا حال تھا۔ گھر والی سے اُس کے تعلقات پہلے بھی کچھ اتنے اچھے نہیں تھے اب اور کشیدہ ہو گئے تھے۔ ظاہر ہے اس کی وجہ خوش باش پڑوسی ہی تھے۔ وہ بیوی کو ہر وقت پڑوسیوں کی مثالیں دیتا تھا جواب میں وہ بھی اُسے پڑوسیوں کی مثالیں دیتی تھی کبھی کبھی یہ لفظی جنگ خطرناک صورت اختیار کر جاتی تھی اور بلال کہہ اٹھتا کہ دو تین دن تھانے میں یا مسجد میں سوتا پڑتا تھا۔ وہ سنجیدی۔ رُغور کر رہا تھا کہ ایک اور شادی کر لے۔ اگر ماسٹر ریاض کو اس عمر میں تارا جیسی بیوی مل سکتی تھی تو اُسے بھی کوئی ”درمیانی“ سی ہاتھ لگ سکتی تھی۔ ایک روز مجھ سے کہنے لگا ”خان صاحب! آپ کے سر کی قسم میں بہت..... بہت سنجیدگی سے غور کر رہا ہوں کہ دوسری شادی کر لوں۔ مجھے ذہنی سکون کی ضرورت ہے اور یقین کریں یہ سکون مجھے اس گھر میں نہیں مل سکتا۔ پتہ نہیں کون سا گناہ آگے آیا ہے کہ یہ عورت میرے پلے پڑی ہے۔ نہ شکل نہ عقل، نہ موت، بات کرو تو کھانے کو دوڑتی ہے۔ ہر وقت سر پر دوپٹہ باندھے مُردار کی طرح پڑی رہتی ہے۔“

میں نے کہا ”تم نے پھر بھی اُس میں سے درجن کے قریب بچے پیدا کر لیے ہیں۔“

وہ بُرا سا منہ بنا کر بولا ”بچوں کا کیا ہے جی وہ تو

ساتھ ایک زبردست جنگ لڑی ہے۔ بہت زور مارا ہے لیکن تارا کی محبت کے جال سے کھل نہیں سکا۔“

ایک ہفتے بعد ماسٹر ریاض اور تارا کی شادی نہایت خاموشی اور سادگی سے ہو گئی۔ ماسٹر ریاض کے چند قریبی دوستوں اور عزیزوں نے ہی اس شادی میں شرکت کی۔ اگلے روز ماسٹر ریاض نے چھوٹا سا ولیمہ کر دیا۔ یوں ایک نیا گھر آباد ہو گیا اور ماسٹر ریاض کی خزاں رسیدہ زندگی میں بہار آ گئی۔

میں نے اس شادی کے سلسلے میں ماسٹر ریاض سے ہر طرح کا تعاون کیا تھا۔ دیکھا دیکھی گاؤں کے چند معتبر لوگ، بھی اس تقریب میں پیش پیش نظر آنے لگے تھے لیکن گاؤں کی اکثریت ماسٹر ریاض کو تمسخر اور طنز کی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ لوگوں نے طرح طرح کی باتیں بنائیں۔ کسی نے کہا ”بوڑھا گھوڑا لال لگام“ کوئی بولا ”بٹی سے چھوٹی عمر کی لڑکی سے شادی رچا دی ہے“ کسی نے طعنہ دیا کہ شادی سے پہلے ہی ماسٹر صاحب دل پشوری کر رہے تھے۔ بہر حال سچائی چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے۔ ماسٹر ریاض نے کوئی غلط کام نہیں کیا تھا۔ تارا سے شادی کے لیے اُس نے تمام اخلاقی اور قانونی تقاضے پورے کیے تھے۔ اب ”میاں بیوی“ راضی تھے۔ اس لیے ”قاضی“ نے اور لوگوں نے کیا کرنا تھا۔ دھیرے، دھیرے خود ہی لوگوں کے منہ بند ہو گئے۔ جو چند ایک رہ گئے اُن کے منہ تارا کے حسن اخلاق اور ماسٹر ریاض کی ملنساری نے بند کر دیئے۔

عمروں میں بہت فرق ہونے کے باوجود وہ دونوں ایک مثالی جوڑا نظر آ رہے تھے۔ بلال شاہ چونکہ اُن دواؤں کا ہمسایہ تھا لہذا اس کی زبانی مجھے اکثر ماسٹر ریاض اور تارا کے حالات کا علم ہوتا تھا۔

گائے بھینسوں کے بھی ہو جاتے ہیں اصل چیز ہوتی ہے آپس کی محبت، اور..... اور ڈھنی سکون اب ماسٹر ریاض کو بھی دیکھیں.....“۔

”بسر، بس“ میں نے اُس کی بات کاٹی ”آدمے گھنٹے میں یہ تم دسویں دفعہ ماسٹر ریاض کی مثال دینے لگے ہو۔ بھائی میرے وہ نئی نئی شادی ہے اور پھر دونوں سمجھ دار ہیں تمہارا اُن کا کوئی مقابلہ نہیں۔“

”دونوں سمجھ دار ہیں کیا مطلب؟“ بلال شاہ نے آنکھیں نکالیں ”کیا آپ مجھے بے وقوف سمجھ رہے ہیں۔“ میں نے کہا ”ہیں تمہاری نہیں تمہاری گھر والوں کی بات کر رہا ہوں۔“

بلال شاہ منہ ہٹا کر بولا ”خان صاحب! آپ جان بوجھ کر ایسی بات کرتے ہیں جس کے دو مطلب نکلیں، بہر حال میں نے اپنے دل کی بات آپ کو بتادی ہے، میں بہت سنجیدگی سے دوسری شادی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔“

ڈیڑھ دو ماہ بعد کی بات ہے کہ ایک کیس کے سلسلے میں میرا امرتسر جانا ہوا۔ دوپہر کا وقت تھا بڑا خوشگوار موسم تھا۔ امرتسر مرکزی تھانے جانے کے لیے میں پیدل ہی کہنی بارٹا کے قریب سے گزر رہا تھا۔ دفعتاً ایک عورت پر میری نگاہ پڑی اور میں بُری طرح چونک گیا۔ وہ سیاہ ریشمی برقعے میں لپٹی تیزی سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی سڑک پار کر رہی تھی۔ وہ کوئی نوجوان لڑکی نظر آتی تھی اسے دیکھ کر میرے چونکنے کی وجہ لڑکی کی باریک اونچی ایڑی والی سینڈل تھی۔ اس پھللی نما سینڈل کو میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ چند ماہ پہلے ہیپ ”سلطان کے“ کے مکان میں تارا بے ہوش ہو گئی تھی اور میں نے ماسٹر ریاض کے ساتھ مل کر اُسے بستر پر لٹایا تھا تو اس عجیب و غریب سینڈلوں پر میری نگاہ پڑی تھی پلک جھپکتے میں یہ بات

میرے ذہن میں آئی کہ برقعے میں لپٹی ہوئی لڑکی طاہرہ ریاض ہے۔ اگلا منظر دیکھ کر مجھے پھر چونکنا پڑا۔ طاہرہ عرف تارا سڑک پار کر کے ایک ریسٹوران کے سامنے پہنچی۔ یہاں سرخ و سپید رنگ کا ایک ادھیز عمر شخص کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ تارا کو دیکھ کر اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اُس کے قریب پہنچ کر تارا نے کوئی بات کی۔ وہ مسکرایا اور تارا کو لے کر ریسٹوران کے اندر چلا گیا۔ یہ عام ریسٹوران تھا۔ باہر چولہوں پر بہت سے دیکھے رکھے تھے اور ایک طرف تندور پر گرم گرم روٹیوں کا ڈھیر لگا تھا۔ میں کچھ دیر تذبذب میں ریسٹوران کے سامنے کھڑا رہا پھر محتاط انداز میں آگے بڑھ کر اندر جھانکا۔ میں چونکہ سادہ لباس میں تھا اس لیے کسی نے میری طرف خصوصی توجہ نہیں دی۔ ریسٹوران کے ہال نما کمرے میں بہت سے لوگ دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے لیکن تارا اور ادھیز عمر شخص کہیں دکھائی نہیں دیے۔ پھر میری نگاہ فیملی کیبنوں پر پڑی۔ ایک کیبن کے دروازے پر پردہ جھول رہا تھا۔ پردے کے نیچے سے مجھے کالے برقعے کا کچھ حصہ اور وہی جوتی نظر آئی جس نے مجھے فلک میں جلا کیا تھا۔ تارا اور ادھیز عمر شخص فیملی کیبن میں موجود تھے۔ میں باہر آ کر ایک بس سٹاپ پر کھڑا ہو گیا اور اُن دونوں کے ٹکٹنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ قریباً ایک گھنٹے بعد فارغ ہوئے۔ پہلے ادھیز عمر شخص باہر نکلا اُس نے سڑک کنارے کھڑے ہو کر ایک موٹر رکشا رکوا یا۔ بعد ازاں وہ اندر جا کر تارا کو لے آیا۔ اُسے رکشے میں سوار کرانے کے بعد وہ خود بس سٹاپ کی طرف چلا آیا۔ یہ ایک خوش آئند بات تھی اگر وہ بس پر سوار ہوتا تو اُس کا تعاقب کیا جاسکتا تھا لیکن اچانک بتا بتایا کھیل بگڑ گیا۔ ادھیز عمر شخص نے ایک فیکسی کو ہاتھ دے کر روکا اور اُس میں سوار ہوا ہو گیا۔

جس کے لیے ہمیں دیر تک پچھتانا پڑے۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ میں نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ ماسٹر ریاض کو ابھی کچھ نہ بتاؤں۔ اس مرحلے میں ابھی کچھ بھی یقین سے کہنا مشکل تھا اور جب تک میں خود حتمی نتیجے پر نہ پہنچ جاتا میں ماسٹر ریاض کے آگن میں آئی ہوئی بہار کو خزاں میں بدلنا نہیں چاہتا تھا۔

تارا پر نگاہ رکھنے کے لیے بلال شاہ سے موزوں شخص اور کون ہو سکتا تھا۔ میں نے بلال شاہ کو بلا کر حقیقت حال سے آگاہ کیا اور اُسے کہا کہ وہ تارا کے روزہ مرہ معمولات پر گہری نظر رکھے۔ حالات کی اس تبدیلی سے بلال شاہ کے ارادے بھی کچھ ڈالواں ڈول ہو گئے تھے اور وہ جو دوسری شادی کے سلسلے میں بڑا بڑا جوش نظر آتا تھا کچھ ڈھیر پڑ گیا۔ غالباً سوچنے لگا تھا کہ گھر والی جیسی بھی ہے بھلی مانس اور عزت کی رکھوالی تو ہے۔ یا پھر کوئی اور بات اُس کے ذہن میں آگئی تھی۔

ایک دن بلال شاہ تھانے میں آیا تو جوش سے پھٹا پڑ رہا تھا۔ آتے ساتھ ہی اُس نے بڑے دھڑلے سے سنتری کو دو گلاس ٹھنڈا دودھ لانے کا آرڈر دے دیا۔ اس دیدہ دلیری کا ایک ہی مطلب تھا اُس کے پاس کوئی اہم خبر ہے۔ وہ پہلے تو ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا پھر جب اُس نے دودھ پی لیا اور دودھ میں ڈوبی ہوئی مونچھوں کو اچھی طرح چوس لیا تو اصل موضوع پر آ گیا۔ اُس نے اٹھ کر دفتر کا دروازہ اندر سے بند کیا اور بولا ”خان صاحب! مجھے تو پہلے ہی شک تھا کہ یہ جو اتنی خوبصورت جوان لڑکی کے پکے ہوئے پھل کی طرح ماسٹر کی جھولی میں اُن گری ہے ضرور اس میں کوئی چکر ہے۔ تو بہ..... تو بہ۔ آج اپنی ان گناہ گار آنکھوں سے میں نے جو کچھ دیکھا ہے آپ دیکھتے تو چکر کر رہ جاتے۔ استغفار..... کوئی حد ہوتی ہے بے حیائی اور بے غیرتی کی“ وہ بار بار

اُس روز جاڑی پورا واپس پہنچ کر میں نے تارا کا پتہ کروایا تو وہ گھر میں تھی لیکن یہ بھی پتہ چلا کہ وہ تھوڑی دیر پہلے کہیں سے آئی ہے۔ یہ معلومات مجھے بلال شاہ نے فراہم کی تھیں۔ میں نے بلال شاہ سے کہا کہ وہ مکمل تفصیل معلوم کرے اور پتہ چلائے کہ ماسٹر ریاض آج کہاں تھا اور تارا کہاں سے ہو کر آئی ہے۔ بلال شاہ ایسے کاموں میں بڑی پھرتی دکھایا کرتا تھا۔ اُس نے ایک گھنٹہ کے اندر اندر ساری بات معلوم کر لی۔ اس کی ”تفتیش“ کے مطابق ماسٹر ریاض اپنے سکول میں ایک بڑا جلسہ کر رہا تھا۔ اس جلسے میں وہ ایک صوبائی وزیر کو مہمان خصوصی بنانا چاہتا تھا۔ اسی سلسلے میں وہ لاہور گیا ہوا تھا۔ لاہور جاتے جاتے وہ تارا کو امرتسر میں اپنی بہن صادقہ کے پاس چھوڑ گیا تھا اور اپنے بھانجے کو کہہ گیا تھا کہ اگر وہ اگلے دن سہ پہر تک واپس نہ آ سکا تو وہ اپنی ممانی یعنی تارا کو جاڑی پورا چھوڑ آئے۔ اب تارا اپنے بھانجے کے ساتھ ہی واپس جاڑی پورا پہنچی تھی۔

اس ساری رازداد میں کہیں اُس اُدھیر عمر شخص کا ذکر نہیں تھا جو آج دوپہر کہنی باغ کے سامنے تارا سے ایک ریسٹوران میں ملا تھا اور ایک گھنٹہ تنہائی میں اُس کے ساتھ رہا۔ ایک دم مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے تارا وہ نہیں جو دکھائی دے رہی ہے۔ وہ اپنی بھولی بھالی صورت کا فائدہ اٹھا رہی ہے ورنہ اس کے اندر ایک عورت چھپی ہوئی ہے یہ عورت نظر آنے والی عورت سے بہت مختلف ہے۔

یہ بات تو میرے علاوہ ماسٹر ریاض بھی جانتا تھا..... اور سب لوگ جانتے تھے کہ تارا کا ماضی پردہ راز میں ہے لیکن تارا کی اصلیت اتنی جلدی ظاہر ہو جائے گی کم از کم مجھے اُمید نہیں تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ تارا پر گہری نگاہ رکھی جائے۔ یہ نہ ہو کہ یہ پراسرار لڑکی ماسٹر ریاض کی سادگی سے فائدہ اٹھا کر کوئی ایسا کام کر جائے

ہے۔ اُس میں بچوں کے لیے جھولے وغیرہ لگے ہوتے ہیں۔ تارا اور وہ نوجوان باغیچے میں چلے گئے اور بڑی بے تکلفی سے ہانہوں میں ہانہیں ڈال کر گھومنے لگے۔ میں زیادہ دیر وہاں نہیں رُک سکا مجھے ڈر تھا کہ تارا کی نظر مجھ پر پڑ جائے گی۔ وہ بڑے معشوقانہ انداز میں نوجوان سے ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ اگر رات کا وقت ہوتا تو وہ اُس باغیچے میں نجانے کیا کچھ کر گزرتے۔ میں واپس آ کر فیکسی کار میں بیٹھ گیا۔ قریباً آدھے گھنٹے بعد وہ وہاں سے برآمد ہوئے اور کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ راستے میں ایک مارکیٹ سے انہوں نے کچھ خریداری کی۔ ایک شاپ سے سوڈا واٹر پیا اور بڑی آزادی سے کھڑے باتیں کرتے رہے۔ تارا بالکل بدلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا دہلی یا بمبئی کی کوئی فیشن سیل کا لجنیٹ لڑکی ہے..... ہاں ایک بات میں بتانا بھول ہی گیا نوجوان جس گاڑی پر گھوم رہا تھا اُس پر دہلی کا نمبر تھا..... تھوڑی دیر مارکیٹ میں رکنے کے بعد وہ پھر گاڑی میں سوار ہوئے اور لاری اڈے پہنچ گئے۔ نوجوان نے تارا کو بس میں سوار کرایا۔ جب بس چل پڑی تو وہ بھی گاڑی لے کر روانہ ہو گیا۔ اس کا رخ شہر کے بارونق حصے کی طرف تھا۔ اس مرتبہ اس کا تعاقب کامیابی سے جاری نہ رکھ سکا۔ بڑے ڈاک خانے کے قریب فیکسی کار کو ایک اشارے پر رُکنا پڑا اور نوجوان گاڑی سمیت اوجھل ہو گیا۔

میں نے پوچھا ”تارا اب کہاں ہے؟“
 ”وہ گھر واپس پہنچ چکی ہے۔ ابھی جب میں آیا ہوں تو وہ دوپٹہ کمر سے باندھے آستینیں چڑھائے بڑے زور و شور سے دیواروں کی لیپائی کر رہی تھی۔ میں نے اپنی گھروالی سے کہا کہ پوچھ کر آؤ تارا کہاں گئی ہوئی تھی۔ میری گھروالی نے آکر بتایا کہ اُس کا پاؤں بھاری ہے۔ امرتسر ہسپتال میں ایک لیڈی

اپنے کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔
 میں نے کہا ”کچھ بتاؤ گے بھی یا یونہی سسپنس پیدا کرتے جاؤ گے۔“

وہ بولا ”آج پھر ماسٹر ریاض گھر میں نہیں تھا اور آج پھر وہ کبجری ایک یار سے ملنے نکلی تھی..... آج تو شک ہے کی کوئی گنہائش ہی نہیں رہ گئی ہے جی تو پورا یقین ہو گیا ہے کہ ماسٹر کے گھر کا صفایا کرنے کے ارادے سے یہاں آئی ہوئی ہے۔ جس روز اسے موقع ملا اور لبا مال اس کے ہاتھ لگ گیا وہ ماسٹر کا صفایا کر کے یہاں سے بھاگ جائے گی۔“

”لیکن تم نے دیکھا کیا ہے؟“ میں نے جھنجھلا کر پوچھا۔
 ”اُس بے حیا کے چھن دیکھے ہیں اور کیا“ بلال شاہ نے کہا ”میں نے بتایا ہے ناں کہ ماسٹر ریاض آج گھر میں نہیں تھا وہ کسی دفتری کام سے لاہور گیا ہوا ہے۔ اس کے جانے کے دو گھنٹے بعد تارا ایک سیہلی کے ساتھ گھر سے نکلی۔ اُس کی سیہلی اُسے بس پر چڑھا کر واپس آگئی۔ یہ امرتسر جانے والی بس تھی۔ میں بھی نظر بچا کر بس پر سوار ہو گیا اور منہ سر پیٹ کر ایک کچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تارا امرتسر کے لاری اڈے پر اُتری۔ اڈے کے باہر ایک ہیرو ٹائپ نوجوان چم چم کرتی سرخ گاڑی میں اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اُس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ خوش قسمتی سے پاس ہی ایک فیکسی کار کھڑی تھی۔ میں اللہ کا نام لے کر، اس میں گھس گیا۔ میں نے فیکسی والے پر پولیس کا رعب ڈالا اور اُس سے کہا کہ وہ کار کا پیچھا کرے۔ فیکسی کو زیادہ دیر کار کے پیچھے نہیں بھاگنا پڑا۔ کار والے، نہر کے بڑے پل کے پاس پہنچ کر رُک گئے۔ تارا نے اپنا برقعہ کار کے اندر ہی اتار کر رکھ دیا تھا۔ اس نے بھڑکیلے کپڑے پہن رکھے تھے اور بڑی بنی سنوری نظر آتی تھی۔ آپ نے دیکھا ہوگا نہر کے بڑے پل کے پاس ہی ایک باغیچہ

شاہ کے ساتھ امرتسر روانہ ہو گیا۔

قریباً دو گھنٹے بعد جب ہم امرتسر کے پیراڈائز ہوٹل میں پہنچے لاش موقع سے اٹھائی جا چکی تھی اور مقامی پولیس کے اہلکار جائے واردات کا نقشہ تیار کرنے اور ثبوت اٹھانے میں مصروف تھے۔ مقتول کے کمرے میں اُس کا واحد سوٹ کیس کھلا پڑا تھا۔ اس سوٹ کیس میں روزمرہ کے استعمال کا سامان تھا۔ کپڑے کے چند جوڑے، مومی لفافے میں لپی ہوئی چپل، صابن، تولیہ، ٹارچ اور گولڈن رنگ کی ایک ولایتی تھرماس۔ تفتیش کرنے والے سب انسپکٹر نے مجھے پہچان لیا اور بڑی مروت سے پیش آیا۔ اس نے مجھے تمام ضروری تفصیلات سے آگاہ کیا..... واردات کا پتہ سب سے پہلے ہوٹل کے بیرے بھوشن کمار کو چلا تھا۔ وہ شام سے غسل خانے میں پانی گرنے کی آواز سن رہا تھا۔ اُس نے دروازے پر گئی بار دستک دی لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ پھر یوں ہوا کہ پانی کمرے میں پھیل گیا اور دروازے کی ٹپلی درز سے باہر بہنے لگا۔ اب بھوشن کمار کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ ڈپٹی کیٹ چابی استعمال کر کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اُس نے غسل خانے میں امیت مکر جی نامی نوجوان کی برہنہ لاش دیکھی۔ اُس کے منہ اور ناک سے بہنے والا خون دیکھ کر صاف اندازہ ہوتا تھا کہ اُس کی موت زہر خورانی کے سبب ہوئی ہے۔ لاش اس ڈھنگ سے گری تھی کہ غسل خانے سے پانی کی ٹکاسی کا راستہ جزوی طور پر بند ہو گیا۔ چونکہ شاور کھلا تھا اس لیے پانی پہلے غسل خانے میں جمع ہوتا رہا پھر کمرے کے قالین پر پھیلا اور آخر باہر بہہ نکلا۔

سب انسپکٹر نے بتایا کہ مقتول کی گاڑی نیچے ہوٹل کی پارکنگ میں کھڑی ہے۔ اُس میں سے مقتول کا لائسنس بھی ملا ہے۔ لائسنس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا تعلق صوبہ گجرات سے ہے۔ یہ گاڑی اُس کی اپنی

ڈاکٹر کو دکھانے گئی تھی۔ اس سفید جھوٹ پر میں استغفار پڑھنے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔“

بلال شاہ ویسے تو ڈینگیں مارتا رہتا تھا لیکن جب کوئی قانونی معاملہ ہوتا تھا، وہ اپنی رپورٹ پوری ایمانداری سے دیتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ جو کچھ بتا رہا ہے سچ بتا رہا ہے اور اس ”سچ“ کے بعد شک شبے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی تھی۔ تارا دہرے کردار کی مالک تھی۔ اُس کا اصل روپ اپنے اُس روپ سے بہت مختلف تھا جو وہ ماسٹر ریاض کے سامنے پیش کر رہی تھی۔

ابھی ہم اس معاملے پر غور و فکر کر رہے تھے کہ ایک اور سنگین واقعہ رونما ہو گیا۔ یہ اگلے روز کی بات ہے، صبح سویرے بلال شاہ ایک اخبار تھامے ہانپتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اُس نے تہہ شدہ اخبار میرے سامنے پھینکا اور ایک خبر پر انگلی رکھ دی ”یہ دیکھیں خان صاحب!“ وہ ہراسمہ لہجے میں بولا۔

یہ قتل کی خبر تھی۔ تین کالمی سرخی میں لکھا تھا ”امرتسر کے پیراڈائز ہوٹل میں پراسرار قتل۔ کمرہ نمبر 18 کے غسل خانے میں نامعلوم نوجوان کی لاش پائی گئی۔ لاش کی تصویر بھی ساتھ دی گئی تھی۔ ایسی ایک دو خبریں اخبار میں روزانہ ہوتی تھی۔ مجھے بلال شاہ کی پریشانی سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ سنسنی خیز لہجے میں بولا ”جناب یہی وہ نوجوان ہے جس سے کل تارا ملی ہے۔“

چند لمحے کے لیے میں بھی سنائے میں رہ گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ کوئی بہت گہرا چکر چلا ہوا ہے۔ عین ممکن تھا کہ نوجوان کے قتل میں تارا کا ہاتھ ہو۔ اگر ایسا تھا تو وہ کسی بھی وقت ماسٹر ریاض کے گھر سے اُڑن چھوہ سکتی تھی۔ میں نے فوری طور پر سادہ لباس میں دو پویس والے ماسٹر ریاض کے گھر کی نگرانی پر لگا دیئے اور خود ایک ہیڈ کاشیبل اور بلال

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور فخریہ کاوش

رسولِ اسلامی واقعات

قیمت 175 روپے شائع ہو گیا ہے۔

☆ رسولِ خدا، خلفاءِ راشدین، صحابہ کرام اور صالحین کی قابلِ تقلید زندگیوں سے لیے گئے سنہری واقعات

☆ دورِ نبوت، خلافتِ راشدہ اور تاریخ میں موجود عدل و انصاف کی عظیم روایات

☆ مسلم خواتین کی ذہانت، متانت اور شجاعت کے حیرت انگیز قصے

☆ دورِ جدید میں نئی نسل کے جذبہ ایمانی کو از سر نو تازہ کر دینے والے روح پرور واقعات

☆ ہر مسلم گھرانے کی لائبریری کی زینت، نوجوانوں کے لئے مشعلِ راہ۔ دعاؤں کے ساتھ

سیارہ ڈائجسٹ 240 ریواز گارڈن لاہور۔ فون: 042-7245412

اچانک موت پر سخت حیرت کا اظہار کیا جا رہا تھا۔
ایس ایچ اور رزاق خاں نے کہا ”کچھ لوگ وجہ
آئندہ کے قتل کے ڈانڈے گجراتی فلموں کی ایک
خوبصورت ایکسٹرس شیلٹا ٹنڈن کی گمشدگی سے ملا
رہے ہیں۔ شیلٹا ٹنڈن پانچ چھ ماہ پہلے اچانک غائب
ہو گئی تھی اور ابھی تک اُس کا کچھ پتہ نہیں چلا۔

یہ ذکر سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں
نے رزاق خاں سے اس بارے میں تفصیلات
پوچھیں۔ رزاق خاں نے بتایا۔ پچھلے دنوں یہاں
کے مقامی اخباروں میں شیلٹا کی گمشدگی کا بہت چرچا
رہا ہے۔ یہ نوخیز اداکارہ گجراتی فلموں کے مشہور
ہدایت کار ہمیش رامپوری کی پوتی تھی۔ اُس نے ایک
دو گجراتی فلموں میں بڑے یادگار کردار ادا کیے ہیں
اور بعض لوگ یہ کہتے تھے کہ وہ بہت جلد ممبئی کی ہندی
فلموں تک پہنچ جائے گی لیکن ایک روز اچانک لا پتہ
ہو گئی۔ اُس کے والدین تو فوت ہو چکے ہیں دادا ہی
سرپرست ہے۔ اس نے پوتی کو بہت تلاش
کرایا لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ پچھلے دنوں میں نے
ایک اخبار میں اُس کے بارے میں پڑھا تھا کہ وہ
اپنے کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ ملک سے باہر جا چکی
ہے۔

نجانے کیوں میرا دل گواہی دینے لگا کہ یہی شیلٹا
ٹنڈن وہ لڑکی ہے جو تارا بن کر ماسٹر ریاض کے گھر
میں رہ رہی ہے۔ میں نے رزاق خاں سے کہا ”انسپکٹر
صاحب! میں شیلٹا ٹنڈن کے دادا سے ملنا چاہتا ہوں۔
کیا نام بتایا ہے آپ نے اُس کے دادا کا؟“

”ہمیش رامپوری“ انسپکٹر رزاق نے جواب دیا
لیکن آپ کیوں ملنا چاہتے ہیں اُس سے؟“

میں نے کہا ”میرا خیال ہے انسپکٹر ریاض کہ وجہ
آئندہ کے قتل اور شیلٹا ٹنڈن کی گمشدگی میں واقعی گہرا
رہا ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ اس وقت وہ شخص کہاں

نہیں ہے بلکہ اُس نے دہلی میں اپنے کسی جاننے
والے سے حاصل کی ہے۔ لائسنس پر مقتول کا مکمل
ایڈریس بھی موجود تھا اور پولیس کے لیے قطعی مشکل
نہیں تھا کہ وہ اگلے چند گھنٹوں میں مقتول کے
وارثوں سے رابطہ قائم کر سکتی۔ اس کیس میں میری
ڈپٹی اب عروج پر پہنچ چکی تھی۔ میں نے مقامی ڈی
ایس پی سے مشورہ کیا اور مشورے میں فیصلہ ہوا کہ
اس معاملے کی تحقیق کے لیے میں خود گجرات کے شہر
بڑودہ جاؤں گا۔ لائسنس پوسٹ مارٹم کے مرحلے سے
گزر رہی تھی۔ ٹیلی فون پر مقتول کے وارثوں کو
اطلاع بھی دے دی گئی تھی۔ ایک پولیس پارٹی دہلی
روانہ ہو گئی تاکہ اُس شخص سے پوچھ گچھ کی جائے
جس کی گاڑی پر مقتول امیت امرتسر پہنچا۔ دوسری
پارٹی کے میں ساتھ بڑودہ روانہ ہو گیا۔

امرتسر سے گجرات کے شہر بڑودہ ٹکریل کا ایک
طویل اور کٹھن سفر کرنا پڑتا ہے۔ ہم قریباً 48 گھنٹے
بعد بڑودہ پہنچے۔ بڑودہ کی ایک جانب بھڑوچ اور
دوسری طرف احمد آباد کے مشہور شہر ہیں۔ بڑودہ خود
بھی ایک بارونق اور اہم شہر ہے۔ ہم سب سے پہلے
مقامی تھانے کے ایس ایچ او سے ملے اور اُس سے
اپنا تعارف کرایا۔ اُسے ٹیلی فون پر ہماری آمد کی
اطلاع ہو چکی تھی۔ وہ ہمارے آنے سے پہلے ہی
مقتول کے بارے میں ضروری معلومات بھی حاصل
کر چکا تھا۔ مقتول کا اصل نام امیت نہیں وجے آئندہ
تھا۔ وہ بڑودہ کے ایک مشہور سینما کا مالک تھا اور فلمیں
وغیرہ خریدنے کا کام بھی کرتا تھا۔ وہ قریباً دو ہفتے سے
بڑودہ میں موجود تھا۔ اُس کے دوست احباب کی زبانی
پتہ چلا تھا کہ وہ کاروبار کے سلسلے میں دہلی گیا
ہوا ہے۔ وجے آئندہ کے والدین روتے پیتے امرتسر
کے لیے روانہ ہو چکے تھے اور یہاں بھی وجے آئندہ کی

مل سکتا ہے؟“

انسپکٹر رزاق نے دو تین جگہ ٹیلی فون کیا۔ سادے کاغذ پر ایک دوپٹے لکھے پھر گہری سانس لے کر بولا ”مہیش صاحب اس وقت بڑودہ میں ہی ہیں۔ انہوں نے نہر کنارے ایک محل نما مکان بنا رکھا ہے۔ بعض اوقات فلموں کی شوٹنگ بھی وہاں کرتے ہیں۔ وہ محل دیکھنے کی چیز ہے۔ اس وقت وہ وہیں پر ہیں میرا خیال ہے آپ چلے جائیں ملاقات ہو جائے گی اُن سے۔“

میں نے اُسی وقت انسپکٹر رزاق سے مکمل ایڈریس حاصل کیا اور اُس کے ایک ہیڈ کاشیبل کو ساتھ لے کر ہمیش راپوری کی طرف روانہ ہو گیا۔ عبدالرزاق نے اپنی گاڑی بمی خوش دلی سے میرے استعمال میں دے دی تھی۔ بڑودہ کی چند ایک بھری پری سڑکوں سے گزر کر ہم شفاف پانی والی ایک نہر پر پہنچے۔ یہاں باغات اور بنرے کی کثرت تھی (مالانکہ بڑودہ میں بہت کم سبزہ دیکھنے میں آیا تھا) درختوں کے درمیان ایک بلند و بالا عمارت دیکھ کر ہم ٹھٹھک گئے۔ وہ واقعی کسی محل سے کم نہیں تھی۔ بلند برجیاں، محرابی دروازے، خوبصورت فوارے اور بیلوں سے ڈھکی ہوئی دیواریں، بہت بڑے گیٹ کے سامنے باوردی دربان موجود تھے ایک دربان میرا شناختی کارڈ لے کر اندر گیا اور پانچ منٹ بعد واپس آیا۔ باریابی کی اجازت مل گئی تھی۔ ایک طویل اور خوشنما راستہ طے کر کے ہم عمارت کے اندرونی حصے میں پہنچے۔ یہاں بھی آرائش و زیبائش میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی تھی۔ ایک وسیع کمرے میں بہت بڑے فانوس کے نیچے منقش کرسی پر ایک عمر رسیدہ شخص بیٹھا کوئی موٹی سی کتاب پڑھ رہا تھا۔ ہماری آہٹ سن کر اُس نے اپنا رخ پھیرا۔ میں سکتے میں رہ گیا یہ وہی شخص تھا جو تین چار ہفتے پہلے یہاں سے سینکڑوں

میل دُور امرتسر کے کمپنی باغ کے سامنے ایک معمولی ریسٹوران میں تارا سے ملا تھا اور اُس کے ساتھ ایک گھنٹہ تک ایک کیبن فیملی میں بیٹھا رہا تھا۔ میں اُسے پہچانتا تھا لیکن اُس کے لیے میں اجنبی تھا۔ اب اس بات میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی کہ تارا ہی شیلانڈن ہے۔

”آؤ انسپکٹر“ اُس نے مجھے کرسی پیش کرتے ہوئے کہا ”وَجے آئند کے قتل کی اطلاع مجھے ہو چکی ہے۔ مجھے توقع تھی کہ جلد ہی کسی پولیس اہلکار سے ملاقات ہوگی۔“

”اس نے اپنا چہرہ اتار کر میز پر رکھ دیا اور بولا ”جس بات کا علم تم کو ایک آدھ روز میں ہو جاتا ہے بہتر ہے کہ وہ میں تمہیں ابھی بتا دوں۔ جیسا کہ تمہیں معلوم ہوگا کہ وجے آند ایک سینما کا مالک تھا اور فلم لائن سے اُس کا تھوڑا بہت تعلق موجود تھا۔ پچھلے ڈیڑھ دو برس سے میری پوتی شیلانڈن میں دلچسپی لے رہا تھا اور اُس سے بیاہ کرنا چاہتا تھا۔ میری طرف سے اس سلسلے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ وجے آند سمارٹ اور نوجوان تھا، صاحب جائیداد بھی تھا لیکن شیلانڈن کے بارے میں تذبذب کا شکار تھی..... وہ دُور خلا میں دیکھتے ہوئے بولا ”وہ عجیب لڑکی تھی انسپکٹر انسانوں کی بھیڑ میں سب سے جدا اور انوکھی۔ اُس کے اپنے نظریات اور زندگی گزارنے کا اپنا اسلوب تھا۔ نجانے کیوں کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا تھا کہ اپنے والد کی طرح وہ بھی مجھ سے چھن جائے گی۔ کسی اور دنیا میں جا بے گی اُسے زندگی کی سہولتوں اور آسائشوں سے نفرت تھی۔ بہت مشکل ڈھنگ سے جینا چاہتی تھی وہ۔“

مہیش رام پوری کے چہرے پر دنیا جہان کی اُداسی سمٹ آئی تھی اور آنکھیں جیسے دھندلا سی گئی تھیں۔ اگر مجھے یہ علم نہ ہوتا کہ وہ صرف چند ہفتے پہلے اپنی پوتی سے مل چکا ہے اور کافی وقت اُس کے ساتھ گزار چکا

جائے گا۔ ایک دربان ابھی تک دروازے کے قریب کھڑا تھا۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے کہا کہ وہ باہر چلا جائے۔ دربان خاموشی سے باہر نکل گیا۔ اب میں اور ہمیش ہال نما کمرے میں اکیلے تھے۔ ہمیش نے مجھے پہلی بار غور سے دیکھا اور سرتاپا اچھی طرح گھورا ”تم کو کس نے بھیجا ہے یہاں؟“

”میں خود آیا ہوں“ میں نے اعتماد سے کہا ”مجھے کسی سے ہدایات لینے کی ضرورت نہیں۔“

”تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں امرتسر گیا ہوں یا شیلہ سے ملا ہوں۔“

”میں یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں اور اس بارے میں ٹھوس ثبوت فراہم کر سکتا ہوں۔“

ایک دم ہمیش رامپوری ڈھیلا پڑتا ہوا محسوس ہوا۔ اُس نے عنک اٹھا کر اُس کے شیشے صاف کیے اور اُسے دوبارہ آنکھوں پر جمالیا ”میں تمہارا مکمل تعارف حاصل کر سکتا ہوں“ اُس نے پوچھا مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں نے مکمل تعارف کرا دیا۔ جواب میں اُس نے بھی تفصیل سے اپنے بارے میں بتایا۔ وہ گجراتی فلموں کا سب سے پرانا ہدایت کار تھا اور کئی ایک شہرت یافتہ فلمیں بنا چکا تھا۔ اُس کی عمر ستر سال سے اوپر تھی لیکن اچھی صحت کی وجہ سے بچپن ساٹھ کا نظر آتا تھا۔ شیلہ کا والد اور والدہ ٹریفک کے ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئے تھے اور ہمیش نے شیلہ کو اپنے بچوں کی طرح پالا پوسا اور پروان چڑھایا تھا۔

ہمیش نے میرے لیے چائے اور اپنے لیے بلیک کافی منگوائی۔ کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے وہ بولا انسپکٹر نواز! آج میں تمہیں ایک ایسی بات بتانے جا رہا ہوں جو اب تک صرف میرے اور بھگوان کے درمیان تھی۔ اس بات کا تعلق شیلہ اور اس کی زندگی سے ہے۔ سب سے پہلے تو میں تمہاری ان معلومات کو درست قرار دیتا ہوں کہ میں تیس بچپس روز پہلے

ہے تو میں واقعی اسے ایک ”ڈکھی دادا“ سمجھتا جس کی پوتی چھ ماہ سے لاپتہ ہے اور وہ اُس کی پریشانی کو دل کا روگ بنائے ہوئے ہے۔ وہ اداکاری کر رہا تھا اور اچھی اداکاری کر رہا تھا..... اور کیوں نہ کرتا وہ ایک کہنہ مشق فلم ڈائریکٹر تھا۔

میں نے کہا ”کہیں آپ کی پوتی اس وجہ سے غائب تو نہیں ہوئی کہ آپ اُس کی شادی وجے آنند سے کرنا چاہتے تھے اور وہ اس شادی کے حق میں نہیں تھی۔“

ہمیش رام پوری نے انکار میں سر ہلایا ”ہمارے خاندان میں لڑکیوں کو بچنے کی آزادی ہوتی ہے۔ میرے خیال میں شیلہ کے لاپتہ ہونے میں وجے آنند والے معاملے کا کوئی تعلق نہیں تھا۔“

میں نے کہا ”پھر آپ نے یہ کیوں سوچا کہ وجے کی موت کے بعد پولیس آپ سے رابطہ کرے گی۔“

ہمیش بولا ”فلم لائن میں یہ بات بہت سے لوگوں کو معلوم تھی کہ وجے آنند، شیلہ کو چاہتا ہے اور اُس کو اپنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ظاہر ہے اس حوالے سے پولیس سوچ سکتی ہے کہ شیلہ کی گمشدگی اور وجے کے قتل میں کوئی تعلق نہ ہو۔“

میں نے اچانک پینترا بدلتے ہوئے کہا ”لیکن میرا خیال ہے کہ شیلہ گم نہیں ہوئی۔“

”کیا مطلب؟“ ہمیش نے حیران ہو کر کہا۔

”یہی مطلب ہے کہ وہ گم نہیں ہوئی۔ وہ امرتسر میں ہے اور وہاں طاہرہ ریاض کے نام سے رہ رہی ہے۔“

ہمیش رامپوری کے سر پر جیسے کسی نے دستی بم پھینک دیا تھا۔ وہ حیرت زدہ نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر قدرے سنبھل کر بولا ”لل..... لیکن تمہیں کیسے پتہ چلا؟“

”جیسے آپ کو پتہ چلا اور آپ اُس سے ملنے امرتسر پہنچے۔“ میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ ہمیش کی حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے ابھی دل کا دورہ پڑ

سے بمبئی چلی گئی اور کسی کو بتائے بغیر وہاں کے ایک معروف کلب میں ایک مہینہ ملازمت کر آئی۔ جس ذاتی فلم کا میں تم سے ذکر کر رہا ہوں اس میں شیدا کا کردار ایک ایسی لڑکی کا تھا جو حیدرآباد سے لاہور جا رہی ہے۔ وہ ٹرین میں اپنے وارثوں سے چھڑ جاتی ہے اور بھٹک کر ایک پنجابی سکول ماسٹر کے گھر میں پہنچ جاتی ہے یہ سکول ماسٹر اسے بیٹی بنا لیتا ہے اور اُس کے وارثوں کی تلاش شروع کرتا ہے۔ لڑکی چونکہ بہت نوجوان اور سادہ لوح ہے، اُسے اپنا پتہ تو درکنار اس شہر یا گاؤں کا نام بھی معلوم نہیں جہاں سے وہ آئی ہے۔ وہ ماسٹر کے اپاہج بیٹے سے محبت کرنے لگتی ہے لیکن ماسٹر اس کی شادی بیٹے سے نہیں کرتا کیونکہ وہ سمجھتا ہے اس طرح دنیا والے اس پر اٹھکیاں اٹھائیں گے اور اُسے خود غرض گردانیں گے۔ آخر میں لڑکی خودکشی پر آمادہ ہو جاتی ہے اور یوں ماسٹر کے بیٹے سے اس کی شادی ہو جاتی ہے۔ یہی کردار تھا جسے بہت اچھے طریقے سے ادا کرنے کے لیے اور اپنی اداکاری کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے شیدا نے گجرات سے پنجاب کا رخ کیا اور امرتسر کے ایک سکول ماسٹر کے گھر میں عین اُسی طرح وارد ہوئی جس طرح وہ فلم میں وارد ہوئی۔ اس مقصد کے لیے اُس نے ایک ایسا سکول ماسٹر منتخب کیا تھا جو عمر میں اس کا بزرگ لگتا تھا۔ بس یوں سمجھو کہ وہ اپنے کام کے سلسلے میں خطی سی ہو جاتی تھی اور اس کا یہی خط تھا جسے اُس کے کرداروں کو زندگی بخش دیتا تھا۔ جب اچھ نے امرتسر آنے کا اراد کیا تو میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن جب دیکھا کہ وہ اپنے فیصلے ر مضبوطی سے قائم ہے اور اگر میں نے اُس کا فیصلہ بدلنے کی کوشش جاری رکھی تو وہ فلم میں کام کرنے سے ہی انکار کر دے گی تو اُس کی یہ ”فن کارانہ“ مذکور قبول کر لی۔ شیدا تارا کے روپ میں ماسٹر

امرتسر گیا تھا اور وہاں شیدا سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ دوسری تمہاری یہ اطلاع بھی بالکل درست ہے کہ شیدا امرتسر میں طاہرہ بن کر رہ رہی ہے اور اس نے وہاں ماسٹر ریاض نامی شخص سے شادی کر لی ہے لیکن اس شادی کے پس پردہ کیا حالات ہیں ان کا علم میرے اور شیدا کے سوا اب تک کسی کو نہیں تھا۔ شاید تمہیں میری یہ باتیں کچھ عجیب سی لگیں کیونکہ ان کا تعلق فلم لائن سے ہے۔ بہر حال میں جو کچھ تمہیں بتا رہا ہوں وہ سو فیصد درست ہے۔ شیدا نہ تو گھر سے بھاگی تھی نہ اُسے کسی نے اسے اغوا کیا تھا اور نہ وہ لاپتہ ہوئی تھی۔ اسے میں اور میرا اسٹنٹ انوار علی خود امرتسر چھوڑ کر آئے تھے۔ اب تم پوچھو گے کہ ایک نوجوان تہا لڑکی کو امرتسر میں چھوڑ کر آنے کی کیا وجہ تھی؟ اس کی وجہ بہت اہم تھی لیکن شاید تمہیں زیادہ اہم نہ لگے۔ دراصل میں ایک فلم بنانا تھا۔ یہ میری ذاتی فلم تھی۔ اسکی کہانی میں نے مشہور گجراتی کہانی کار من موہن جی سے لکھوائی تھی۔ یہ فلم ایک لڑکی کے گرد گھومتی ہے۔ اور اس میں مرکزی کردار خود شیدا ادا کر رہی تھی۔ شیدا ایک زبردست فن کارہ ہے اور اس کی صلاحیتوں کا اعتراف ہر قسم کے لوگ کر رہے ہیں اور کسی کی تعریف بے وجہ نہیں کی جاتی۔ شیدا نے واقعی اب تک اپنے داکے ہوئے کرداروں میں جان ڈالی ہے اور فن کے پرستاروں کو اپنی تعریف پر مجبور کیا ہے۔ وہ فلم کے کردار میں ڈھل جاتی ہے۔ کہانی میں ڈوب کر کہانی کا حصہ بن جاتی ہے۔ اس سے پہلے وہ ایک فلم میں مجھیرے کی بیٹی اور دوسری میں کلب ڈانسرنی ہے۔ یہ دونوں کردار ٹھیک سے نبھانے کے لیے اُس نے بے حد محنت کی تھی۔ مجھیرن کا کردار ادا کرنے کے لیے وہ پورے دو ہفتے مجھیروں کی بستی میں رہی اور اُن کے رنگ ڈھنگ و طور اطوار دیکھے۔ کلب ڈانسر کا کردار ادا کرنے کے لیے وہ خاموشی

آ رہا تھا۔ شیدا میرے سامنے زار و قطار رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی ”دادو! تم نے ہی تو مجھے محبت کرنا سکھایا تھا اور یہ بتایا تھا کہ محبت دنیا کا سب سے انمول جذبہ ہے اور جب محبت ہو جائے تو سر جھکانا نہیں چاہیے۔ سر اٹھانا چاہیے کہ ہاں ہمیں محبت ہے..... مجھے بھی محبت ہو گئی ہے دادو! میں ماسٹر صاحب سے محبت کرنے لگی ہوں اور دل کی گہرائیوں سے کہہ رہی ہوں کہ میں نے اُس سے شادی کر لی ہے۔“ میں سکتے کی حالت میں شیدا کے ساتھ رہا تھا۔ شیدا نے بتایا کہ ماسٹر ریاض اُسے ایک بھولی بھالی لاوارث اور غریب لڑکی کے روپ میں جانتے ہیں اور وہ چاہتی ہے کہ ماسٹر صاحب کے سامنے ہمیشہ اُس کا یہی روپ رہے۔ اُس نے خدشہ ظاہر کیا کہ اگر کبھی ماسٹر صاحب کو بھٹک بھی پڑ گئی کہ شیدا وہ نہیں جو نظر آ رہی تھی تو وہ ہمیشہ کے لیے اُسے اپنی زندگی سے نکال دیں گے۔ انہیں دنیا میں جس چیز سے سب سے زیادہ نفرت ہے وہ عورت کی چالاکی اور ہوشیاری ہے اور سب سے پیاری چیز عورت کی سادگی اور معصومیت ہے۔ شیدا نے ہاتھ جوڑ کر مجھ سے درخواست کی میں اُسے اُس کے حال پر چھوڑ کر چلا جاؤں اور کم از کم دو تین برس کے لیے اُسے بالکل بھول جاؤں۔ میں نے مختصر سے وقت میں ساری بات سمجھ لی تھی اور یہ بھی جان گیا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ مجھے مبر کرنا تھا اور خاموشی سے واپس لوٹ آنا تھا..... اور میں نے ایسا ہی کیا۔ دل پر ایک بہت بھاری پتھر رکھا۔ میں نے شیدا کی جدائی قبول کر لی اور وہ ساری باتیں بھی سن لیں جو لوگوں نے اُس کے حوالے سے کیں۔ فلم لائن کے لوگوں میں ایسی باتوں کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی لیکن شیدا چونکہ ایک سپر سٹار بننے والی تھی اور لوگ اُس سے بہت امیدیں رکھتے تھے۔ اس لیے

ریاض کے گھر چلی گئی۔ فلم میں بھی اُس کا نام تارا ہی تھا اور وہ اسی طرح غنڈوں سے بچتی ہوئی ماسٹر کے گھر میں پہنچتی ہے، لیکن اس سے آگے کی کہانی فلم کی کہانی سے بالکل مختلف ہو گئی۔ میرے اور میرے اسٹنٹ کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس گھر میں جانے کے بعد شیدا جیسی سمجھ دار اور تعلیم یافتہ لڑکی اس تیزی اور اس انداز سے بدل جائے گی۔ میں تو کہوں گا کہ جر کچھ بھی ہوا ہے کسی بھی سنسنی خیز فلم سے بڑھ کر حیرت انگیز اور ڈرامائی ہے۔ پروگرام کے مطابق شیدا کو قریباً ایک ماہ ماسٹر ریاض کے گھر میں رہنا تھا اس کے بعد اُسے بتدریج ماسٹر صاحب کو سب کچھ بتا دینا تھا اور اُن کو دی جانے والی زحمت پر بہت بہت معذرت کر کے واپس آ جانا تھا یہ بھی توقع تھی کہ وہ ہفتے دو ہفتے میں ہی لوٹ آئے۔ ہم اس بات کی پوری طرح تسلی کر چکے تھے کہ ماسٹر ریاض بزرگ ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی شریف اور بے ضرر شخص بھی ہے لہذا اُسے چھوڑ کر میں بڑودہ واپس آ گیا۔ صرف میرا اسٹنٹ انوار علی کسی ہنگامی ضرورت کے لیے امرتسر میں موجود رہا۔

پورا ایک ماہ گزر گیا لیکن شیدا واپس نہیں آئی۔ پھر دو مہینے بھی گزر گئے۔ نجانے کیوں میری چھٹی حس مجھے کسی خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ پھر ایک روز مجھے شیدا کی طرف سے ایک خط ملا وہ امرتسر بلا رہی تھی۔ ماسٹر ریاض کے گھر میں بلانے کی بجائے اُس نے مجھے کمپنی باغ کے سامنے ایک ریستوران کا ایڈریس دیا تھا اور ملاقات کا وقت بھی بتایا تھا۔ لاڈلی پوتی کی کال پر میں بھاگم بھاگ امرتسر پہنچا اور مقررہ مقام پر اس سے ملاقات کی مجھے معلوم نہیں تھا کہ جیسے ڈرامائی اور سنسنی خیز موڈ میں فلموں میں دیتا ہوں ایسا ہی ایک ناقابل گمان موڈ میری اپنی زندگی میں بھی آئے گا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں

تھا کہ شیدا اس قتل میں ملوث نہیں ہے۔ یہ بات عین ممکن ہے کہ وجے آئند نے شیدا کی ازدواجی زندگی تباہ کرنے کی کوشش کی ہو یا کسی طریقے سے اُسے بلیک میل کیا ہو اور شیدا نے اُسے زندگی کی سرحد پار کرادی ہو۔ لیکن یہ کوئی چھوٹا اقدام نہیں تھا کسی کو قتل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا اور وہ بھی کسی عورت کے لیے اور عورت بھی ایسی کہ جو محبت کر رہی تھی اور کسی کی زندگی میں بہار بن کر ٹھہرنا چاہتی تھی۔

ضروری بیانات حاصل کرنے کے بعد میں ایک روز بعد بڑودہ سے روانہ ہوا اور ٹرین کا طویل سفر کرنے کے بعد امرتسر واپس پہنچ گیا۔ وجے آئند کے قتل کی تفتیش شروع ہوئی۔ میں نے شیدا کے دادا سے وعدہ کیا تھا کہ جب تک مجھے شیدا کے خلاف کوئی بہت ٹھوس ثبوت نہیں مل جائے گا میں اسے اس معاملے سے الگ تھلگ رکھوں گا اور اس کی جی جمانی زندگی میں کسی طرح کی دخل اندازی نہیں کروں گا۔ وجے آئند کی پوسٹ مارٹم رپورٹ آچکی تھی۔ اس رپورٹ کے مطابق اس کی موت زہر خورانی سے ہوئی تھی۔ یہ زہر اُسے کسی مشروب غالباً گنے کے رس میں ملا کر دیا گیا تھا۔ رپورٹ میں اس زہر کا مشکل سامان اور کیمیکل فارمولا لکھا تھا۔ یہ زہر دو تین گھنٹے کے بعد اثر کرنا شروع کرتا ہے اور تین چار گھنٹے کے دوران اپنے شکار کو راہی عدم کر دیتا ہے۔ میں نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ یہ تھا کہ شیدا نے باغ کی سیر کے دوران یا اُس کے بعد وجے آئند کو زہر پلا دیا۔ بعد ازاں وہ اطمینان سے گھر آگئی اور وجے اس ہوٹل میں پہنچ گیا جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد اُس کی طبیعت خراب ہونا شروع ہوئی۔ ٹپنی اور حرارت حد سے بڑھی تو وہ کپڑے اتار کر غسل خانے میں گھس گیا اور نہانے لگا۔ نہانے کے دوران ہی اُس نے خون کی تے کی

اُس کا اچانک فلمی دنیا چھوڑ کر منظر سے غائب ہو جانا انہیں شاک گزرا۔ کئی اخباری نمائندوں نے جستجو کی کہ وہ اچانک کہاں چلی گئی ہے۔ وہ اُسے بڑودہ اور احمد آباد غیرہ میں ڈھونڈتے رہے لیکن وہ تو سینکڑوں میل دور امرتسر کے اُس چھوٹے سے گاؤں میں ماسٹر ریاض کے گھر میں تھی۔ دھیرے دھیرے لوگ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ مثلاً گمشدگی کو بھی لوگ بھولنے لگے۔ میرے علاوہ اگر کوئی شخص اُس کی حیران کن گمشدگی کو نہیں بھولا تو وہ وجے آئند تھا۔ وہ امیرزادہ شیدا کو جنون کی حد تک چاہتا تھا اور اس کو اپنانا اس کی ضد بن چکا تھا..... ایک لمحے کے توقف کے بعد ہمیش رام پوری نے کہا ”لیکن ایک بات میں تم پر واضح کر دینا چاہتا ہوں اگر تمہارے دماغ کے کسی بھی کونے کھدرے میں یہ خیال موجود ہے کہ وجے آئند کے قتل میں شیدا کا کوئی ہاتھ ہو سکتا ہے تو یہ خیال دل سے نکال دو۔ میں اپنی پوتی کو اتنا جانتا ہوں کہ وہ خود بھی اپنے آپ کو اتنا نہیں جانتی ہوگی۔ وہ..... کسی کا خون نہیں کر سکتی“۔ شیدا کے دادا نے آخری فہرے کے ایک ایک لفظ پر زور دیا تھا۔

اگلے دس بار گھنٹوں میں ہم نے اس سلسلے میں کئی لوگوں سے بیانات قلمبند کیے۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ وجے آئند کے قتل کا تعلق شیدا کی گمشدگی سے ہو سکتا ہے تاہم فلم لائن کے ہی بعض لوگوں کا یہ خیال بھی تھا کہ یہ قتل کسی دشمنی وغیرہ کا شاخسانہ ہے۔ شیدا کے بارے میں کسی کو کانوں کان خبر نہیں تھی کہ وہ کہاں اور کس مال میں ہے۔ اگر بیان دینے والوں کو پتہ چل جاتا کہ شیدا، طاہرہ کے روپ میں امرتسر میں ہی ہے اور اپنے قتل سے صرف چند گھنٹے پہلے وجے آئند نے شیدا سے ملاقات کی تھی تو یقیناً وہ آنکھیں بند کر کے اس قتل میں شیدا کو ملوث کر دیتے۔ میرا اور ایس ایچ او رزاق خاں کا بھی یہی خیال

کوششوں سے تفتیش کا ایک اور راستہ کھلا۔ معلوم ہوا کہ اپنے قتل سے ایک روز قبل مقتول کا کچھ مقامی غنڈوں سے جھگڑا بھی ہوا تھا۔ یہ جھگڑا ایک کال گرل یعنی پیشہ ور لڑکی کی وجہ سے ہوا۔ مقتول نے اس لڑکی کو عیاشی کے لیے اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ نشے میں دھت ہو کر اس نے کوئی ایسی حرکت کی یا ایسی بات کہی کہ لڑکی بھڑک کر باہر نکل آئی۔ وہ اُسے واپس اندر کھینچنے لگا۔ اسی دوران لڑکی کا ایک ”نگران“ بھی موقع پر پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ وجے کی ہاتھ پائی ہو گئی۔ ہوٹل کے مالکوں نے اس معاملے کو فوری طور پر دبا دیا اور ”لڑکی والوں“ کو ڈانٹ ڈپٹ کر وہاں سے بھیج دیا۔ میرے اے ایس آئی فرزند علی نے اس معاملے کی تفتیش کی اور یہ معلوم کرنا چاہا کہ آیا مقتول اور لڑکی والوں میں پھر بھی مڈھ بھیڑ ہوئی ہے یا نہیں۔

تین مختلف لائنوں پر دو ڈھائی ماہ اس کیس کی تفتیش جاری رہی لیکن کوئی ٹھوس ثبوت ہاتھ نہیں آیا۔ سوچنے والی بات یہ تھی کہ اگر مقتول کو گنے کے رس میں زہر ملا کر دیا گیا تو وہ رس اُس نے کہاں پیا۔ جس باغ میں اُس نے شیلہ کے ساتھ چہل قدمی کی تھی وہاں آس پاس کوئی ”رس والا“ موجود نہیں تھا۔ راستے میں بھی بلال شاہ نے انہیں کہیں رس وغیرہ پیتے نہیں دیکھا۔ ہاں سوڈا واٹر انہوں نے ضرور پیا تھا..... تفتیش کے دوران ہی ایک دو دفعہ شیلہ اور ماسٹر ریاض سے بھی میری ملاقات ہوئی۔ شیلہ عرف تارا کا پاؤں اب بھاری تھا۔ پھلدار شجر کی طرح وہ کچھ اور بھی خوشنما ہو گئی تھی۔ وہ پروانے کی طرح ماسٹر ریاض کے گرد گھومتی رہتی تھی۔ اس کی ایک آواز پر ”آئی جی“ کہتی ہوئی لپکتی تھی۔ آخری مہینوں کے باوجود وہ ماسٹر صاحب کا سارا کام اپنے ہاتھوں سے کرتی تھی۔ میں اُسے دیکھ دیکھ کر سوچتا تھا کہ وہ واقعی ایک زبردست گجراتی فلموں کی ایک

اور فرس پر گر کر دم توڑ گیا۔ شیلہ عرف تارا کے خیال میں اس بات کا کوئی گواہ موجود نہیں تھا کہ وہ امرتسر میں وجے آنند سے ملی ہے بلکہ یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی لہذا وہ بالکل مطمئن ہو کر گھر آ گئی تھی۔ بہر حال اس سارے معاملے میں ایک بات توجہ طلب بھی تھی۔ جو کچھ بلال شاہ نے دیکھا تھا اُس کے مطابق شیلہ عرف تارا قریباً گیارہ بجے تک وجے آنند کے ساتھ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر اُس نے زہر پلایا ہے تو اُس کا اثر دو ڈھائی بجے تک ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن زہر کا اثر پانچ بجے کے قریب ہوا تھا اور وجے کی موت اندازاً سات بجے سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔ میں نے پولیس سرجن سے اس بارے میں مشورہ کیا۔ مثلاً اگر کسی شخص نے شکم سیر ہو کر کھانا کھایا ہو اور زہر خورانی کے بعد وہ زیادہ مشقت کا کام بھی نہ کرے تو زہریلے اثرات کے شروع ہونے میں دو سے تین گھنٹے کی تاخیر ہو سکتی ہے۔

جو پارٹی دہلی بھیجی گئی وہ اُس شخص کو اپنے ساتھ ہی لے آئی جس کی کار میں مقتول امرتسر پہنچا تھا اور جو مقتول کا گہرا دوست بتایا جاتا تھا۔ اس شخص کا نام امر سنگھ تھا۔ امر سنگھ پر اپنی کار کا کام کرتا تھا۔ پتہ چلا کہ امر سنگھ سے مقتول کا شدید قسم کا جھگڑا چل رہا تھا۔ اور مقتول امر سنگھ سے کار مانگ کر نہیں بلکہ ایک طرح سے چھین کر لایا تھا۔ امر سنگھ نے مقتول کے چالیس پینتالیس ہزار روپے دینے سے تھے اور ادائیگی سے انکار کر رہا تھا۔ مقتول نے بڑودہ میں بھی اپنے ایک ہمراز دوست سے کہا تھا کہ اگر امر سنگھ نے رقم نہیں دی تو وہ اُس کی گاڑی ضرور لے آئے گا۔

ہم نے اس الماں پر تفتیش شروع کی تو چند ایک مزید انکشافات ہوئے لیکن قتل کا سرا پھر بھی ہاتھ نہیں آیا۔ اسی دوران میرے ”ہونہار“ منجر بلال شاہ کی

”وہ آندے نے تارا کا کھوج لگانے کے لیے سردھڑکی بازی لگا رکھی تھی۔ آخر ایک روز وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوا اور اس حد تک کامیاب ہوا کہ ایک رات ماسٹر ریاض کے گھر پہنچ گیا۔ تارا اُسے یوں اپنے سامنے دیکھ کر بے حد خوفزدہ ہوئی اور ہاتھ پاؤں جوڑ کر بمشکل اُسے وہاں سے ٹالا۔ اگلی رات وہ بے پھر آدھمکا۔ اس نے نہ صرف تارا سے دست درازی کی بلکہ گھر سے باہر ملنے پر اصرار کیا۔ وہ دونوں برآمدے میں کھڑے تھے اور اندر کمرے میں تارا کا شوہر سو رہا تھا۔ اس ڈر سے کہ شوہر کی آنکھ نہ کھل جائے تارا نے سب کچھ برداشت کیا اور وہ بے سے یہ وعدہ بھی کر لیا کہ وہ کسی روز اُسے گھر سے باہر ملے گی۔ آخر وہ دن بھی آگیا۔ ماسٹر ریاض کو کسی کام سے لاہور جانا پڑا۔ اس کی روانگی سے صرف ایک رات پہلے وہ بے پھر دیوار پھاند کر ماسٹر ریاض کے گھر آیا۔ تارا نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ کل نو بجے کے لگ بھگ اُسے امرتسر کے بس اڈے پر ملے گی۔ اگلے روز وہ وہ بے سے ملنے روانہ ہوئی۔ اس ملاقات کے لیے اُس نے خود کو بنایا سنوارا تھا لیکن اس کے علاوہ بھی ایک تیاری کی تھی۔ زہر کی وہ پڑیا جو وہ اکثر اپنے ”اندرونی لباس“ میں رکھتی تھی اُس روز بھی اس کے لباس میں تھی۔ (ماسٹر ریاض کا اندازہ غلط تھا کہ وہ سکھیا ہے۔ یہ وہی زہر تھا جس کی نشاندہی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ہوئی تھی) یہ زہر تارا نے گنے کے اُس رس میں گھول دیا جو تھرماس میں بند وہ بے کی گاڑی میں پڑا تھا۔ اس رس کے چند گھونٹ وہ بے نے واپس ہوٹل میں جا کر لیے اور بعد میں تھرماس دھو کر اپنے سامان میں رکھ دیا۔ یہ تھرماس ہم نے دیکھی تھی لیکن اُس وقت ہمارے ذہن میں نہیں آیا کہ یہ تھرماس اس کیس

کامیاب ہیروئن ہے اور اُس کی عقل مندی اور فن میں اُس کی سوجھ بوجھ کا ایک زمانہ اعتراف کرتا ہے۔ ایک عجیب گورکھ دھندہ بھی یہ لڑکی۔

وہ آندے کا قتل ہوئے اب چھ مہینے گزر چکے تھے۔ کوشش کے باوجود میں کوئی اہم سراغ نہیں پا سکا تھا اور اب مجھ پر ایک طرح کی مایوسی طاری ہونے لگی تھی۔ ایک روز میں کیس کی ادھوری فائل سامنے رکھے کمرے میں بیٹھا تھا اور سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا۔ دفعتاً ایک ایسی بات میرے ذہن میں آئی جو بہت پہلے آ جانا چاہیے تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ میں اور میرا عملہ اب تک کیوں اس بات کو فراموش کیے ہوئے تھا.....

تارا یعنی شیلٹاٹان جب مقتول وہ آندے سے ملنے چوری جیسے گاؤں سے روانہ ہوئی تو اُس کے ساتھ ایک لڑکی بھی نفی جو اُسے بس پر چڑھا کر گاؤں واپس آگئی تھی عین ممکن تھا کہ وہ لڑکی تارا کی ہمراز ہو اور اُس سے کوئی اہم بات معلوم ہو سکے۔ یہ خیال آتے ہی میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد میں جانڈی پورا گاؤں کے پنواری کی بیٹی سیتا کا بیان لے رہا تھا یہی لڑکی تارا کو بس پر چڑھانے کے لیے پختہ سڑک تک گئی تھی۔ پنواری پیارے لال بھی وہاں موجود تھے۔ سیتا کا رنگ ہلری کی مانند زرد ہو رہا تھا اور کچھ بھی حال پنواری کا بھی تھا۔ صرف دو روز بعد سیتا کی شادی ہو رہی تھی۔ گھر میں مہمان آنا شروع ہو گئے تھے اور دلہن پولیس کے چکر میں پھنس گئی تھی۔ میں نے سیتا کی ”مجبوری“ سے بڑے مناسب طریقے سے فائدہ اٹھایا تھا اور پندرہ منٹ کے اندر اُسے سب کچھ اُگلنے پر راضی کر لیا تھا۔ پنواری پیارے لال کو باہر بھیجنے کے بعد میں نے تارا کی ہمراز سیتا سے جو کچھ معلوم کیا وہ کچھ اس طرح تھا۔

سمیت منوں مٹی کے نیچے دفن کر دیا گیا۔ اُس کے دادا ہمیشہ رامپوری کو اُس کی موت کی خبر کر دی گئی تھی لیکن اُس نے اپنی لاڈلی پوتی سے کیا ہوا آخری وعدہ نبھایا۔ وہ پوتی کی آخری رسومات میں شریک نہیں ہوا۔ نہ ہی اُس نے اپنے داماد سے کسی طرح کا رابطہ کیا۔ جاٹھی پورا میں میرے سوا کسی کو تارا کی کہانی کا علم نہیں تھا اور میں نے اپنے لیوں پر مہر لگالی۔ بلال شاہ کو میں پہلے ہی رازداری کا پابند کر چکا تھا۔ اب میں نے پٹواری اور اس کی بیٹی سیتا کو بھی پابند کر دیا کہ وہ تارا کے سلسلے میں اپنی زبان بالکل بند رکھیں۔ وہ زبان کھولتے تو خود بھی پھنستے تھے لہذا انہوں نے زبان بند کر لی..... میں نے وجے آئند قتل کیس کی فائل بند کر دی..... اور یوں ماسٹر ریاض سمیت کسی کو علم نہ ہو سکا کہ وجے کی موت کی ذمے دار تارا تھی۔ شاید کبھی نہ کبھی یہ بات ماسٹر ریاض کے سامنے کھل ہی جاتی لیکن کچھ عرصے بعد وہ خود ہی جاٹھی پورا چھوڑ گیا۔ تارا کی یادیں سینے میں بسائے اُس کے غم آنکھوں میں چھپائے وہ ایک روز یوں سر جھکا کر گاؤں سے نکلا جیسے کہیں سے جنازہ نکلتا ہے۔ پھر جاٹھی پورا میں کبھی کسی نے اُس کی صورت نہیں دیکھی۔ جاتے جاتے اُس نے اپنا سکول گاؤں کی پنچائیت کے سپرد کر دیا تھا اور سکول کی پیشانی پر ایک سبز رنگ کا بورڈ لگوا دیا تھا۔ اُس پر لکھا تھا ”طاہرہ ہائی سکول“۔

ماسٹر ریاض کو ہوشیار چالاک اور پڑھی لکھی عورتوں سے نفرت تھی لیکن اس کی زندگی میں آنے والی واحد لڑکی ہوشیار بھی تھی، چالاک بھی تھی اور پڑھی لکھی بھی تھی۔ ماسٹر ریاض پھر بھی اس سے پیار کرنے پر..... اور ساری زندگی اس کی یاد میں آنسو بہانے پر مجبور ہوا۔ شاید یہی قدرت کی کارگیری ہے۔

میں ایک اہم ثبوت کی حیثیت رکھتی ہے۔

..... دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو چکا تھا۔ یہ لڑکی جو ماسٹر ریاض کی خزاں رسیدہ زندگی میں بہار بن کر آئی ہے قاتلہ ثابت ہو چکی تھی۔ اُسے گرفتار کر کے حوالات میں پہنچانا اور کیے کی سزا دلانا میرا ذمہ فرض تھا۔ تھانے آکر میں تادیر سوچ میں غرق رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح ماسٹر ریاض کے گھر جاؤں اور اُس سے کہوں کہ اُس کی بیوی وہ نہیں جو نظر آتی ہے..... اُسے معصومیت اور سادگی کا فریب دینے والی ایک ’قاتل اداکارہ‘ ہے اور میں اُسے قتل کے الزام میں گرفتار کرنے آیا ہوں۔

..... شام چار بجے تک مجھے اس کی گرفتاری کے لیے پہنچ جانا پڑا ہے تھا لیکن چھ بجے تھے اور میں الجھنوں میں بھٹکا ہوا اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ ہر بار جب میں اٹھنے کا ارادہ کرتا تھا ایک دیواری میرے سامنے آ جاتی تھی۔ آخر میں نے ہمت کی اور دو ہیڈ کانشیلوں اور ایک جھکڑی کے ساتھ تھانے سے نکل آیا۔ ابھی میں کھلی میں ہی پہنچا تھا کہ بلال شاہ قریباً بھاگتا ہوا آیا۔ اُس کی پگڑی گلے میں پڑی تھی اور رنگ فق تھا۔ ”خان صاحب! ماسٹر کی گھر والی مر گئی“ اُس نے دھماکہ خیز انکشاف کیا۔ میں سکتے کی حالت میں کھڑا رہ گیا۔ بلال شاہ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا ”اُسے بچہ ہونے والا تھا۔ آج صبح سویرے ماسٹر ریاض اُسے تحصیل ہسپتال لے کر گیا تھا سہ پہر ساڑھے تین بجے اُس نے دم دے دیئے۔“

میں نے کانٹیل بھکتو سنگھ کے ہاتھ میں جھولتی ہوئی جھکڑی کو دیکھا مجھے یوں لگا کہ یہ جھکڑی بے جان ہونے کے باوجود اپنے آپ سے شرمندہ ہے۔

..... تارا مر گئی۔ اُسے مسلمانوں کی طرح نہلا دھلا کر اور کفن میں لپیٹ کر اُس کے مُردہ بچے



حنا اصغر

پپی نیو ایئر

اور گلے دن وہ اس کے دفتر گیا تھا سوری کرنے لیکن وہاں جا کر پتہ چلا تھا کہ وہ ایک ہفتے سے آفس ہی نہیں آرہی تھی اور اسفند کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی حالانکہ کل وہ خود اس کو آفس کے دروازے پر چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ غصے سے بیچ و تاب کھارہا تھا۔ حیراب کی بوتل اس کے قریب پڑی ہوئی تھی وہ ایکدم سے کھڑا ہو گیا تھا۔



میاں بیوی کا فسانہ، اُن کے درمیان شک کی دیوار حائل ہو گئی تھی

ہاتھ میں سلکتا سگریٹ راکھ ہو گیا تھا۔ اس کا وجود آگ کے بڑے سے الاؤ کی طرح دھک رہا تھا۔ ادھر وہ جل جل کر راکھ ہو رہا تھا جبکہ وہ اس کی ذہنی کیفیت سے قطعی طور پر انجان بن کر سو رہی تھی۔ کمرے سے نکلنے سے پہلے اس نے سنا تھا کہ وہ کسی امجد صاحب

اس کے لیے وہ انتہائی سلگتی ہوئی شام تھی جب اوراک کے سارے پردے یکدم وا ہوئے تھے۔ ان پردوں نے اس کی ساری ہستی کو خاکستر کر دیا تھا۔ وہ دسمبر کی بیخ بستہ شام کو ٹیرس پر کھڑا تھا، اس کے ہاتھ میں چائے کا گک کب کا ٹھنڈا ہو چکا تھا اور دوسرے

ہر خوشی نے اپنا دامن چھڑا لیا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے کی بات ہی تھی۔ جب وہ اپنے دوستوں امجد اور بیزاد کے ساتھ سی ویو آیا تھا اور دائیں جانب بنے چاٹ کے ٹھیلے کی جانب اس کی نظریں اٹھی تھیں اور پھر واپس پلٹتا ہی بھول گئی تھیں۔ ٹھیلے کے قریب ٹھہری سنہری بالوں والی لڑکی جس کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہہ رہے تھے وہ ٹھٹکی باندھے اسی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ کھڑی دو لڑکیاں اس کی سرزنش کر رہی تھیں لیکن وہ باز نہیں آ رہی تھی۔ امجد اور بیزاد آگے بڑھ چکے تھے جبکہ وہ ہولق بنا اسی کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس کی نظروں کا ارتکاز تھا کہ اسی بل اس نے اس کی جانب دیکھا تھا اور اس کی پیشانی پر ان گنت بل جال کی شکل میں پھیل گئے تھے۔ وہ سبکی کے احساس سے وہاں سے ہٹ گیا تھا ”کھاؤاں.....“ بیزاد نے چاٹ کی پلیٹ اس کے سامنے کی تو اس نے بدلی سے پلیٹ لے لی ”اے یہ تو شہزاد ہے“ بیزاد نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا ہر بھی اسفند نے سامنے دیکھا ہر سمرائز ہو گیا شہزاد کے ساتھ وہ تینوں لڑکیاں بھی تھیں۔ بیزادوں سے ملنے چلا گیا کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو اسفند نے بے تابی سے ان کے بارے میں پوچھا۔ ”یادہ میری کزن کا دیہ ہے“ وہ تینوں.....“۔ امجد نے پوچھا ”وہ اس کی کزنز ہیں“۔ اسفند کی نظریں اب بھی بھٹک بھٹک کر اس کی جانب اٹھ رہی تھیں جو اپنی کزنوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی۔

اسفند نے اپنے دوست کو امریکہ پارسل بھیجتا تھا اس لیے وہ سیدنگ بینک آیا تھا۔ یہاں پر وہ ایک بار پہلے بھی آچکا تھا۔ وہ ایک کاؤنٹر پر گیا ”ساتھ والے کاؤنٹر پر جائیں“۔ ایک لڑکی نے قدرے روکھے انداز میں کہا۔ وہ زیر لب مسکرا دیا لیکن اگلے کاؤنٹر پر پہنچے ہی اس کے قدم خود بخود دست پڑ گئے تھے آنکھیں خیراں ہو گئی تھی تو دل کی دھڑکنوں میں ارتعاش پیدا ہو گیا تھا، بلاشبہ وہ وہی تھی۔ اس نے

سے معافی مانگ۔ رہی تھی۔ اسفند کا جی چاہ رہا تھا اس کو جگا کر مارے، اپنی ساری وحشتیں ساری بھڑاس اس پر نکال دے لیکن وہ اس کو تکلیف دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اگلے دن اس کا منہ بنا ہوا تھا۔ اس نے ایک دوبار اس سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے منہ پر ”نولفٹ“ کا بورڈ چسپاں تھا جس کو دیکھ وہ خاموش ہو گیا۔

وہ ششدر رہ گیا تھا اس کی آنکھیں بے یقین تھیں جبکہ دل میں محنت کا سا شور تھا اس کے ہاتھ میں تھا ”بوکے“ نیچے جا گرا تھا جس کو اس نے پاؤں کی مدد سے آگے سرکار دیا تھا۔ اضطراب و اشتعال کی طلی جلی کیفیت میں اس نے کسی نہ کسی طرح بائیک سٹارٹ کی تھی وہ جس جگہ سے گزرتا اس کو ایسا لگتا جیسے لوگ اس کا معجزہ اڑا رہے ہوں۔ ان کی استہزائیہ نظریں اس کے اشتعال کو مزید بڑھا رہی تھیں اس نے ایک سٹور کے سامنے اپنی بائیک روک دی۔ ”ایک تیزاب کی بوتل چاہیے“۔ اس کی آواز میں لرزش تھی۔ ”کیا کریں گے صاحب“..... لڑکے نے سرسری لہجے میں پوچھا۔ ”فلٹر دھونا ہے بیگم نے“..... اس نے حتی الامکان اپنے آپ کو نارمل رکھا لیکن اس کی انگلیاں کپکپا رہی تھیں۔ ماتھے پر نمودار پسینے کے قطرے اس کو مزید حواس باختہ کر رہے تھے۔ تیزاب لینے کے بعد وہ سی ویو پر آ گیا۔ یہی جگہ تھی جہاں پر وہ اس کو پہلی بار ملی تھی۔ ابھی کبھار اس کو یہ جگہ اپنی محسن لگا کرتی تھی اور اب یہی جگہ اس کو ظالم اور بُدی لگ رہی تھی لیکن پھر بھی وہ آخری بار اس جگہ کو دیکھنا چاہتا تھا۔ خوشحال چہروں کا اٹو دھام تھا جبکہ اس کی محبت کر لا رہی تھی۔ لوگ ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر پھر رہے تھے جبکہ اس کی محبت ہاتھ چھڑا کر اس سے کوسوں دور جا چکی تھی۔ لوگوں کے چہروں پر خوشحالی تھی جبکہ اس کا چہرہ زرد و بد حال ہو گیا تھا۔ محبت کیا روٹی تھی زندگی کے ہر رنگ

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک منفرد تحقیقی اور عظیم پیشکش

قرآنی وظائف

❖ یہ وظائف ہماری آپ کی اہم گھر کی پریشانیوں،
الجھنوں اور مشکلات کا حل ہیں۔

❖ قرآن مجید کی چھوٹی چھوٹی آیات پر مشتمل یہ وظائف
آسان، سادہ اور عام فہم زبان میں اس طور سے پیش
کیے جا رہے ہیں کہ ہر قاری بھی ان پر بغیر کسی دشواری
کے عمل پیرا ہو کر ان قرآنی وظائف سے اپنی
بگڑی بنا سکے۔

❖ اولیائے کرام اور بزرگانِ دین کے مصدقہ آزمودہ اور
پُر اثر قرآنی وظائف۔

❖ انشاء اللہ یہ نمبر بھی ماضی کی طرح آپ کی امنگوں
پر پورا اترے گا۔

شانع ہو گیا ہے

سیارہ ڈائجسٹ 16-B ساندہ روڈ، لاہور فون: 7245412

اور اگلے دن وہ اس کے دفتر گیا تھا سوری کرنے لیکن وہاں جا کر پتہ چلا تھا کہ وہ ایک ہفتے سے آفس ہی نہیں آ رہی تھی اور اسفند کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی حالانکہ کل وہ خود اس کو آفس کے دروازے پر چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ اس طرح کیسے کر سکتی تھی؟ وہ غصے سے بیچ و تاب کھا رہا تھا۔ شام ہو گئی تھی، تیزاب کی بوتل اس کے قریب پڑی ہوئی تھی وہ ایکدم سے کھڑا ہو گیا تھا۔ آج اس بے وفا کو اس کی بے وفائی کی سزا ہر صورت دینی ہے۔ اس نے بائیک گھر جانے والے راستے کی جانب ڈال دی۔ گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا اندر سے آوازیں آ رہی تھیں۔ شاید اس کے ساتھ اور بھی کوئی تھا۔ اس کا غصہ اور سوا ہو گیا۔ اس نے بوتل والا ہاتھ پیچھے کر لیا تھا ”اسفند آپ آگئے“ شہوار نے جھٹ سے اس کا ہاتھ تھاما اور اس کو اندر لے گئی وہ دنگ رہ گیا۔ اندر ایک ادھیڑ عمر کی عورت اور مرد بیٹھے تھے۔ یہ میرے میاں اسفند، اور اسفند یہ ہیں مسٹر اینڈ مسز امجد میرے گانا کا لوجسٹ.....“ اسفند کے اندر کہیں جوار بھانا پھٹا تھا۔ اس کا چہرہ متغیر ہو گیا تھا۔

سامنے میز پر کیک کے اوپر ”پپی نیو ایئر“ کے الفاظ اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ ”اسفند آپ کی اہلیہ آپ سے بہت محبت کرتی ہے، اس کے کیس میں کچھ کمپلیکیشن تھیں اس لیے وہ آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں جب جب اس کو بلاتی تھی یہ آجایا کرتی تھی۔“

”ہاں جی پورا ایک ہفتہ میں آفس میں نہیں گئی اس لیے.....“ شہوار نے چپک کر کہا اور ساتھ ہی کیک کا ٹکڑا اسفند کے منہ میں ڈال دیا۔ اسفند کے ہاتھ میں تھمی تیزاب کی بوتل نیچے جا گری تھی۔ اس نے پشیمانی سے سر جھکا لیا تھا۔ گزشتہ الفاظ اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ چاروں طرف ایک ہی بازگشت تھی ”پپی نیو ایئر“



انتہائی پروفیشنل لہجے میں اس کا پارسل بک کیا اور سید اس کو دے دی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہی ٹھنکی بارہ کر اس کو دیکھتا رہے اور آج واقعی اس کو اپنی مزا مل گئی تھی۔ گھر آ کر اس نے بیزار کو فون کیا اور پھر اس سے بات کی اور آگے کے معاملات اتنی تیزی سے طے ہوئے کہ وہ خود دم بخود رہ گیا تھا اور یوں در شہوار اس کی زندگی میں شامل ہو گئی تھی۔ تین سال پر لگا کر اڑ گئے تھے وہ دونوں اپنی چھوٹی سی دنیا میں مست و مگن بنے لیکن کچھ دنوں سے شہوار کی سرگرمیاں مشکوک ہو گئی تھیں۔ وہ جو ہمہ وقت اسفند اور گھر کی فکر میں کھلتی رہتی تھی اب دونوں سے بے پرواہ ہو گئی تھی۔ وہ خوش باش آفس جاتی اور واپس آ کر گنگنائی رہتی یا پھر ہمہ وقت فون پر چپکی رہتی تھی۔ اسفند کے اندر آنے پر شہنا کر فون بند کر دیتی تھی اور کبھی کبھار اس نے خود اسے فون کان سے لگائے آنسو بہاتے دیکھا تھا جبکہ اسفند بات کرتا تو وہ پھاڑ کھانے کو دوڑتی تھی۔ اس کے فلم دیکھنے اور لائیک ڈرائیو پر چلنے کا محض کہہ دینا ایک نئی لڑائی کی شروعات کا باعث بنتا، وہ محض خون کے گھنٹ پی کر رہ جاتا تھا۔ اس نے دو تین بار خود اس کو امجد سے فون پر بات کرتے سنا تھا لیکن اس کے آنے پر وہ فون بند کر دیا کرتی تھی۔ اور وہ ایسی ہی رات تھی جب دونوں کی لڑائی کی شروعات محض چھوٹی سی بات پر ہوئی تھی لیکن لڑائی طویل پکڑ گئی تھی۔ غصے میں شہوار نے تین پلیٹیں توڑ دی تھیں اور اسفند کے منہ سے مغلقات کا ایک طوفان تھا جو ٹکلا تھا اور وہ بکتا بھکتا گھر سے نکل گیا تھا۔ ساری رات سڑکوں پر مارا مارا پھرنے کے بعد جب وہ گھر آیا تو دل میں کہیں نہ کہیں ایک مبہم سی امید تھی کہ وہ بھی جاگ رہی ہوگی لیکن اس کے سارے ارمان بھر بھری مٹی کی طرح نیچے بیٹھتے چلے گئے۔ وہ سر تک چادر تانے سوری تھی۔

”نا تمام“

مرزا حامد

اب کی بار وہ خود کے آگے بھی بے بس تھا۔ وہ ہڈیوں کا ایک بخر بن چکا تھا۔ چہرے میں دھنسی کالی سیاہ آنکھیں اور چہرے سے نیکی الساک حسرت اور غمناکی نے اسے ایک زخمی لاش بنا دیا تھا۔ یقیناً اس نے کئی ایک خواب دیکھے تھے لیکن آج وہ زندگی کی ادھل کس موڑ کھڑا تھا۔۔۔۔۔ وہ خود سے بھی اکثر یہ سوال کیا کرتا۔

ایک مجرم کی کہانی، وہ ہر مجرم کے بعد یہ کام چھوڑنے کا پختہ عہد کرتا تھا



کار، سیاہ کار بن چکا تھا اور اب وہ نہ صرف اپنے علاقے میں ہونے والی بہت ساری کارروائیوں میں حصہ دار تھا بلکہ دوسرے بڑے نیٹ ورکس میں بھی ساتھ دار تھا۔ رابرٹ کو ہنری نے جاسوسی کے لیے ٹرینڈ کیا تھا۔ ایک چھوٹا بچہ آسانی سے پولیس کی نظروں سے بچ کر

رابرٹ باس ہنری کے لیے برسوں سے کام کر رہا تھا۔ تقریباً دس سال کی عمر میں جبکہ رابرٹ سڑک کنارے پڑے روں کے ٹکڑے اٹھا کر کھایا کرتا تھا، ہنری نے رابرٹ کو اپنے پاس رکھا تھا۔ نہری علاقے کا سرغنہ عادی مجرم تھا لیکن رفتہ رفتہ اس شعبہ کا ایک تجربہ

اصلاحی پروگرام میں شرکت کرنے کی بدولت اسے جلد ہی رہائی مل جایا کرتی تھی لیکن جب کبھی بھی وہ ایسی قید سے رہائی پا کر باہر نکلتا تو اپنی گزشتہ طرز زندگی اور عادت سے تنگ دوبارہ گندگی کے ڈھیر میں گر جاتا۔ اکثر وہ اپنی گزشتہ خرافات کو یاد کرتا اور خود کو ملامت کرتا۔ ایسے میں وہ جوش جذبات سے مغلوب ہو کر شراب اور جوا کا سہارا لیا کرتا۔

آخری مرتبہ جب وہ ایسی ہی رہائی سے باہر نکلا تو اس کے دوسرے ساتھی حیران تھے کہ رابرٹ اب ان جیسا نہیں رہا تھا۔ وہ اکثر نماز بھی پڑھنے لگا تھا لیکن رفتہ رفتہ وہ پھر سے شراب اور دیگر نشوں کا سہارا لے لیتا۔ اب کی بار جیل جانا رابرٹ کو بہت مہنگا پڑا۔ اشتہاری ہونے کی وجہ سے اور نشہ بھی برآمد ہونے پر وہ آٹھ سال کے لیے بند ہوا۔ یہ عرصہ اس کے لیے نہایت اذیت ناک تھا کیونکہ اب کی بار نشہ کی لت میں اسے جھنجھوڑتی تھی۔ وہ کوئی عادی نشئی نہیں تھا لیکن اس کا ماضی اس کے لیے ایک دردناک بلا کی مانند اسے ڈراتا اور اس کی راتوں کی نیندیں اڑاتا اور اس کا ضمیر تو گویا اسے مار ہی ڈالتا۔

اب کی بار وہ خود کے آگے بھی بے بس تھا۔ وہ ہڈیوں کا ایک ہنجر بن چکا تھا۔ چہرے میں دھنسی کالی سیاہ آنکھیں اور چہرے سے ٹپکتی المناک حسرت اور غمناکی نے اسے ایک زندہ لاش بنا دیا تھا۔ یقیناً اس نے کئی ایک خواب دیکھے تھے لیکن آج وہ زندگی کی راہ میں کس موڑ کھڑا تھا.....؟ وہ خود سے بھی اکثر یہ سوال کیا کرتا، کبھی وہ خود کو ملامت کیا کرتا تو کبھی اپنی قسمت کو..... اور کبھی سماج کو..... وہ انصاف چاہتا تھا..... لیکن کس سے.....؟ وہ رونا چاہتا تھا لیکن کس کے کندھے لگ کر..... اسے تو سارا سماج، معاشرہ یہاں تک کہ اپنا وجود بھی ایک دھوکا لگنے لگا تھا۔

وہ اپنے گزشتہ ماضی کو بھول جانا چاہتا تھا اور ایک

اپنا کام کر لیتا تھا تا صرف پولیس کی مجبوری کرنا رابرٹ کے کام کا حصہ تھا بلکہ عام علاقے کے مکین بھی رابرٹ کی باسوسی کی فائلوں کا حصہ تھے جن میں ان کی پرسنل اوجیت کی معلومات بھی رابرٹ حاصل کر کے ریکارڈ میں رکھتا تھا۔

رابرٹ بنیادی طور پر ایک خاموش مسخید انسان تھا۔ بچپن میں والدین کے فوت ہو جانے کے بعد وہ یتیم ہو گیا تھا، کوئی خاص قریبی رشتہ دار بھی نہ تھا جو رابرٹ کی نگہداشت کی ذمہ داری لیتا یا اس کی کفالت کرتا وہ ابتدائی کچھ عرصہ ایک فلاحی ٹرسٹ میں رہا پھر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور منشیات فروشوں اور جرائم پیشہ افراد کے ہتھے چڑھ گیا۔ یہ لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ کسی بھی معاشرے میں یہ لوگ ناسور ہوتے ہیں۔ چھوٹے بڑے جرائم کرتا تو ان کا معمول ہوتا ہے۔

باس ہنری کا نیٹ ورک بھی ایسے ہی ایک گروہ کا حصہ تھا۔ رابرٹ صرف جاسوس رسانی کی حد تک ہی کام کرتا تھا۔ یہ کام اس کی فطرت سے ویسے بھی قریب تھا۔ وہ بنیادی طور پر ایک حساس انسان تھا اور اس طرح کی مجرمانہ زندگی سے بیزار بھی، لیکن پیٹ کے ہاتھوں مجبور چارونا چاروہ یہ سب کچھ کرنے پر مجبور تھا۔ ایک روز اس نے سکول میں پڑھانے والی ایک استانی کا پرس چھیننے کی کوشش بھی کی تھی۔ رابرٹ کو جو اطلاع ملی تھی اس کے مطابق یہ لڑکی ایف۔ بی۔ آئی میں کام کرنے والے ایک آفسر کی منگیتر تھی اور اس کے پاس ان کے نیٹ ورک سے متعلق کچھ معلومات تھیں۔

لیکن اس کوشش میں وہ پکڑا گیا۔ لوگوں نے اس کی اچھی خاصی درگت بتائی اور پولیس کے حوالہ کر دیا۔

یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ رابرٹ پولیس کے ہتھے چڑھا تھا کم عمری میں بھی وہ حوالات کی ہوا کھا چکا تھا لیکن ایک تو کم عمری اور دوسرا اچھے رویے اور دینی

نمبر تھا۔ وہ فون کاٹ دینا چاہتا تھا لیکن ناچاہتے ہوئے بھی وہ فون کان سے لگا چکا تھا۔

”ہیلو دوست! تم تو شاید ہمیں بھلا ہی بیٹھے ہو“
باس ہنری کے لہجہ میں عجیب سا تاثر تھا۔

رابرٹ خاموش تھا اور سوچ میں پڑ گیا کہ وہ کیا بات کرے۔ ”دیکھو مجھے آج ہی پتہ چلا ہے کہ تم باہر آچکے ہو، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہمارا دوست باہر ہو اور ہمارے درمیان میں نہ ہو، مجھے معلوم ہے کہ اس وقت تم کس کیفیت میں ہو گے لیکن دوست یہ دھندہ ہی ایسا ہے۔ یہ تو بڑے بڑوں کو باندھ دیتا ہے۔“ باس ہنری وضاحت دینے لگا۔

”دیکھو! باس اس وقت میری طبیعت بہت ناساز ہے۔۔۔۔۔“ رابرٹ بڑبڑایا۔ ”تم فکر مت کرو! تم صرف اتنا بتاؤ کہ اس وقت تم کہاں ہو؟ میں آدمی کو بھیج رہا ہوں“ باس ہنری جلدی سے بولا۔

”نہیں! اس وقت ہمیں میں کل خود آؤں گا“
رابرٹ نے اپنی تھکی سی آواز میں کہا۔

”تم فکر مت کرو! میں تمہارے پرانے جگری دوست جارج کو تمہارے بارے میں بتا چکا ہوں وہ پانچ منٹ میں تمہارے پاس پہنچ جائے گا تم صرف اتنا بتاؤ کہ اس وقت تم کہاں ہو۔“

رابرٹ تو گویا اس وقت نیم بیہوش تھا اس کی نظریں سکرین پر چلنے والی اس فلم پر لگی ہوئی تھیں اور اپنے بے جان سے ہاتھ میں سیل فون پکڑے ٹانگیں پھیلائے کرسی پر نیم مردہ سی حالت میں گرا پڑا تھا۔ ایک سحرانگیز خاموشی کے وقفے کے بعد وہ بڑبڑلایا۔

”والٹن روڈ پر واقع ہیراڈائیز ریسٹورنٹ میں ہوں“
وہ نیم مردہ سی آواز میں بڑبڑلایا اور فون بند کر دیا۔

کچھ ہی دیر بعد بارش ختم چکی تھی اور رات کے اس پہر اس ویران چوراہے میں لگے برقی قہقہے پوری طرح روشن تھے اور ایک سحر زدہ خاموشی اپنا جادو بکھیر رہی تھی۔



نئی زندگی شروع کرنا چاہتا تھا۔ باس ہنری کو تو وہ اپنی زندگی کی کتاب سے سیاہی والے گندے کاغذ کی مثل پھاڑ کر الگ کر دینا چاہتا تھا۔

آج آٹھ برس گزرنے کے بعد جیل سے رہا ہو کر وہ شہر کے ایک پرہجوم چوراہے پر کھڑا تھا۔ رات کے تقریباً 12 بجے تھے کہ یکا یک تند و تیز گرج چمک کے ساتھ بارش شروع ہو گئی وہ تیزی سے قریب ہی واقع ریسٹورنٹ کی طرف بھاگا۔ بارش نے سر سے پاؤں تک اسے بھگو ڈالا تھا۔ اس نے اپنا کوٹ اور منظر ٹھیل کے ساتھ پڑی کرسی پر ڈالا اور ویٹر کو آواز دی ”ایک کپ گرم گرم چائے چاہیے“ وہ اپنی تھکی سی آواز میں بولا۔ ویٹر نے آہستہ سے سر ہلایا اور ”جی جناب ابھی لے کر آیا“ کہہ کر روفو چکر ہو گیا۔

ریسٹورنٹ میں لگے TV کی سکرین پر اپنے وقت کی ایک معروف سپر ہٹ فلم چل رہی تھی۔ یہ وہ فلم تھی جسے وہ کئی بار بڑی نٹان سے سینما میں جا کر دیکھ چکا تھا۔

ریسٹورنٹ میں رات کی اس تاریکی میں ایک جادو کی سکورت تھا اور باہر دھڑا دھڑا ہونے والی زور دار بارش نے ویرانی اور خوف کا منظر بنا ڈالا تھا۔ ”یہ لیجئے جناب گرم گرم چائے“ رابرٹ ویٹر کی آواز سے چونک گیا۔ وہ فلم دیکھنے میں ایسا کھو گیا تھا کہ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ کب اپنی پیٹ کی جیب سے سگریٹ نکال کر اور سامنے میز پر پڑے ماچس کی تیلی سے اسے لگا کر وہ اس کے دھوئیں اڑا رہا تھا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ بہت شکریہ“ وہ ماضی کی یادوں میں کہیں کھویا کھویا سا بولا۔ ویٹر اگلے ہی لمحے وہاں سے روفو چکر ہو چکا تھا جیسے اس نے اس کی بات سنے بغیر ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ اس شخص کو اور کچھ نہیں چاہیے۔

رابرٹ اب کی بار اس وقت چونکا جب اس کے سیل فون پر زور سے گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے فون کو قریب لا کر دیکھا۔ سیل کی سکرین پر باس ہنری کا

ذہانت تیز کرنے والی غذائیں

حکیم راحت نسیم سوہدروی

بلا شک ذہانت قدرتی اور پیدائشی ہوتی ہے اور اسے عطیہ خداوندی قرار دینا چاہیے۔ تاہم اس کا صحت مند جسم اور غذا سے گہرا تعلق ہے۔



ہے اور اسے عطیہ خداوندی قرار دینا چاہیے۔ تاہم اس کا صحت مند جسم اور غذا سے گہرا تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ صحت مند جسم ہی صحت مند دماغ کا مالک ہوتا ہے۔ ایسا ممکن نہیں کہ صحت سے

ذہانت قدرتی ہوتی ہے۔ اگر دماغ صحت مند اور کسی قسم کی دماغی ہچیدگی نہ ہو تو دماغ کی کارکردگی بڑھ جاتی ہے۔ البتہ علم و ہنر سے اسے مزید چمکایا جاسکتا ہے۔ بلا شک ذہانت قدرتی اور پیدائشی ہوتی

جب دوران خون یعنی خون کا دورہ باقاعدہ نہ ہو تو دماغ کو اس کی ضرورت کے مطابق غذا نہیں ملتی۔ جس کے نتیجے میں دماغ ضعف کا شکار ہونے لگتا ہے۔ ایسی صورت میں دماغی کمزوری کے سبب یادداشت میں کمی ہونے لگتی ہے۔

انسانی زندگی میں بچپن سے نوجوانی کی طرف گامزن ہوتے ہوئے مناسب غذا کا استعمال بہت ضروری ہوتا ہے۔ یہ بڑا اہم دور ہوتا ہے جب غذا کا خیال رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں غذائی کمی کے سبب خون کی کمی ہو سکتی ہے جس سے گردش خون میں فرق آئے گا اور جسم کا اعصابی نظام شکست و ریخت کا شکار ہونے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیکھا گیا ہے کہ اکثر بچے جو بچپن میں صحت مند و توانا ہوتے ہیں نوجوانی میں خون کی کمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جس سے جسمانی طور پر کمزوری ہو جاتی ہے اور پھر دماغی طور پر صحت مند نہیں رہتے۔ ان کی یادداشت متاثر ہوتی ہے اور آئی کیو لیول کم ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو دماغی یادداشت بہتر بنانے کے لیے ادویہ کی بجائے غذائی اشیاء پر توجہ دینا چاہیے۔ ماہرین طب و صحت کا کہنا ہے کہ فاسفورس دماغی طاقت کے لیے بہت اہم ہے۔ لہذا ایسی غذائیں استعمال کرنی چاہیے جن میں فاسفورس اور لحمیات کی مقدار زیادہ ہو۔ ایسی غذاؤں میں مچھلی کا گوشت سرفہرست ہے کیونکہ مچھلی میں فاسفورس بکثرت ہوتا ہے۔ اسی طرح انڈا، دودھ، مکھن اور بادام بھی مفید ہیں۔ مغزیات، پستہ، اخروٹ، کشمش اور پنیر کے علاوہ چنے، مٹر اور سویا بین دماغ کے لیے مفید ہیں۔ فاسفورس کے علاوہ وہ سب اجزاء ہوتے ہیں جو اعصاب اور فضلات کو توانائی دیتے ہیں۔ ہلکی زود ہضم غذائیں دماغ کو تروتازہ اور بیدار رکھتی ہیں۔

عاری شخص صحت مند دماغ کا مالک ہو۔ صحت مند دماغ اور صحت مند جسم کے لیے صحیح غذا کا ہونا ضروری ہے۔ اگر غذا صحیح اور متوازن نہ ہو تو انسان دماغی اور جسمانی طور پر کمزور ہو جاتا ہے۔ جس کے اثرات ذہانت پر بھی ہوتے ہیں اور سارا جسمانی نظام متاثر ہوتا ہے۔

آج کے دور میں طرز زندگی اور غذائی عادات کی تبدیلیوں نے انسانی صحت اور دماغ کو متاثر کر دیا ہے۔ جس کے نتیجے میں ذہنی استعداد کار یا ذہانت متاثر ہو رہی ہے اور نسیان یا یادداشت میں کمی جیسے عوارضات بڑھ رہے ہیں۔ طب و صحت کے ماہرین کہتے ہیں کہ بعض غذائیں دماغی قوتوں کو توانا رکھتی ہیں جس سے ذہانت میں اضافہ ہوتا ہے۔ وہ مائیں جو اپنے بچوں کو ایسی مفید غذائیں دیتی ہیں اس سے ان کی صحت ہی بہتر نہیں رہتی بلکہ ان کی ذہنی صلاحیتیں اور دماغی استعداد کار اپنے ہم عصر ساتھیوں سے بڑھ جاتی ہے۔ پوری دنیا میں اعلیٰ تعلیمی کامیابیوں اور کامرانوں کے لیے آئی کیو کو معیار بنایا جا رہا ہے۔ یعنی قابلیت اور اہلیت کو ذہانت کی پیمائش کے ذریعے تسلیم کیا جا رہا ہے۔ اس طرح ذہنی صحت اور جسمانی صحت کی طرف توجہ دینا انتہائی اہم ہے۔

بڑھاپے کے مسائل میں یادداشت کی کمی (الزائمر) عام مسئلہ بن گئی ہے۔ اس طرح وہ تمام لوگ جو ذہانت کو قائم اور یادداشت کو بہتر بنانے کے خواہش مند ہیں انہیں دماغی طاقت کی طرف توجہ دینا ہوگی۔ ماہرین طب و صحت کا کہنا ہے کہ صحت مند جسم میں جب گردش خون (خون کا دورہ) باقاعدہ ہوتا ہے تو جسم اس کے ذریعے غذائیں دماغ کے سامنے پیش کرتا ہے جن میں سے دماغ اپنی ضرورت کی غذائیں منتخب کر لیتا ہے مگر

لیے بہت مفید ہے۔ کمزور دماغ، اعصاب اور قلب لوگوں کے لیے بہت مفید ہے۔

آملہ

آملہ غذائی اور دوائی افادیت رکھتا ہے۔ دماغ کو تقویت دیتا ہے اور یادداشت بڑھاتا ہے۔ اطباء صدیوں سے اپنی ادویہ میں استعمال کرتے آرہے ہیں۔ حیاتیات ج آملہ میں بکثرت موجود ہوتی ہے۔ خشک آملوں کا سفوف بنالیں اور برابر وزن شکر ملا لیں روزانہ ایک سے دو چمچ تازہ پانی سے کھانا مفید ہے۔ آملہ کا مربہ بھی بنایا جاتا ہے۔ جو دماغی طاقت کے لیے بہت فائدہ مند ہے۔ اس طرح بصارت پر بھی خوشگوار اثر پڑتا ہے۔ تازہ آملہ کا ایک چمچ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

بیر

بظاہر یہ ایک چھوٹا سا پھل ہے مگر ضروری غذائی اجزاء سے بھرپور ہے۔ ایک سو گرام بیروں میں 74 کیلو ریز (حرارے) ہوتے ہیں۔ بیر جسم میں گلوٹالک ایسڈ کا اخراج بڑھا دیتا ہے۔ اس طرح دوران خون تیز ہو کر دماغ کی کارکردگی بڑھا دیتا ہے۔ بیر استعمال کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ مٹھی بھر بیر خشک آدھے لیٹر پانی میں اس وقت تک ابالیں کہ پانی نصف رہ جائے پھر ضرورت کے مطابق شہد ملا کر رات ہونے سے قبل پی لیا جائے۔

کالی مرچ

کالی مرچ کو مصالحوں کی ملکہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ اعصاب کی طاقت کے لیے ٹانک کا درجہ رکھتی ہے۔ یادداشت کو بہتر بنانے میں بہت مفید ہے۔ چٹکی بھر کالی مرچ کا سفوف شہد خالص ایک چمچ میں ملا کر روزانہ چاٹ لینا کمزور دماغ والوں کے لیے مفید ثابت ہوتا ہے۔

سرخ گوشت سے بچ کر رہیں۔ درج ذیل غذاؤں کا استعمال دماغ کو تقویت دیتا ہے۔ اس طرح ذہانت بھی بڑھتی ہے۔

بادام

بادام مغزیات میں سرفہرست ہے۔ یہ ایک مفید صحت بخش غذا ہے۔ جو دماغ اور اعصاب کو قوت دیتی ہے۔ پینائی میں بھی فائدہ مند ہے۔ روزانہ پانچ سے سات بادام رات پانی میں بھگو کر صبح چھیل کر دودھ کے ساتھ کھانا چاہیے۔ ان کا مسلسل استعمال دماغی کمزوری سے محفوظ رکھتا ہے۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ بادام کی پانچ چھ عدد مغز گرائنڈ کر کے پیس لیں اور دودھ میں حسب ضرورت میٹھا کر کے اس میں ملا کر روزانہ صبح پی لیا کریں۔

دودھ

دودھ ایک مکمل غذا ہے۔ ہر عمر کے افراد کے لیے یکساں مفید ہے۔ انسان صدیوں سے گائے، بھینس، بکری، اونٹنی اور بھیڑ کا دودھ بطور غذا استعمال کرتا چلا آرہا ہے۔ دودھ میں تمام صحت بخش اجزاء پائے جاتے ہیں۔ دودھ جسمانی طاقت اور دماغی کمزوری کے لیے بہت فائدہ مند ہے۔ دودھ روزانہ صبح یا سر پہر شہد خالص ملا کر پینا چاہیے اور ہمیشہ باقاعدگی سے پینا چاہئے۔

سیب

سیب دنیا بھر میں ملنے والا اور پھلوں میں سب سے زیادہ توانائی بخش ہے۔ تمام عمر کے لوگ کھا سکتے ہیں۔ سیب میں فاسفورس تمام پھلوں سے زیادہ پایا جاتا ہے اور چھلکوں میں حیاتیات ج کی بڑی مقدار پائی جاتی ہے۔ سیب خون صالح پیدا کرتا ہے۔ دماغ کے لیے ایک موثر غذائی ٹانک ہے۔ قوت حافظہ بڑھاتا ہے۔ سیب میں پائے جانے والا ایک ایسڈ جگر، دماغ اور آنٹوں کے



سونی مندر کا آدم خور

سعید احمد صدیقی

میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور آن واحد میں اُلٹی ہوئی پاکی کے پاس پہنچ گیا۔
پاکی میں دلہن بے ہوش پڑی تھی اور دولہا غائب.....!

ایک درندے کا قصہ جس نے کئی انسانی بستیاں ویران کر دی تھیں

روزگار فراہم کرتا ہے۔ شکوہ آباد سے بارہ میل دور ہندوستان کا سب سے گہرا اور تند رو دریائے جمبل بہتا ہے۔ دریائے جمبل کے پانی کو اگر آب مقطر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ اگر کوئی سکھ پانی

مغل بادشاہ دارالشکوہ کا بسیا ہوا شکوہ آباد ہندوستان کے صوبہ یوپی میں اس لیے معروف ہے کہ یہاں ہندوستان کی ایک بڑی طب فیکلٹی ہے۔ یہ کارخانہ ارد گرد کے دیہاتوں کو بڑے پیمانے پر

لہذا حکومت بھی آدم خور کی ہلاکت میں دلچسپی لے رہی تھی۔ کئی شکاری پارٹیاں ناکام ہو چکی تھیں اور دو شکاری بھی آدم خور کا لقمہ تر بن چکے تھے۔

1954ء کا ذکر ہے مجھے اپنے ایک ہندو دوست گجرا دھر کی شادی میں سونی مندر جانا پڑا۔ ہم لوگ دلہن کو رخصت کرا کے در بٹ پور سے سونی مندر واپس آرہے تھے۔ بارات کے قافلے میں اونٹ، گھوڑے، دے اور لہرو سبھی شامل تھے۔ زیادہ تر باراتیوں کے پاس اپنی اپنی بندوقیں تھیں جو خوشی کے ایسے موقعوں پر ہوائی فائر کے لیے ساتھ لے لی جاتی ہیں۔ دولہا منہ پر نکٹ دسہرا، ڈالے اپنی دلہن کے ساتھ ایک پاکی میں بیٹھا تھا، جسے چار کھار اٹھائے بارات کے آگے آگے چل رہے تھے۔ میں ایک گھوڑے پر سوار سب سے پیچھے چل رہا تھا۔ اب بارات ایک دھلوان سے اتر رہی تھی کہ میں انتہائی بلندی پر اور پاکی انتہائی نشیب میں اور ہم دونوں کے بیچ میں باقی باراتی چل رہے تھے۔ ہم لوگ در بٹ پور سے دو میل دور آچکے تھے۔ یکا یک میں نے دیکھا باراتی بدحواس ہو کر اندھا دھند بھاگ رہے ہیں۔ پاکی اُلٹی پڑی ہے اور چیخ پکار سے جنگل گونج رہا ہے۔ میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور آن واحد میں اُلٹی ہوئی پاکی کے پاس پہنچ گیا۔ پاکی میں دلہن بے ہوش پڑی تھی اور دولہا غائب..... پاکی کے بائیں طرف خون کا ایک بڑا سادھا پھیلا ہوا تھا اور چھوٹے چھوٹے دھبے بائیں سمت کی جھاڑیوں میں جا کر غائب ہو گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ماحول کو سانپ سونگھ گیا ہو جب مجھے پاکی کے قریب کھڑے ہوئے خاصی دیر ہو گئی تو آس پاس کی جھاڑیوں میں چھپے ہوئے باراتی فائر فائر کا شور کرتے ہوئے پاکی کی طرف دوڑے ان میں سے

میں ڈال دیا بجائے تو وہ تہ میں بالکل صاف نظر آتا ہے۔ دریا کے دونوں طرف گھنے جنگل ہیں جن سے شیشم و ساگوان، کیکڑ، پیلو اور دیگر عمارتی لکڑی بکثرت دستیاب ہوتی ہے۔ دریائے جمل کے بائیں کنارے تقریباً بیس میل کے طویل علاقے پر مونج (سرکنڈے) کا جنگل پھیلا ہوا ہے۔ اب سے بارہ سال پہلے جب اس فوج اور ناکون کارواج نہ تھا تو یہ جنگل شکوہ آباد کی طب فیکٹری کے لیے بڑی اہمیت کا حامل تھا کیونکہ بلب کی پیننگ کے لیے لکڑی کی ٹیٹیوں میں مونج کے ریشے کام میں لائے جاتے تھے۔ مونج کی کٹائی کرنے والے افراد نے سرکاڈوں کے اس جنگل کے کنارے ایک بستی بسائی تھی۔ دریا کے دونوں کناروں پر پھیلے ہوئے جنگل میں ہرن، چیتل، بارہ سنگھے، نیل گائے، سور اور شیروں کی کثرت تھی۔

جمل کے گھاٹ سے تین میل دور دریا اُلٹا بہتا ہے یعنی بہاؤ بجائے مغرب مشرق کے مشرق سے مغرب کی سمت ہو جاتا ہے۔ شاید دریا کے اسی غیر معمولی بہاؤ کی بنا پر دریا کے کنارے سے ایک سو مندر ایک قطار میں بنے ہوئے ہیں۔ ان مندروں کے قریب جو بستی ہے اُسے کبھی سو مندر کے نام سے پکارا جاتا تھا جو اب بگڑتے بگڑتے سونی مندر ہو گیا تھا۔ بہت مدت سے سونی مندر کے اطراف میں ایک آدم خور ٹیر نے تباہی مچا رکھی تھی۔ مونج کے جنگل کے مزدوروں کی بستی اجڑ چکی تھی جس کی وجہ سے شہر کی بلب فیکٹری کے لیے پریشانی کا سامنا تھا۔ سونی مندر میں ہر سال مویشیوں کا ایک بڑا میلہ لگاتا تھا۔ لاکھوں کی خرید و فروخت ہوتی۔ حکومت کو اس میلے سے بڑی آمدنی تھی۔ اُس سال آدم خور کے خوف سے مہربہ بڑی طرح متاثر ہونے والا تھا

ہیں۔ گاؤں کی عورتیں بیوہ لڑکی کو منحوس اور اس حادثے کا موجب قرار دے رہی تھیں۔ میں اس حادثے سے اس قدر متاثر ہوا کہ جی چاہتا تھا کہ ابھی بندوق لے کر جنگل میں گھس جاؤں اور اُس خوفناک بلا کے چیتھڑے اڑا کے رکھ دوں جس نے دو کلیوں کو کھلنے سے پہلے ہی مسل ڈالا تھا۔ وہ رات میں نے جاگ کر گزاری۔ صبح ہوتے ہی بد نصیب دلہن کو دولہا کی موت کی منحوس خبر کے ساتھ ہی در بٹ روانہ کر دیا گیا اور میں نے بھی اپنا رخت سفر باندھا لیکن سونی مندر سے روانہ ہوتے وقت میں نے عزم معمم کیا کہ میں جلد ہی آدم خور درندے سے دو دو ہاتھ کرنے سونی مندر پھر واپس آؤں گا اور اپنے دوست کا بدلہ لیے بغیر چین سے نہ بیٹھوں گا..... یا تو میں درندے کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا یا خود گجادر کی طرح اس کا لقمہ بن جاؤں گا۔

شہر آکر کاروباری مصروفیات اور دیگر ہنگاموں نے کچھ اس طرح گھیرا کہ سر اٹھانے کی فرصت نہ مل سکی۔ دو ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ اس عرصے میں آدم خور کی خون آشامی کی خبریں اخبار کی سرخیاں بنتی رہیں۔ اس کی ہیبت سے سونی مندر کے آس پاس کی بستیاں ویران ہو گئی تھیں۔ کھیتوں میں ریت اُڑنے لگی تھی کیوں کہ کسان کھیتوں پر کاشت کرنے سے گھبراتے تھے۔ درندہ اس قدر نڈر ہو چکا تھا کہ دن دیہاڑے گھروں میں گھس کر اپنا حصہ اٹھالے جاتا۔ ڈنڈی سکون میسر آیا تو ایک روز میں نے ایک شکاری دوست انوار خاں پر اپنے ارادے کا اظہار کیا اور اُن کی رفاقت کی خواہش کی۔ پہلے تو انہوں نے پس و پیش کی لیکن جب میں نے انہیں انسانیت اور غریبوں کی زندگی کا واسطہ دیا تو موم ہو گئے۔ آخر کار دو ماہ کے بعد میں انوار خاں کو اپنے ساتھ لے کر آرام

بعض بندوقوں سے ہوائی فائر بھی کرتے جاتے تھے۔ بالکی کے ایک کمار کو میں نے بازو سے پکڑ کر بچھوڑتے ہوئے پوچھا:-

”کیا بات ہے؟ مجھے بتاؤ کیا ہوا؟ گجادر کہاں ہے؟“

کمار کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا اور وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اُس نے بمشکل ہکلاتے ہوئے بتایا کہ جب وہ بالکی اٹھائے ڈھلان کے آخر میں پہنچے تو یکا یک سڑک کے کنارے سے جھاڑی میں چھپا ہوا شیر اُن کی طرف لپکا۔ شیر کو دیکھتے ہی انہوں نے بالکی کو کھڑے سے چھوڑ دیا اور جان بچا کر ادھر ادھر بھاگ گئے۔ دولہا اور دلہن سڑک پر گر پڑے اور ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ شیر دولہا کو منہ میں دبا کر سڑک کی بائیں طرف جھاڑیوں میں روپوش ہو گیا۔

میں نے جلدی سے ایک باراتی کی توڑے دار بندوق چھینی اور جھاڑیوں میں گھستا چلا گیا۔ سڑک سے تقریباً سو گز دور گجادر کی لاش ایک سوکھی جھاڑی میں پھنسی ہوئی مل گئی۔ شیر نے اس کا زرخہ چبا ڈالا تھا اور چہرہ مسخ کر دیا تھا۔ قریب ہی مکٹ پڑا تھا تھوڑی دیر میں بہت سے باراتی شور کرتے ہوئے میرے پاس پہنچ گئے۔

میں نے بہت کوشش کی کہ گجادر کی لاش ایک رات کے لیے وہیں پڑی رہنے دی جائے تاکہ آدم خور کا شکار کیا جاسکے۔ لیکن باراتی کسی قیمت پر رضا مند نہ ہوئے۔ میں بھی لوگوں کے جذبات اور موقع کی نزاکت کے پیش نظر خاموش ہو گیا۔ باراتی جب حسرت زدہ دلہن اور گجادر کی مسخ شدہ خون میں نہائی ہوئی لاش لے کر سونی مندر میں داخل ہوئے تو گجادر کے گھر کی عورتوں کے بین اور آہ وزاری کی حالت بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں

خور سے نپٹنے کے لیے پھر سونی مندر کی طرف روانہ ہو گیا۔

جس وقت بس نے ہمیں جھل گھاٹ اتارا شام کے سائے طویل ہونے لگے تھے۔ کشتی میں بیٹھ کر ہم نے جھل پر کیا اور سونی مندر کے لیے روانہ ہو گئے۔ ابھی ہم گھاٹ سے بمشکل ایک میل دور گئے ہوں گے کہ سائے سے چند دیہاتی چارپائی پر ایک مردے کو لیے آتے نظر آئے یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ جھل گھاٹ ہندوؤں کا شمشان بھی تھا جہاں وہ مردے جلا کر اُن کی راکھ جھل کی لہروں کی نذر کر دیے تھے۔ لاش تریب آئی تو میں چونک پڑا کیوں کہ اُن پر پڑے ہوئے سفید کپڑے پر جگہ جگہ خون کے دھبے بکھرے ہوئے تھے میں نے ایک دیہاتی کو روک کر معلوم کیا کہ کیا قصہ ہے؟ اس نے بتایا کہ وہ سونی مندر کے ایک پجاری کی لاش ہے جسے درندے نے اُس وقت نشانہ بنایا جب کہ وہ رفع حاجت کے لیے مندر سے تھوڑے فاصلے پر جھاڑیوں کے قریب بیٹھا تھا۔ آدم خور نہ جانے کب سے وہاں گھاٹ لگائے بیٹھا تھا۔ درندہ پجاری پر پیچھے سے حملہ آور ہوا اور اس سے پہلے کہ پجاری سنبھلا اس کی گردن موزا درندے کے آہنی جبروں میں تھی۔ یہ سارا منظر مندر کی چوٹ پر کھڑا ہوا دوسرا پجاری دیکھ رہا تھا۔ اُس نے وہیں سے باگھ باگھ کی کاشور بلند کیا۔ غل غپاڑہ سن کر دوسرے مندروں سے پجاری لکھنے اور چیخنے چلاتے اس طرف دوڑے جدھر آدم خور پجاری کو لے کر غائب ہوا تھا شور اور ہنگامے سے گھبرا کر شیر نے پجاری کی ایک ہی ٹانگ کھانے پر اتفا کیا اور نش چھوڑ کر فرار ہو گیا۔

میں نے اُن دیہاتیوں کو بتایا کہ ہم لوگ آدم خور کو مارنے کے لیے آئے ہیں اگر وہ آج رات پجاری کی

لاش وہیں رہنے دیں جہاں سے یہ اٹھائی گئی ہے تو ممکن ہے کہ آدم خور کو ٹھکانے لگایا جاسکے لیکن وہ اپنے مذہبی پیشوا کی مزید بے حرمتی کے لیے تیار نہ ہوئے اور میرے ہزار سمجھانے کے باوجود لاش لے کر مرگھٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن مجبور تھا کیا کر سکتا تھا۔ ایک بار خیال آیا کہ جب ان گمناموں کو خود اپنی اچھائی برائی کا احساس نہیں تو ہمیں کیا پڑی ہے کہ دوسروں کے پھڈے میں ٹانگ اڑاتے پھریں لیکن مہا گجا دھر کی موت نے مجھے اس ارادے سے باز رکھا۔ پھر تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے سونی مندر کی طرف روانہ ہوئے۔

میں نے راستے میں انوار خاں سے مشورہ کیا کہ اگر آج رات ہی ہم لوگ اُس جگہ آدم خور کے انتظار میں بیٹھیں جہاں سے پجاری کی لاش اٹھائی گئی ہے تو ممکن ہے کچھ کام بن جائے۔ انوار خاں نے کہا:

”لاش اٹھائی جا چکی ہے، اس لیے درندے کی واپسی کا امکان کچھ کم ہی ہے بہر حال اہتمام حجت کے لیے اگر آج رات گھاٹ میں بیٹھا جائے تو کوئی حرج بھی نہیں۔“

سونی مندر پہنچ کر ہم نے لوگوں سے مختلف معلومات حاصل کیں۔ اس بستی کے باشندے اس قدر سہمے ہوئے تھے کہ درندے کو مافوق الفطرت ہستی سمجھتے تھے۔ بعض کمزور عقیدہ لوگوں کا خیال تھا کہ آدم خور گنیش دیوتا کا دوسرا روپ ہے۔ دو سال پہلے انہی مندروں میں سے ایک مندر کے پجاری نے گاؤں کی ایک دوشیزہ کو خراب کیا تھا اور رات ہی رات کہیں فرار ہو گیا تھا۔ شدت غم اور احساس ذلت سے گھبرا کر لڑکی نے دوسری صبح جھل کی لہروں میں چھلانگ لگا دی اور چند روز میں گنیش دیوتا نے شیر کا روپ دھار کر اس بستی کے پاپی

ہوا تھا۔ تاہم گلابی جاڑوں کی کیفیت پاکی جاتی تھی ہم جس درخت پر درندے کی گھات میں بیٹھے تھے اس کے سامنے ہی بیس گز قطر کا کھڑا تھا جو سخت زمین ہونے کی وجہ سے نباتات سے محروم تھا اور یہی وہ جگہ تھی جہاں سے پجاری کی لاش اٹھائی گئی تھی۔ چاندنی رات میں خون کے بڑے بڑے سیاہ دھبے درخت سے بھی نظر آرہے تھے۔ یہ ٹکڑا سرکنڈوں اور گھنی جھاڑیوں سے گھرا ہوا تھا۔ ہم لوگ درخت پر شام سات بجے بیٹھے تھے۔ اب اس وقت میری ریڈیم ڈائل گھڑی رات کے دو بجارہی تھی۔ سات گھنٹے کی اس بے حس و حرکت نشست نے اعضاء شل کر دیئے تھے۔ درخت کا غلاف اُتار کر نیچے رکھ لیا۔ ہٹا کھڑکتا تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی۔ آنکھیں بدستور چنیل قطعے پر مرکوز تھیں۔

اچانک سامنے سرکنڈوں میں دو انگارے دکھتے نظر آئے اور رائفل پر میری گرفت سخت ہو گئی۔ انوار خاں نے پرندے کی آواز نکالی جو خطرے کی علامت تھی اور اس بات کا اشارہ کہ جھاڑیوں میں چھپی ہوئی آنکھیں انہوں نے بھی دیکھ لی ہیں۔ انوار خاں کو اپنے حلق سے پرندوں اور درندوں کی آوازیں نکالنے کی بڑی قدرت حاصل تھی اور اُن کے اس فن نے اکثر اوقات شکار میں ہماری بڑی معاونت کی تھی۔ جھاڑیوں میں حرکت ہوئی وہ دونوں آنکھیں باہر آئیں۔ رائفل پر میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی کیونکہ ہمارے سامنے ایک قد آور جنگلی بلا کھڑا تھا۔ اُس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر دوسری طرف جھاڑیوں میں چھلانگ لگادی۔

”غور بھائی آج کی رات تو خوار ہوئے، اب مشکل ہے“ انوار خاں کی سرگوشی سنائی دی۔

”میرا بھی یہی خیال ہے“ میں نے بھی آہستہ

لوگوں سے بدلہ لینا شروع کر دیا تھا۔ بے جان پتھروں کی پرستش کرتے کرتے ہندو عقل کا ایسا دشمن ہو جاتا ہے کہ وہ کسی بھی ایسی بات پر آسانی سے یقین کر لیتا ہے کہ جس کی کوئی تاویل نہیں ہو سکتی۔ لہذا ان سادہ لوح لوگوں سے بحث فضول تھی۔ میں نے اُن سے وہ جگہ دکھانے کو کہا جہاں سے پجاری کی لاش اٹھائی گئی تھی۔ دو دیہاتی اس شرط پر ہمارے ساتھ جانے کے لیے رضا مند ہوئے کہ انہیں واپس بستی میں چھوڑ دیا جائے گا۔

شام ڈھل چکی تھی رات کے سیاہ گیسو پھیلنے شروع ہو گئے تھے۔ اتنے مختصر عرصے میں مچان باندھنا ممکن نہ تھا۔ پجاری کی لاش کے اطراف میں رات گزارنے کے لیے جب نظر دوڑائی تو خوبی قسمت سے اُس جگہ سے تقریباً پچاس قدم کے فاصلے پر مہوے کا ایک گھنا درخت نظر آیا۔ جگہ کا انتخاب کر کے ہم لوگ دیہاتیوں کو سونی مندر چھوڑنے گئے اور جلد ہی پھر واپس آ گئے۔ لاش کے مقام سے سو گز کے نواحی علاقے کا ایک بار جائزہ لیا اور پھر میں خان صاحب کو لے کر مہوے کے درخت پر چڑھ گیا۔ زمین سے تقریباً دس فٹ بلندی پر درخت کا تنا دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ نچلے دو شاخے میں، میں اور اوپر کے دو شاخے میں انوار خاں بیٹھ گئے۔ دن بھر کے سفر کی تھکان تھی لہذا ہم نے تھرماس میں ایک ایک کپ چائے نکال کر پی اور پھر آنے والے ہيجان خیز لمحات کے لیے تیار ہو گئے۔

جنگل کی چاندنی رات سے وہی لوگ واقف ہیں جنہیں سحر انگیز راتیں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے ان راتوں میں فطرت محو گفتگو ہوتی ہے یہ بھی ایسی ہی ایک رات تھی۔ آسمان پر چودھویں کا چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اگرچہ ابھی موسم سرما شروع

سے جواب دیا۔

نے سر اٹھا کر سوالیہ انداز میں انوار خاں کی طرف دیکھا۔ میرے سارے حواس جاگ اُٹھے تھے۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ میری آنکھیں ریچھ کی لاش پر جمی تھیں اور کان کسی غیر معمولی آہٹ پر لگے تھے۔ تقریباً نصف گھنٹہ اس کریناکہ کیفیت میں گزر گیا لیکن پھر شیر کی آواز سنائی نہ دی، مگر میری شکاری حس کہہ رہی تھی کہ جنگل کا بادشاہ ہم سے زیادہ دُور نہیں ہے۔ تجربہ کار شکاری جانتے ہیں کہ جب شیر طویل آواز میں دھاڑتا ہے تو یہ اعلان کرتا ہے کہ یہ علاقہ ممنوعہ ہے جس میں مداخلت بیجا برداشت نہیں کی جائے گی۔ ہر شیر کا ایک معینہ علاقہ ہوتا ہے اور اس قسم کی مخصوص دھاڑ دوسرے علاقے کے شیروں کو ایک قسم کی تنبیہ ہوتی ہے میرے اعصاب اونگھنے لگے تھے کہ میں نے سامنے والی جھاڑیوں میں شورش محسوس کی اور دوسرے ہی لمحے ایک تھامسن گیزل (ہرن کی ایک نسل) گھبرایا ہوا کھلے قطعہ زمین پر ریچھ کی لاش کے قریب آکر رُکا۔ وہ جس سمت سے آیا تھا اُسی سمت بار بار دیکھ رہا تھا۔ جیسے اُس کا تعاقب کیا جا رہا ہو۔ ہرن فوراً ہی قلاںچیں بھرتا دوسری طرف جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ کوئی درندہ اس کے تعاقب میں ہے اور اسی خیال کے ساتھ رانقل کاندھے اور انگلی ٹریگر پر جم گئی۔ دل کی غیر معمولی دھڑکنوں پر قابو پایا اور آنے والے نجات کا بے تابی سے انتظار کرنے لگا۔ شاید یہی کیفیت انوار خاں کی بھی تھی۔

جھینگروں کی جھانکیں جھانکیں رُک گئی اور جنگل کی خاموشی نے اسرار کا لہادہ اوڑھ لیا۔ سامنے جھاڑیوں میں پھر ایک بھونچال سا آیا اور سرکنڈوں کے پیچھے دو انگارے دکھنے لگے۔ انوار خاں نے اُلو کی آواز نکالی اور مجھے سینے میں سانس رُکتا ہوا محسوس ہوا۔ دوسرے

جھاڑیوں میں پھر زور سے حرکت ہوئی اور اب ہمارے سامنے ایک سیاہ ریچھ کھڑا تھا۔ اسی اثناء میں دوسری طرف سے ایک موٹا تازہ جنگلی سور نمودار ہوا۔ سور کے اوپر جڑے کے دونوں طرف لمبی سفید اور تیز کا نہیں ڈلی ہوئی تھیں۔ ریچھ نے صاف میدان کا ایک چکر لگایا، پنجوں سے زمین کھرچی اور حلق سے گھٹی گھٹی کی سیٹی نما تیز آوازیں نکالنے لگا۔ سور چند قدم پیچھے ہٹا اور پھر سر نیچا کر کے تیر کی طرح ریچھ کی طرف لپکا۔ ریچھ ایک طرف ہٹ گیا اور سور اپنے زور میں جھاڑیوں میں گھستا چلا گیا لیکن فوراً ہی پھر میدان میں آڈٹا۔ اس بار ریچھ کی باری تھی وہ اپنے پچھلے دونوں پیروں پر کھڑے ہو کر خوفناک انداز میں چیخا اور دونوں ساقوں کو ہٹا ہو گئے۔ ان کی بھیانک چیخوں سے جنگل کو بخنہ لگا۔ سور ایک بار پھر پیچھے ہٹا۔ چند لمحے کھڑا ہانپتا رہا اور پھر چیخ مار کر ریچھ پر چڑھ پڑا۔ دوسرے ہی لمحے ریچھ بُری طرح ڈکرایا اور اُس کی آستینیں باہر نکل پڑیں۔ سور نے اپنی خنجر نما کانپیں ریچھ کے پیٹ میں اتار دی تھیں۔ اب ریچھ زمین پر پڑا مای بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد ریچھ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس اثناء میں سور تھوڑے فاصلے پر کھڑا ہانپتا رہا۔ وہ شاید ریچھ کے دوبارہ حملہ آور ہونے کا انتظار کر رہا تھا جب اُسے یقین ہو گیا کہ اس کا حریف شہنشاہ ہو چکا ہے تو اُس نے ایک کرخت آواز نکالی گویا یہ اعلان رنج تھا اور پھر دوسری طرف جھاڑیوں میں روپوش ہو گیا۔

”بھیا انوار..... رہی سہی کسر ان کمبختوں نے پوری کر دی“ میں نے کہا۔

اچانک قریب سے شیر کی دھاڑ سنائی دی اور میں

اللہ کے رسول دین کے پیغمبر جو حیات و کائنات کی بنیاد ہیں

سیارہ ڈائجسٹ

کا
عظیم الشان اور روح پرور



قیمت: 175 روپے ایڈیشن شائع ہو گیا ہے

اپنی سابقہ روایات کے شایان شان یہ نمبر پیغمبرانِ خدا کی
حیاتِ جاوداں اُن کے معجزات اور ایمان افروز واقعات پر مشتمل
ایک متاعِ بے بہا اور جامع دستاویز ہوگا۔

ایجنٹ حضرات فوری طور پر اپنے آرڈر سے مطلع فرمائیں

سیارہ ڈائجسٹ: 240 مین مارکیٹ ریواڑ گاؤں لاہور۔ فون: 37245412

میں دس بارہ دیہاتی بھاگتے ہوئے ہمارے پاس پہنچے۔ انہوں نے شیر کی لاش کو دیکھا اور مجھے اور انوار خاں کو اٹھا کر تپنے لگے۔

دن چڑھتے چڑھتے آدم خور کی ہلاکت کی خبر جنگل میں آگ کی طرح آس پاس کے دیہاتوں میں پھیل گئی اور لوگ جوق در جوق سونی مندر کی اُس بلا کو دیکھنے آنے لگے جس نے گاؤں کے گاؤں ویران کر دیئے تھے۔ یہ لمحہ بلاشبہ مسرت انگیز تھا لیکن میرے دل میں ایک کسک رہ گئی تھی کہ آدم خور کو میں نے نہیں انوار خاں نے ہلاک کیا تھا۔ سونی مندر کے کھیا ہر چند اس نے خود ہمیں ہار پہنائے اور شام کو ہماری دعوت کا ایک شاندار پروگرام بنایا گیا۔

شام ہوتے ہی سونی مندر کی گڑھی میں ایک جشن منعقد ہوا جس کے مہمان خصوصی میں اور انوار خاں تھے۔ کھیا نے قریب کے دیہات سے رقص کے لیے دو ”پٹرلوں“ کو بھی بلالیا تھا۔ ایسی شراب پانی کی طرح بہہ رہی تھی۔ تاج درنگ کی یہ محفل شباب پر تھی کہ ایک بڑھیا چیختی چلاتی چوپال میں داخل ہوئی۔ اُس نے بین کرتے ہوئے کھیا کو بتایا کہ آنگن میں کھانا کھاتے ہوئے اُس کے بیٹے کو شیر اٹھا کر لے گیا۔ ساری محفل کو سانپ سونگھ گیا اور سب کی نگاہیں ہمیں گھورنے لگیں گویا سوال کر رہی ہوں ”تم لوگوں نے کس آدم خور کو مارا تھا؟“

اب میری سمجھ میں آیا کہ آدم خور کے دھوکے میں کوئی دوسرا شیر مارا گیا۔ آدم خور ابھی زندہ تھا۔ میں نے بڑھیا کو تسلی دینی چاہی، لیکن اس کا غم کچھ وہی سمجھ سکتی تھی۔ فرط غم سے تھوڑی دیر بعد وہ بے ہوش ہو گئی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ رات کے وقت آدم خور کا تعاقب کس طرح کیا جائے۔ رات کے وقت ایسے درندے کا تعاقب جس کے قبضے میں شکار ہوا اپنی

ہی لمحے آدم خور کھلے میدان میں نکل آیا۔ اس نے بڑی شان بے نیازی سے گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی میں سندر ابن اور پہلی بھیت کے جنگلوں میں آزاد شیروں کا نظارہ کر چکا تھا لیکن زندگی میں اتنا خوبصورت شیر پہلی بار نظر سے گزرا تھا۔ چاندنی رات میں اُس کے جسم کا ایک ایک عضو چمک رہا تھا۔ بازوؤں کی ابھری ہوئی ترشیدہ مچھلیاں اُس کی بے پناہ قوت کی نقیب تھیں۔ سستی ہوئی کمرنگان کی طرح اکڑی ہوئی تھی۔ وہ ریچھ کی لاش کی طرف بڑھا۔ میں شیر کی صورت میں قدرت کی مٹامی میں اس قدر محو ہو گیا کہ گولی چلانے کا خیال نہ رہا۔ خُسن بہر حال خُسن ہے اور خُسن کے ساتھ ظلم کوئی سنگ دل ہی کر سکتا ہے۔ اچانک دھماکے نے مجھے چوٹا دیا۔ انوار خاں نے فائر کر دیا تھا۔ فائر کے ساتھ ہی شیر فضا میں اچھلا اور پھر گر کر تڑپنے لگا۔ دوسرا فائر ہوا اور درندہ خاموش ہو گیا۔

”خُسن کم جہاں پاک“ انوار نے کہا۔

ابھی درخت سے اترتا خطرے سے خالی نہیں تھا لہذا پو پھٹنے تک ہم دونوں درخت ہی پر بیٹھے رہے۔ مرغاب سحر کی چھبھاہٹ کے ساتھ ہی ہم لوگ درخت سے اترے اور چند ڈھیلے اٹھا کر درندے پر پھینکے اور جب اُس کی موت کا یقین ہو گیا تو ہم اُس کی لاش کے قریب پہنچے۔ انوار خاں کی پہلی گولی درندے کی آنکھوں کے بین بیچ میں پیشانی پر اور دوسری پائیں کو لہے میں لگی تھی۔ شیر کی لمبائی کم و بیش نو فٹ تھی۔ ابھی ہم درندے اور ریچھ کی لاشوں کا جائزہ لے ہی رہے تھے کہ بہت سے لوگوں کے زور زور سے سے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ رات کو ہونے والی فائرنگ کی آوازیں شاید دیہاتیوں نے بھی سن لی تھی اور اب وہ ہماری تلاش میں آرہے تھے۔ تھوڑی دیر

درخت تھا جس پر چان باندھا جاسکے اور نہ چھپ کر بیٹھنے کے لیے مناسب جگہ.....

”کیا خیال ہے انوار خاں؟“

”بھائی غور..... کھلے میدان میں شیر اور وہ بھی

آدم خور شیر کا مقابلہ..... میں تو مشورہ نہ دوں گا۔“

”لیکن اگر یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو پھر ہم درندے کی گرد بھی نہ پاسکیں گے۔“

”پھر کیا کیا جائے؟“ انوار خاں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ دیکھئے.....!“ میں نے سامنے کی عمودی

پھاڑی کی طرف اشارہ کیا جو جھاڑی سے تقریباً پچاس قدم کے فاصلے پر ایستادہ تھی۔ پھاڑی کے دامن میں ایک نالہ بہہ رہا تھا۔ چوٹی سے کوئی بیس گز نیچے ایک قدرتی طاق نما غار تھا..... ”کیوں نہ اُس غار میں بیٹھا جائے۔“

”لیکن..... اس میں تو ایک آدمی بھی مشکل سے بیٹھ سکے گا۔“

”آئیے! گاؤں میں چلیں اس کا بھی کوئی انتظام ہو جائے گا۔“ میں نے کہا اور ہم دونوں تیزی سے گاؤں کی طرف پلٹے۔

سونی مندر آکر ہم نے چند بانس، کدالیں، پھاڑے اور دو دیہاتیوں کو ساتھ لیا اور پھر نالے کی طرف روانہ ہو گئے۔ سہ پہر ہونے تک مخدوش جھاڑی سے دس گز دور میں نے ایک قد آدم گڑھا کھدوالیا۔ انوار خاں کو غار کی طرف بھیج دیا اور میں خود اللہ کا نام لے کر گڑھے میں اتر گیا۔ دیہاتیوں نے گڑھے کے منہ پر بانس رکھ کر اوپر سے جھاڑیاں کاٹ کر ڈال دیں اور پھر وہ ہمیں جنگل کے حوالے کر کے سونی مندر واپس چلے گئے۔

سورج چھپا جنگل انگڑائیاں لے کر بیدار ہونے

موت کو جان بوجھ کر دعوت دینا تھا۔ لہذا ہم نے فیصلہ کیا کہ صبح ہوتے دونوں درندے کی تلاش میں نکلیں گے۔ میں نے اور انوار خاں نے ساری رات چائے اور سگریٹ پی پی کر گزاری۔

صبح ہوتے ہی بڑھیا کے کچے مکان کی طرف نشاندہی کرتے ہوئے خون کے دھبوں کے سہارے ہم آدم خور کے تعاقب میں روانہ ہو گئے۔ تھوڑی دور جا کر ایک جگہ بہت سا خون اور بدنصیب نوجوان کے پیٹ کی آلائش پڑی ہوئی ملی۔ یہاں بیٹھ کر درندے نے اپنا دوزخ بھرا تھا۔

”لیکن لاش کہاں گئی؟“ میں نے جیسے خود سے

سوال کیا۔

”قریب ہی کہیں ہوگی“ انوار نے کہا اور لاش کھینچنے جانے کی لکیروں کے تعاقب میں جنوب کی طرف چل پڑے، تقریباً سو قدم آگے جا کر ہم نے ایک جھاڑی کی شاخ میں پٹا ہوا خون آلود کپڑا الجھا ہوا دیکھا۔ جھاڑی کے اوپر بڑی بڑی کھیاں بجنھنا رہی تھیں۔ میں نے انوار خاں کا شانہ دبایا اور رائفلوں پر ہماری گرفت سخت ہو گئی۔ میں نے چند ڈھیلے اٹھا کر جھاڑی میں پھینکے۔ لیکن کوئی رد عمل نہ ہوا۔ اپنے پورے حواس جمع کر کے میں اور انوار خاں جھاڑی کی طرف اس طرح بڑھے کہ میرا منہ جھاڑی کی طرف اور انوار خاں کا مخالف سمت میں تھا۔ ہماری پشتیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں۔

قریب پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ نوجوان کی نصف سے زیادہ کھائی ہوئی لاش جھاڑی کے اندر پڑی تھی۔ درندے نے اسے لشک چٹوں سے ڈھانپ دیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ آدم خور لاش پر پھر آئے گا۔ میں نے گردن و اوج کا جائزہ لیا بد قسمتی سے قریب نہ تو کوئی

کو ہٹا کر تیزی سے باہر آ گیا۔ اللہ کا نام لے کر نشانہ لیا اور ٹریگر دبا دیا۔ جنگل ایک ہولناک دھاڑ سے گونج اٹھا۔ آدم خور بچے آم کی طرح پہاڑی کی چوٹی سے لڑھکتا ہوا نالے میں انوار خاں کی رائفل کے قریب آپڑا اور اُس کے سر سے اُلٹے ہوئے خون نے نالے کا پانی رنگین کر دیا۔

انوار خاں کو میں نے فوری طور پر اترنے سے منع کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ اس نازک صورت حال نے اُن کے حواس کو ضرور متاثر کیا ہوگا ممکن ہے کہ اترنے میں بدحواس ہو کر کہیں گرنہ پڑیں تھوڑی دیر بعد انوار خاں بھی نیچے اتر آئے۔ اُن کا جسم پسینے سے شرابور اور چہرہ خوف سے سفید ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں نے مل کر درندے کی لاش پانی سے باہر نکال کر ڈال دی۔

درندے کی آدم خوری کا سبب بعد میں معلوم ہوا۔ مُردہ درندے کا دایاں پنجہ پھول کر کپا ہو گیا تھا اور پنجے کی گندی نماتھیلی میں سیبہ کا کاٹا ٹوٹا ہوا چمک رہا تھا۔ کسی وجہ سے درندے نے سیبہ پر حملہ کر دیا تھا اور اس حملے کے بدلے اُسے سیبہ کا زہریلا اور کبھی نہ سڑنے والا کاٹا انعام کے طور پر ملا تھا۔ ایک پیر بیکار ہونے کی وجہ سے وہ ہرن اور دوسرے جانوروں کا نہ تو تعاقب کر سکتا تھا اور نہ شکار۔ لہذا پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے اس نے انسان جیسے کمزور اور آسان شکار پر اکتفا کر لیا تھا۔

بہر حال ہم لوگ اب سونی مندر کے باشندوں کے سامنے سرخرو تھے۔ ہماری کئی روز کی تک و دو شر آور ثابت ہوئی اور اس طرح میرے دوست کے قاتل اور سونی مندر کی آدم خور بلا کا قصہ تمام ہوا۔

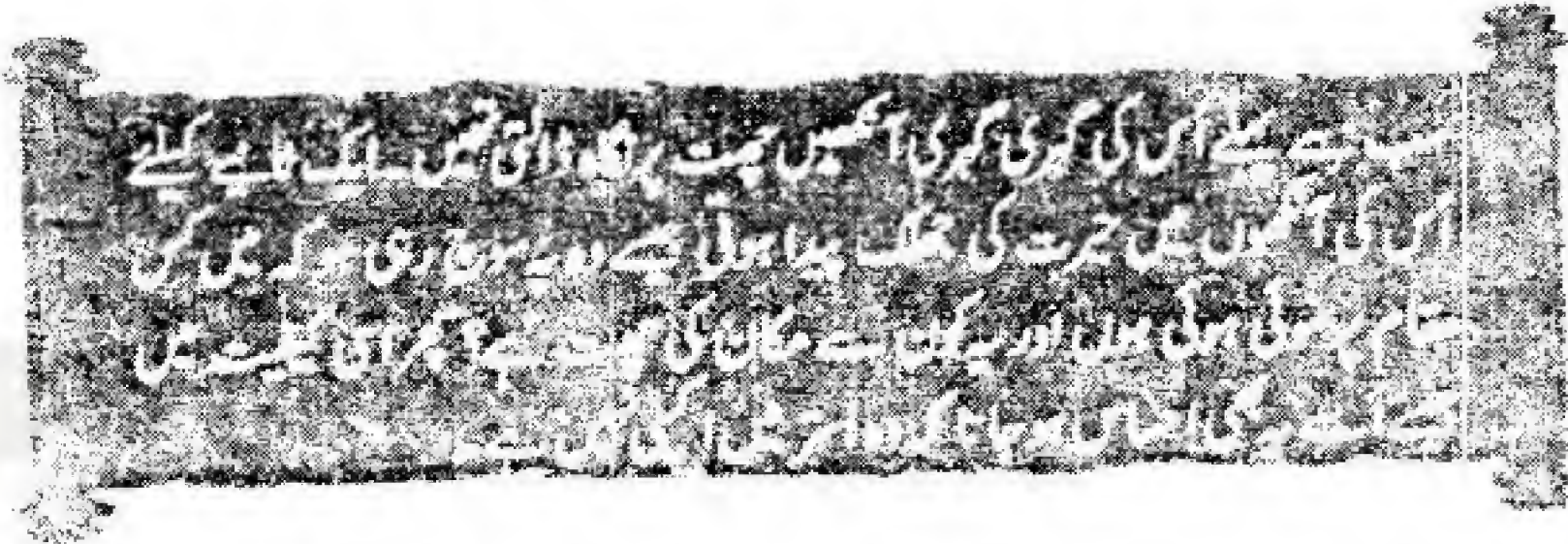


لگا۔ نالے میں بہتے ہوئے پانی کی کل کل سنائی دے رہی تھی۔ مجھے گڑھے میں بیٹھے نصف گھنٹہ ہو چکا تھا۔ آدم خور کے آنے کا کوئی امکان نہ تھا لیکن اپنے تجسس کو تسلی دینے کے لیے میں نے رائفل کی بیرل سے گڑھے کے منہ پر پڑی ہوئی بریدہ جھاڑیوں کو ہٹا کر پہاڑی کی طرف دیکھا۔ انوار خاں غار میں چاق و چوبند بیٹھے تھے۔ یکا یک شیر کی دھاڑ سنائی دی اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ شیر کہیں دور پہاڑی کے پیچھے دھاڑا تھا۔ انوار خاں نے بھی پہلو بدلا۔ خاصی دیر ہو گئی لیکن پھر کوئی آواز سنائی نہ دی لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ درندہ ہمارے آس پاس ہی کہیں چھپا بیٹھا ہے اور ہماری حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا ہے۔ میں کبھی نوجوان کی لاش کی طرف دیکھتا اور کبھی انوار خاں کی طرف..... اپنا تک میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلتا محسوس ہوتا۔ پہاڑی کی چوٹی پر عین طاق نما غار کے اوپر درندہ اپنے دونوں اگلے پیروں کو نیچے کی طرف پھیلا کر انوار خاں کے پاس پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن پہاڑی کے سیدھا ہونے کی وجہ سے اُسے دقت پیش آرہی تھی۔ درندہ شاید کہیں چھپ کر ہم لوگوں کی نقل و حرکت دیکھ رہا تھا اور خاموشی سے انوار خاں کے سر پر جا پہنچا تھا۔

”انوار خاں..... ہوشیار..... اوپر شیر ہے“ میں پھپھروں کی پوری قوت صرف کر کے چیخا گھبراہٹ میں انوار خاں کے ہاتھ سے رائفل چھوٹی اور پتھروں سے ٹکراتی ہوئی پتے ہوئے نالے میں جا پڑی۔ صورت حال بڑی نازک ہو گئی تھی۔ ایک بار تو درندہ اپنا جسم پھیلا کر گڑھے کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ ”فائر کرو غفور.....!“ انوار خاں کی گھٹکھٹائی آواز بلند ہوئی۔ میں گڑھے کے اوپر پڑی ہوئی جھاڑیوں

نایافت

نیم سحر



ایک شخص کا فسانہ جس کی بیوی روز اٹھتے ہی اسے لازوال مسکراہٹ کیساتھ دیکھتی تھی

خطوط، منی آرڈر یا پنشن وغیرہ وصول کرنے کے لیے وہاں پہنچتے ہیں اور انتظار کے طویل لمحات عجیب سی بیزاری بے عبری اور بے چینی کے عالم میں گزارتے ہیں۔ ان میں سے کئی لوگ روزانہ ان خطوط یا منی آرڈروں کے حصول کے لیے وہاں صبح سے شام کر دیتے

ڈاک خانے کی بڑی عمارت میں قسم قسم کے لوگ آتے ہیں اور اس طرح وہاں ایک مخصوص ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ ڈاک خانے کی عمارت جس قدر بوسیدہ ویران اور خاموش خاموش لگتی ہے وہاں جمع ہونے والے لوگوں کی افراط طبع اتنی ہی مختلف ہوتی ہے۔ یہ لوگ اپنے اپنے

ہیں جو کبھی انہیں چکے۔

جس روز میں وہاں گیا اُس روز ایک شخص کا اضطراب قابل دید تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ چند لمحات میں کوئی پانچ مرتبہ کھڑکی کی طرف بڑھا اور کھڑکی سے کوئی جواب سن کر مایوسی کے عالم میں پیچھے ہٹ گیا۔ اُس کی عمر چالیس سال کے قریب ہوگی لیکن نظرات نے اُس کے چہرے پر بے شمار جھریاں ڈال دی تھیں۔ اُس کی آنکھوں نے میں ایک وحشیانہ چمک تھی اور کسی گہری سوچ میں غرق نظر آتا تھا۔

اس طرح کے عجیب و غریب شخص کو نیم پاگل کہہ کر اُس پر پٹنے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے اور اگر کوئی آدمی اپنی اس خواہش پر قابو پانے کی کوشش کرے تو ایسا آگتا ہے جیسے وہ خود بھی نیم پاگل ہو جائے گا۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ میں نے ہنسی روک لی چاہی تو مجھ پر بھی وحشت چھا گئی اور میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کے لیے خواہواہ کہا ”آف یہاں تو انتظار کرنا بھی عذاب بن جاتا ہے۔“

میرا خیال تھا کہ وہ میری جانب سے گفتگو کی اس کوشش پر اس طرح اچھل پڑے گا جیسے کسی نے اُس پر بم پھینک دیا ہو۔ اس قسم کے لوگ عموماً یہی رویہ اختیار کرتے ہیں لیکن نہیں حیرت انگیز طور پر اُس کی وحشت میں کمی آگئی اور وہ پرسکون سا نظر آنے لگا۔ اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا ”جی ہاں پھر بھی یہاں کا ماحول زیادہ تکلیف دہ تو نہیں ہے۔“

”ہاں۔ لیکن انتظار.....!“

”کیا آپ کو کسی خط کا انتظار ہے؟“ ”جی ہاں۔“

”تو وہ ضرور آپ کی بیوی کی طرف سے آنے والا ہوگا۔ اسی قسم کے خطوں کا بے تابی سے انتظار کیا جاتا ہے۔“

”جی؟ جی نہیں“ میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

وہ حیران رہ گیا ”کیا آپ کی بیوی کا خط نہیں ہے

جس کا آپ اتنی شدت سے انتظار کر رہے ہیں؟“

”جی نہیں..... وہ تو.....“ میں نے کچھ کہنا چاہا۔

”لیکن آپ شادی شدہ تو ضرور ہوں گے؟“

”جی نہیں..... ابھی میری شادی نہیں ہوئی ہے۔“

اُس نے غور سے میرا جائزہ لیا ”ہوں شادی بڑی اچھی چیز ہے ہر انسان کو یہ تجربہ ضرور کرنا چاہیے۔“

میں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اس شخص پر اس

وقت شادی کا موضوع سوار ہے ضروری سمجھا کہ اُس سے

وہ سوال کروں جس کی اُسے مجھ سے توقع ہوگی ”آپ نے

تو یہ تجربہ ضرور کیا ہوگا جناب؟ آپ شادی شدہ ہیں نا؟“

”جی؟ جی ہاں، میرا مطلب ہے کہ مجھے شادی

شدہ بھی کہا جاسکتا ہے لیکن.....“ وہ پریشان کن

انداز میں مناسب الفاظ تلاش کر رہا تھا۔ اس وقت ایسا

لگتا تھا جیسے ہم دونوں بڑے پرانے دوست ہوں اور

بے تکلفی سے اپنے ذاتی موضوعات کھنگال رہے

ہوں۔ ”دراصل میں نے شادی تو ضرور کی تھی لیکن

اب ہم دونوں علیحدہ علیحدہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ

روآن میں ہے اور میں مدرس میں کھڑا ہوں۔ ویسے

بھی میں زیادہ تر دورے پر رہتا ہوں لیکن ہم دونوں

محض فاصلے کے سبب جدا نہیں ہوئے ہیں بلکہ ہم

نے باہمی سمجھوتے سے علیحدگی اختیار کی ہے۔ وہ مجھے

چھوڑ گئی ہے کیونکہ میں اُس کے ساتھ زندگی گزارنا

ممکن نہیں سمجھتا تھا۔ میرا مطلب ہے وہ مجھے پسند نہیں

کرتی تھی اس لیے میں اُس سے الگ ہو گیا۔ بیوی تو

وہ ہوتی ہے جس کا دل مرد کی محبت کی آماجگاہ ہو۔

میں اُس کے دل میں نہیں تھا۔ اُس نے مجھے دھوکا دیا

تھا لیکن ہو سکتا ہے نہ بھی دیا ہو اور یہ محض میرا خیال

ہو۔ کبھی کبھی تو میں سوچتا ہوں کہ وہ مجھے چھوڑ کر نہیں

گئی۔“

وہ شخص اب میرے وجود سے بے خبر اپنی ہی

دھن میں کھویا ہوا تھا اس لیے میں نے دخل دینے کے

بجائے خاموش رہ کر وہ سب کچھ سننا پسند کیا جو اُس

کے ذہن اور لبوں پر بچل رہا تھا۔

”ہاں تو میں آپ کو یہ بتا دوں کہ ہم آپس میں شیر و شکر تھے۔ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ہمارا اپنا ایک چھوٹا سا خوبصورت فلیٹ تھا اور میری بیوی بڑی نفاست سے اُسے صاف ستھرا رکھتی تھی۔ کام سے واپس گھر پہنچنا میرے لیے ایک کشش کا باعث ہوتا تھا۔ ابھی بھی ہم اپنے دوستوں سے ملنے یا فلم دیکھنے گھر سے باہر بھی چلے جاتے تھے۔ پھر بھی ہمارا گھر ہی ہم دونوں کی مختصر سی جنت تھا۔ لیکن میرا کاروبار ایسا تھا کہ مجھے اکثر دورے پر رہنا پڑتا تھا۔ مہینے کے بیشتر دن باہر بسر ہوتے تھے اسی لیے میں بیوی کی قربت میں صرف چند دن گزار سکتا تھا۔

”میں اپنے فلیٹ کے ایک گوشے سے واقف تھا۔ ہر کونے اور ہر اینٹ سے واقف لیکن سب سے زیادہ قربت مجھے خواب گاہ سے تھی۔ ہم دونوں نے اپنی خواب گاہ کی آرائش خصوصی طور پر کی تھی۔ دیواروں پر گلابی اور بھورے رنگ کا کاغذ لگایا گیا تھا اور ایک بہت خوبصورت ڈیزائن کا آئینہ آویزاں تھا۔ کھڑکیوں پر سرخ پردے تھے۔ ایک کھڑکی کے قریب ہی بستر تھا۔ ہمارا چوڑا بستر بڑا آرام دہ اور گدے دار تھا۔ آپ سوچیں تو سہمی کہ بستر آپ کی زندگی میں کتنا اہم کردار ادا کرتا ہے؟ یہ ازدواجی زندگی کا راز داں ہوتا ہے۔ محبت اور جذبات کی دھڑکنیں سننا ہے میں تو کہتا ہوں کہ بستر کی سفید چادر سینما کے پردے کی طرح ہوتی ہے جس پر ایک رنگارنگ رومانی فلم چلتی رہتی ہے۔ ہم دونوں باقی دنیا کے تفکرات سے دور اور بے خبر اپنی ہی چھوٹی سی دنیا میں مست رہتے تھے۔ ہماری باتیں ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھیں اور ہمیں وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہوتا تھا۔

”اور اب میں آپ کو اُس مسکراہٹ کے بارے میں کچھ بتاتا ہوں۔ ویسے تو ہر حسین عورت کی مسکراہٹ غضب کی ہوتی ہے۔ میری بیوی جب مسکراتی تھی تو بہار آ جاتی تھی لیکن خصوصاً اُس کی صبح

کی پہلی مسکراہٹ کوئی اور ہی شے تھی۔ ذرا آپ اُس وقت کا تصور کیجئے کہ رات ختم ہونے پر ہم دونوں اپنے بستر میں پہلو پہلو لیٹے ہوئے ہیں۔ روزانہ پہلے میری آنکھ کھلتی تھی۔ میری بیوی ہمیشہ گہری نیند سوتی تھیں۔ میں آنکھیں کھولتے ہی اُس کے خوبصورت چہرے پر گہری نظر ڈالتا تھا کتنا معصوم چہرہ تھا۔ وہ نیند میں کتنی حسین اور دلکش نظر آتی تھی۔ پھر میں ہلکی سی حرکت کرتا اور اُس کے جاگنے کا عمل شروع ہو جاتا۔ وہ ہمیشہ چپت سویا کرتی تھی اس لیے جب اُس کے حسین پونے جدا ہوتے تو سب سے پہلے اُس کی گہری گہری آنکھیں چھت پر نگاہ ڈالتی تھیں۔ ایک ٹاپے کے لیے اُس کی آنکھوں میں حیرت کی جھلک پیدا ہوتی جیسے وہ یہ سوچ رہی ہو کہ میں کس مقام پر سوئی ہوئی ہوں اور یہ کون سے مکان کی چھت ہے؟ پھر اسی کیفیت میں جیسے اُسے یہ بھی احساس ہو جاتا کہ وہ بستر میں اکیلی نہیں ہے بلکہ کوئی اور بھی اُس کے پہلو میں ہے۔ وہ آہستہ سے اپنا ہاتھ بڑھا کر میری موجودگی کا احساس یقین میں بدلتی۔ اس کے بعد بڑی آہستگی اور نرمی سے اُس کی آنکھیں میری طرف مائل ہوتیں لیکن اُس ایک ٹاپے کے ہزارویں حصے میں اُس کے چہرے پر کچھ عجیب سا تاثر ہوتا۔ اُس وقت اُس کے چہرے پر کرب و اندوہ کی کیفیت ہوتی تھی۔ وہ ایک ایسا چہرہ ہوتا تھا جو یہ سوچتا تھا۔ آہ۔ یہ میں نے کیا کر دیا؟ کیوں؟ کیسے؟ کہاں؟ میں نے یہ ایک مذموم کام کیا ہے۔ اب بہر حال اُس کا سامنا تو کرنا ہی پڑے گا۔ وہ چہرہ کسی ایسے گناہگار کا چہرہ ہوتا تھا جسے اپنے گناہ کا علم ہو جیسے میں اُس کا شوہر نہیں ہوں بلکہ..... بلکہ کوئی اور شخص ہوں جس کے پہلو میں لیٹ کر اُسے اب گناہ کا احساس ہو رہا ہے۔ ایک ایسا چہرہ جس نے ہوس میں آ کر کوئی گناہ تو کر لیا ہو مگر اب اُس پر پچھتا رہا ہو۔

”میرے دوست! یہ احساس ایک مختصر سے لمحے

کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ لوگ تو معشوق کے تل پر سر قندو بخارا نثار کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ میں نے بھی اُس کی صبح کی مسکراہٹ پا کر محسوس کیا کہ مجھے سب کچھ مل گیا ہے اور اس کے بدلے کوئی بھی قیمت ادا کی جاسکتی ہے۔ ہاں وہ مسکراہٹ میرے لیے بیش بہا سرمایہ تھی۔

”لیکن میرے دوست! چند دنوں تک روزانہ اس مسکراہٹ سے لطف اندوز ہونے کے بعد میرے ذہن میں ایک عجیب و غریب خیال آیا۔ میں نے وہ مسکراہٹ اس قدر قریب سے دیکھی تھی کہ اب مجھ پر اس کا ایک بالکل متضاد لمس دیکھنے کی خواہش پیدا ہونے لگی۔ میرا جی چاہنے لگا کہ اُس خوبصورت چہرے پر وہ لازوال مسکراہٹ نہ کھیلے جو مونالیزا کی یاد دلاتی تھی بلکہ میں اس چہرے پر خوف اور رنج کے تاثرات بھی دیکھ سکوں۔

اور میں نے یہ منظر دیکھنے کے لیے ایک انوکھا منصوبہ بنایا۔ میرا ایک دوست ہیٹ فروخت کیا کرتا تھا اُس کے پاس لکڑی کے مصنوعی چہرے اور سر بھی تھے جن پر وہ اپنے ہیٹ بطور آزمائش پہنا کر گاہکوں کو دکھایا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے اُس سے لکڑی کا وہ چہرہ حاصل کیا جو دوست دیکھنے میں بالکل اصل نظر آتا تھا۔ اس میں اصلیت کا رنگ بھرنے کے لیے باقاعدہ بڑی بڑی مونچھیں بھی بنائی گئی تھیں۔ میں نے مصنوعی بالوں کے ذریعے وہ مونچھیں اور بھی لمبی کر دیں اور داڑھی بھی بنادی۔ اس طرح وہ چہرہ بالکل کسی ملاح کے چہرے کی طرح خوف ناک نظر آنے لگا اور میں نے اُسے دیکھا تو مجھے بھی خاصا خوف محسوس ہوا۔ میں نے پوری کوشش کی تھی کہ وہ چہرہ میرے چہرے کے نقوش سے یکسر مختلف ہوتا کہ میری بیوی صبح کے وقت اپنی نیم وا آنکھوں سے اُسے دیکھ کر ہی خوف میں مبتلا ہو جائے اور میں یہ دیکھ سکوں کہ کیا ایک انتہائی حسین چہرہ خوف کے عالم میں بھی اتنا ہی حسین نظر آتا ہے جتنا مسکراتے ہوئے نظر آتا ہے؟ یا اُس سے مختلف ہوتا ہے۔

شاید آپ مجھے خطی سمجھ رہے ہوں گے میں نے

کے لیے اُس کے چہرے پر طاری ہوتا تھا۔ پھر وہ پوری طرح مجھے دیکھ لیتی تھی۔ وہ مجھے اپنے شوہر کو اپنے پہلو میں لینا دیکھ کر جیسے اچانک کسی خوفناک خواب کے طلسم سے نکل آئی ہو۔ اُس کی تمام پشیمانی ختم ہو جاتی اور احساس گناہ حجاب غلط کی طرح مٹ جاتا اور اُس کے چہرے پر وہ لازوال مسکراہٹ آ جاتی جس میں طمانیت کا احساس موجود ہوتا۔ جس میں میرے لیے محبت کا سمندر موج زن ہوتا اور وہ مسکراتی ہوئی مجھ سے لپٹ جاتی۔

میں خاموشی سے سب باتیں سنتا جا رہا تھا شاید وہ شخص غضب کا مرد شناس تھا۔ میرے چہرے پر وہ سوالات شاید خود بخود نمودار ہو گئے تھے جن کا جواب دینے کے لیے وہ بے چین تھا۔ مجھے بولنے کا موقع دینے بغیر وہ بولا ”ہاں میں جانتا ہوں کہ آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ آخر وہ کس قسم کی عورت تھی جو اپنے شوہر کے پہلو میں ہوتے ہوئے بھی خود کو کسی اجنبی کے پہلو میں سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتی تھی۔ میری صاف گوئی کے لیے معاف کیجئے گا اصل میں شادی سے قبل جب میری اُس سے ملاقات ہوئی تھی تو وہ ایک کلب میں رقصہ تھی۔ ظاہر ہے کہ فیاض گاہکوں کے لیے اُس کی قربت حاصل کرنا کوئی مشکل امر نہ ہوگا۔ مگر جب مجھ سے اُس کے تعلقات بڑھے تو میرے لیے اُس کی زندگی کے اس تاریک پہلو میں کوئی قابل نفرت بات نہیں رہی۔ ہم میں سے اکثر لوگ بستر کے معاملات میں کتنے ہی پاکیزہ خیالات کے مالک کیوں نہ ہوں دوسرے تمام اخلاقی معاملات میں خاصے پست ہوتے ہیں ہم میں حاسد لالچی شرابی اور اس قسم کے دوسرے لوگوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ جب ہم ان سب کو برداشت کر لیتے ہیں تو ایک ایسی عورت سے شادی کرنے میں مجھے کیا جھجک محسوس ہوتی جو بدن فروشی تو کرتی تھی لیکن اُس کی روح پاکیزہ تھی اور اُس کے خیالات ارفع و اعلا تھے، میں نے اُس سے شادی کر لی۔ شادی کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میں نے

سیارہ ڈائجسٹ کی حسب روایت ایک نئی اچھوتی اور یادگار پیشکش

شائع ہو گیا ہے توبہ نمبر

قیمت: 160 روپے

- توبہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے دروازے کھولتی ہے
- قرآن مجید اور احادیث مبارکہ میں توبہ کی برکات آداب اور فضائل پر کیا کچھ کہا گیا ہے؟
- انبیائے کرامؑ، صحابہ کرامؓ، اولیائے کرامؑ اور صالحین کی توبہ نے قدرتِ خداوندی کے کیسے کیسے مظاہر دکھائے۔
- ایمان افروز اور نور ایمان کے حیرت انگیز واقعات سے بھرپور یہ دستاویز آپ کے ذاتی ذخیرہ کتب میں ایک انمول اضافہ ہوگا اور آپ کے دوستوں کیلئے شاندار اور یادگار تحفہ بھی

سیارہ ڈائجسٹ: 240 مین مارکیٹ زیواں گارڈن لاہور فون: 7245412

طوفان پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں سوالیہ انداز میں لگاتار اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر کیا ہوا؟ وہ بولتا کیوں نہیں؟ کیا وہ اس مذاق پر ناراض ہو گئی تھی؟

”مجھے گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس مذاق کا کیا نتیجہ برآمد ہوگا؟ لیکن اس کا جو انجام ہوا کم از کم میں خود کو اُس کا سزاوار ہرگز نہیں سمجھتا تھا..... ہرگز نہیں۔ یہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن یہ ہو چکا ہے۔ آہ! اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں اپنی اس خواہش پر ابتداء ہی سے قابو پا لیتا لیکن افسوس کہ ایک زندگی تباہ ہو گئی۔ ایک لمحے کی تفریح پر ایک پوری زندگی بھیٹ چڑھ گئی۔“

اُس کا گلارُندہ گیا۔ اب بھی ڈاک خانے میں خاصا رش تھا اور لوگ اپنے خطوں اور منی آرڈروں کے لیے ادھر ادھر دوڑتے پھر رہے تھے۔ میں اُس شخص سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا کیا وہ عورت اُس کے مذاق پر ناراض ہو کر چلی گئی تھی؟ کیا وہ اب زندہ نہیں ہے؟ آخر کس کی زندگی برباد ہو گئی؟ چند لمحوں تک انتظار کرتا رہا مگر اب وہ بولنے پر آمادہ دکھائی نہیں دیتا تھا آخر بے تاب ہو کر میں نے پوچھا ”لیکن ہوا کیا جناب؟ کیا وہ بہت زیادہ ڈر گئی تھی؟ کیا وہ آپ سے ناراض ہو گئی تھی؟“

”نہیں۔“

”تو پھر پوچھا؟ معاف کیجئے گا میں سمجھ نہیں سکا۔“

”کمال ہے یہ بات تو آپ کو اب تک سمجھ لینی چاہیے تھی۔ پہلے میں ہمیشہ ہی سمجھتا رہا کہ میری بیوی روز صبح جب مجھے اپنے پہلو میں دیکھتی ہے تو اُس کے چہرے پر ایک لازوال مسکراہٹ بکھر جاتی ہے لیکن اُس روز۔ ہاں اُس روز جب وہ اُس چہرے پر نظر ڈال کر مسکرائی تو میں نے اندازہ لگایا کہ میں زندگی میں پہلی مرتبہ ایک لازوال مسکراہٹ کی جھلک دیکھ رہا ہوں اور وہی آخری نظارہ تھا۔ میں نے اُسی لمحے اُس سے جدائی کا فیصلہ کر لیا۔“

محض ایک خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس قدر تردد۔ سے کام لیا لیکن حسن پرست لوگ حسن سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایسی عجیب باتیں کیا ہی کرتے ہیں۔ دوسرے روز صبح بیدار ہو کر میں نے اپنی بیوی کے خوابیدہ چہرے پر گہری نظر ڈالی اور سوچا کہ آج میں اس چہرے، پر وہ لازوال مسکراہٹ نہیں بلکہ خوف و دہشت کے تاثرات دیکھوں گا میں بڑی آہستگی کے ساتھ بسز سے نکل گیا۔ پھر میں نے تکیے پر وہ مصنوعی چہرہ اس طریقے سے لٹا دیا جیسے میری بیوی صبح کی اجنبی املاح کے پہلو میں سو رہی تھی۔ میں بے تابی سے اُس وقت کا انتظار کرنے لگا جب وہ حسب معمول بیدار ہوگی اور چھت پر نظر ڈالے گی اور اُسے اپنے پہلو میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوگا۔ پھر روز کی طرح وہ ہلکی سی تشویش کے ساتھ چہرہ گھما کر پہلو میں لیٹے ہوئے شخص کی طرف دیکھے گی۔ پھر وہ مسکرائیں سکے گی بلکہ خوف کے عالم میں چیخ پڑے گی۔ املاح کا وہ خوف ناک چہرہ اُسے یقیناً خوف زدہ کر دے گا۔ پھر میں اُسے بتاؤں گا کہ یہ محض ایک مذاق تھا۔ یقیناً وہ بھی میرے اس دلچسپ مذاق سے لطف اندوز ہوگی۔

میں نے سوچا کہ نہ جانے کتنی دیر تک سوتی رہے اس لیے اسے کسی طریقے سے بیدار کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے آہستہ سے زمین پر پاؤں مارا۔ دھب کی آواز پیدا ہوئی اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ کسی چابی والی گڑیا کی طرح متحرک ہو گئی۔ روز کی طرح اُس کی نیم وا آنکھیں چھت کی طرف کھلیں۔ پھر اُس کی آنکھوں میں وہی سوچ پیدا ہو گئی کہ وہ کہاں ہے؟ پھر آہستہ آہستہ اُسے اپنے پہلو میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اور اُس نے اپنا چہرہ اُس شخص کی طرف کر لیا جو اُس کے پہلو میں لیٹا تھا.....

وہ خاموش ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں میں نفرت کی پرچھائیاں واضح دکھائی دیں۔ وہ شاید کسی اندرونی



نو شاہ اختر

اک عہد وفا



مطلب کیا تو اس کہنے کے لیے ہم سب کے سر پر کاغذ لٹا دیے۔ کیا تو اس کے
پتھر ہٹا کر جانے کا۔ پاپ کا شلہ زمین میں اتر کر اس کا پتھر لٹا دیے۔
تھی اور وہاں پر رہ رہی تھی۔ ”کیوں لڑ رہی ہو تم دھواں۔“ تھی اور کہا ہے ایک دوسرے
کی بات سن لیا کرو۔ ”اللہ کا اگر حقیقت کی خبر ہو سکتی تو وہ اللہ کا سانس بند ہو جاتا۔“

ایک کشمیری دوشیزہ کی داستان، وہ شجاعت و بہادری کا پیکر تھی

کیپٹن (ر) لیاقت علی ملک کا ”کیسے ممکن“ ہے
پڑھتے ہوئے ذہن ایک دم سے کئی سال پیچھے چلا گیا اور
میں جو رمضان کی مصروفیات میں صرف سوچے جا رہی
تھی کہ کیا لکھوں، ماضی کے اُس دالان میں جا اتری۔

عورت کی محبت میں بہت دم ہے یہ زندگی دے نہ
دے زندگی لینے کی اہلیت ضرور رکھتی ہے کیونکہ اس کی
محبت سے زندگی کسی نصیب والے ہی کو مل سکتی ہے۔
یہ ایک جھلک کے لیے پورے لشکر ذبح کر داسکتی ہے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

وہ بولیں ”نہیں آپ کی اصل کیا ہے۔“ ”بی بی میں ایک مسلمان عورت ہوں اور اپنے والدین کی جائز اولاد ہوں۔“ میں نے انہیں جواب دیا تو وہ بولیں ”نہیں یہ سب ٹھیک ہے مگر آپ کچھ اور ہیں یعنی آپ کی اصل کچھ اور ہے“ میں حیران کہ ان کی بات کا کیا جواب دوں کہ دادی اماں درمیان میں آئیں۔ وہ کہیں دور بیٹھی مسکرا رہی تھیں اور میں نے اپنی جان چھڑانے کو یوں ہی کہہ دیا ”شاید میں کشمیری ہوں اس لیے آپ کو کچھ فرق لگ رہا ہے“

”یہ ہوئی نا بات“ وہ دوسری خاتون سے بولیں۔ ”دیکھا، میں نہ کہتی تھی، یہ یہاں سے نہیں ہیں۔“ میرے موبائل نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ میں ہال سے باہر نکل آئی اور صرف ہال سے نہیں نکلی اس شخص سے بھی نکل آئی کے مجھے اپنی دادی ماں سے آگے چر ملاقات کرنی تھی۔

ہاں تو میں دادی ماں کے خسن کی بات کر رہی تھی۔ وہ واقعی بے حد حسین تھیں لیکن ان کی باتیں اس سے بڑھ کر حسین ہوتی تھیں وہ ہر وقت گنگنائی رہتی تھیں۔

”میرے وطن امیرے وطن

تیری جنت میں آئیں گے اک دن“

ایک روز یوں ہی میں نے سوال داغ دیا۔

”جب وطن سے اتنی محبت تھی تو وہاں سے چے کیوں آئے؟ رہتے نا وہیں۔“ وہ اپنی پیاری سی مسکراہٹ کی چاندنی چاروں طرف بکھیبتے ہوئے بولیں۔

”پھر آج میں تجھے بتاتی دوں کہ میرے باپ دادا نے وہ جگہ کیوں چھوڑی۔ میری پیاری بیٹی! جہاں عزیزتیں محفوظ نہ رہیں وہاں سے ہجرت کرنا ہی پڑتی ہے اور ہمیں بھی اُس ڈوگر راج میں اپنے کھیت اپنے

جہاں دادی ماں بیٹھی تھیں اور سوچوں میں گم تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ حسب معمول میں نے سوال کر دیا۔

”سوچتی کچھ اور ہیں اور تسبیح کے دانے گھمائے جارہی ہیں۔“

انہوں نے مسکرا دیکھا اور بولیں ”تم باز نہیں آئیں، میں سوچ تو ضرور رہی ہوں لیکن دھیان اللہ کی طرف ہی ہے۔“

”واہ جی واہ“ ایک وقت میں دو کام، ایک تیر سے دو شکار“ میں نے ہنستے ہوئے کہا تو انہوں نے پیار سے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔

یہ تھیں میری ننھی منی۔ سے دادی ماں۔ ننھی منی اس لیے کہ وہ ڈبلی پتلی بے مد سمارٹ دودھ اور معدے سے گندھی ہوئی خوبصورت نین نقش والی ایسی کشمیری تھیں کہ گویا کشمیر کا ذہیروں خسن ان کے اندر سمو دیا گیا تھا۔ اندھیرے میں ان کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح چمکتا تھا۔ اور شاید ان کی روحانیت بھی اس خسن کو چار چاند لگا رہی ہوتی تھی۔

جب پاکستان بنا تو ہم انہیں تھے کیونکہ ہمارے اباؤ اجداد بہت پہلے کشمیر سے ادھر آ گئے تھے اور اس آنے میں کئی کہانیاں تھیں جو کچھ ہمیں ملیں اور کچھ وقت کی گردش میں گم ہو گئیں۔

ایک محفل میں دو خواتین مجھے گھورے جارہی تھیں اور میں خواخواہ نظریں پڑا رہی تھی جیسے ان کی کوئی چیز پوری کر لی ہو۔ تھوڑی دیر بعد ان میں سے ایک خاتون مجھ سے مخاطب تھیں ”آپ کون ہیں اور کہاں سے ہیں؟“

میں چونک اٹھی، اتنی تفتیش، یہ اس واقعی کوئی جرم نہ بیٹھی ہوں۔ ”میں بھی دن۔“ میں نے انہوں سے پھر یہ سوال کیا ”تو آپ کہاں سے ہیں؟“ ”جی میں لاہور سے ہی ہوں۔ میں نے دوبارہ عرض کیا تو

”کیا بارش برے گی تو ہم کھل جائیں گے نمک کی طرح۔ ارے میری سکھی! ہم تو روٹی کے گالوں کی طرح اور بھاری ہو جائیں گے۔ ہم کشمیر کے بچے گھلنے والے نہیں۔“

”واہ بھی واہ! ایسی طوفانی باتیں تیرا زرواق سن لے تا تو بے ہوش ہو جائے گا“ میں نے اُسے چھیڑا تو وہ مسکرا دی ”ایرج! میری بہن! دیکھتے ہیں کون کس کے لیے بے ہوش ہوتا ہے۔“

جانے اس کی آواز میں کیا تھا کہ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا وہ تو جیسے بہت دُور کہیں کھو گئی تھی اور اس سے پہلے کہ میں کوئی بات کرتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی ”چلو گھر چلتے ہیں بابا اور چاچی پریشان ہو رہے ہوئے۔“ اُسے اُن دو بزرگوں کی ہر گھڑی فکر ہوئی تھی۔

جانے اُن چند گھڑی میں کیا ہوا تھا کہ صفی ایک دم سے بدل سی گئی تھی۔ تنگ آکر میں نے اُسے چھینچھوڑ دیا ”کیا ہوا ہے کچھ تو بتاؤ، کوئی خاص بات ہے جو تم مجھے بتائیں رہیں۔“

”بتا دوں گی ذرا صبر سے کام لو اور کوئی پریشانی والی بات نہیں“ اُس نے مجھے تسلی دی اور میں بھی تسکین گئی۔

ہم سب لڑکیاں پانچ پانچ جماعت ضرور پڑھی تھیں اور اس وقت کی پانچ جماعت پڑھی لڑکی بہت پڑھی لکھی سمجھی جاتی تھی اور صفورا تو اور بھی بہت سی خوبیوں کی حامل تھی۔ قرآن پڑھتی تو ترجمہ ضرور پڑھتی اور پھر پہروں کسی ایک آیت کو لے کر سوچتی رہتی اور اُسے یقین تھا کہ رب دو جہاں کے حکم سے ہر کام ہوتا ہے اور رب اُس سے چاہتا ہے کوئی بڑا کام لے لیتا ہے۔ وہ اپنی چھوٹی سی کاپی میں آٹھ نہ کچھ لکھتی رہتی تھی اور مجھے جب موقع ملتا میں سے پڑھ لیتی جس پر ہمارا

بار اور اپنی جنت سب کچھ چھوڑنا پڑا۔ آج آج میں تجھے ایک کہانی سناتی ہوں۔ ایسی کہانی جس میں ہر ہیروئن زہری پڑیا پلو میں باندھے پھرتی ہے۔

”وہ بھی ایک بانوں بھرا دن تھا۔“ داوی ماں دُور فضاؤں میں کھو گئی تھیں۔ ”ہم دونوں..... میں اور صفورا روز کی طرح بکریاں چرانے پہاڑوں پر نکل گئیں۔ بکریاں چرانا تو ایک بہانہ تھا ہم دونوں بچپن کی تسکیناں مل بھر کے لیے جدا نہیں رہتی تھیں۔ صفورا کی اماں یعنی میری مائی ماں بہت پہلے فوت ہو گئی تھیں۔ اب تایا ابو جنہیں ہم سب بابا کہتے تھے اور صفورا ہی اپنے گھر میں رہتے تھے۔ ادھر میں تھی ایک شہید کی بیٹی اور میری ماں جو شہید کی بیوہ تھیں ہم ایک گھر میں تھے۔ زرواق میرا بھائی اور صفورا کا منگیتر ڈوگرہ فوجیوں سے جنگ کرنے کے لیے نہ جانے کہاں کہاں پھرتا تھا پھر جب وہ چند گھڑیوں کے لیے گھر آتا۔ تو جیسے ہر سو بہارا جاتی۔ صفورا کی آنکھیں ہیروں کی طرح جلمگائے لگتیں۔ اُس کی ہنسی بچتے چھرنوں کا روپ دھار لیتی وہ دونوں بچپن سے ایک دوسرے سے منسوب تھے۔ اور آنے والی بہار میں ہم اُن دونوں کی شادی کرنے والے تھے۔

تو بنو! اس روز بھی ہم دونوں ہیروئن کا ریوڑ لے کر وادیوں میں آدھ تٹیوں کی طرح پرواز کر رہی تھیں کہ مجھے لگا صفی میرے سے کہیں دُور چلی گئی ہے۔ میں نے اُسے زور زور سے آوازیں دیں۔ وہ اپنے سے بارش بالکل پڑنے والی تھی۔ میں بکریاں سمیٹ رہی تھی اور صفورا کو بلا بھی رہی تھی کہ وہ بھاگتی ہوئی آئی اور دھڑام سے زمین پر بیٹھ گئی۔

”کیا ہوا صفی! تجھے اتنی بار کہا ہے دُور نہ جایا کر۔ پڑو میری بات سن رہی نہیں، اب کیا ہوا ہے، دیکھ بارش بھی برسنے والی ہے۔“

میرے دل میں کیا ہے جو مجھے کہیں دور لے کر جا رہا ہے۔ ایرج کو کچھ نہیں بتاؤں گی مگر مجھے کچھ کرنا ہے شاید بہت کچھ“ میں نے اس کی کاپی دین رکھی اور اپنے گھر آگئی۔

بھلا یہ کیا کر سکتی ہے۔ نادان لڑکی چلی ہے ستاروں سے باتیں کرنے، مجھے اس کا خاص خیال رکھنا ہے میرے بھائی کی ذہن ہے، میں سوچتی رہی مگر میں نے اس سے کوئی بات نہ کی۔ وہ روز رات کو میرے پاس آ جاتی تھی۔ دوسری رات وہ ذرا دیر سے میرے پاس پہنچی اور آتے ہی سو گئی اور تیسری رات بھی یہی ہوا۔ وہ آتے ہی سو گئی اور وہ بڑبڑا رہی تھی۔ چھوڑ دے میرا ہاتھ میں کل پھر آ جاؤں گی۔ چھوڑ دے راج مجھے چھوڑ دے۔ میں حیران سی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اگر اُسے جگا کے کچھ پوچھتی تو وہ یقیناً انکار کر دیتی۔ میں یہ سوچ کر سو گئی کہ اس کی کاپی پڑھوں گی۔

دوسرے روز میں عین اس وقت اس کے گھر گئی جب وہ بابا کو حکیم جی کے پاس لے کر گئی ہوئی تھی۔ ہم گھروں کے دروازے بند نہیں کرتے تھے۔ میں اندر چلی گئی میں نے الماری سے اس کی کاپی نکالی۔ اس نے لکھا تھا۔

وہ میری بہت تعریف کرتا ہے میں آیت الکرسی کا ورد کرتی وہاں جاتی ہوں۔ میرا رب میری حفاظت کرنے والا ہے اور پھر میرے دوپٹے کے کونے میں بندھی ہوئی پڑیا۔ اللہ کرے اسے کھانے کی نوبت کبھی نہ آئے۔ خودکشی حرام ہے، اور میں حرام موت نہیں مروں گی۔ باری تعالیٰ میری مدد کرنا اپنے حبیب کے صدمے میری مدد کرنا۔“

چوکیدار کی آواز دُور سے نزدیک آتی اور پھر دُور چلی جاتی ہے۔ وہ بہت بے صبر ہو رہا ہے لیکن میں

درمیان خوب لڑائی ہوتی اور وہ مجھے چور تک کہہ دیتی۔ لیکن وہ صاف دل اور اتنی شفاف تھی کہ اس کی لڑائی کے جملے بھی محبت سے بھرپور ہوتے تھے۔ اور اس روز جب میں اُس کے گھر گئی تو وہ کاپی لکھتی چھوڑ کر بابا کے ساتھ کہیں گئی تھی اور مجھے کاپی پڑھنے کا موقع نہ گیا۔ اس نے لکھا تھا:

اُس روز اُس وادیاں میں کیا ہوا۔ وہ وہ اونچا لمبا شیطان نما انسان کون تھا، اُس نے زور سے میرا بازو پکڑا اور بولا ”تُو یہاں بکریاں چرا نے کیوں آئی ہے تجھے پتہ نہیں یہاں آنا منع ہے۔“ میں ڈر گئی اور میں نے کہا ”نہیں مجھے معلوم نہیں تھا مجھے چھوڑ دو آئندہ ادھر نہیں آؤں گی“ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا تھا بڑی گندی طرح سے اور بولا ”کون سی بستی سے آئی ہو“ میں نے لرزتی ہوئی انگلی اپنی بستی کی طرف اٹھا دی تو وہ پھر مسکرایا۔

”تم ڈر کیوں رہی ہو، کوئی بات نہیں تم یہاں بکریاں لے آیا کرو اور کسی وقت ایک ڈول دودھ میرے بکر میں دے دیا کرو۔ وہ سانسے میرا بکر ہے۔ تم بہت خوبصورت ہو“ مجھے بہت غصہ آیا ”تم کون ہوتے ہو میری تعریف کرنے والے زہرے غلیظ ڈوگرے۔“ وہ ہنس پڑا، ”میں غلیظ ڈوگرہ نہیں ہوں۔ میں کرنل بلراج کنول ہوں سمجھیں۔ تم میرے جی کو بھاگنی ہو، آؤ میرے ساتھ باتیں کرو۔“ میں نے اُسے پلید انسان کہا تھا تو وہ ہنسنے لگا۔ وہ مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ میں اپنا ہاتھ چھڑا رہی تھی میں نے چلانا چاہا تو اس نے میرا منہ بند کر دیا۔ ”چلاؤ نہیں وعدہ کرو کل آؤ گی تو ابھی چھوڑ دیتا ہوں۔“ میں نے ڈر کے مارے اس سے وعدہ کر لیا۔ وہ ہنسا، ”کشمیریوں والا وعدہ ہے یاد رکھنا، اگر نہ آئی تو ساری بستی اُڑا دوں گا“ اور میں بھاگتی ہوئی ایرج کے پاس آ گئی تھی۔ میں بہت ڈر گئی ہوں لیکن پتہ نہیں

نہیں کیا ہو گیا ہے۔ کھانا جلدی جلدی نہیں کھاتا اور مجھے کون سا جلدی ہوتی ہے۔ ہماری تو رات اپنی ہے نا۔ ایرج اور صفی کتنے خوبصورت نام ہیں تو مجھے بھول تو نہیں جائے گی نا اگر میں مر جاؤں تو۔“

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”صفی خدارا ایسی باتیں نہ کر۔ ہم ہیں ہی کتنے کہ ایک دوسرے کو کھو دینے کا سوچیں۔ چس سو جا پتہ نہیں کیا اوٹ پٹانگ بولتی رہتی ہے۔“

اگلے روز پھر مجھے اس کی کاپی پڑھنے کا شوق چڑایا تو میں اس کے گھر چلی گئی۔ وہ بہت جلدی میں تھی کہنے لگی، ”ایرج تھوڑی دیر بیٹھو مجھے ایک کام ہے۔ جلدی آ جاؤں گی ذرا حکیم صاحب تک جا رہی ہوں“ اور وہ جلدی سے چلی گئی۔ میں تو موقع کی تلاش میں تھی اندر گئی اور کاپی ڈھونڈ کر پڑھنے بیٹھ گئی۔

”بابا بھی مجھے آوارہ سمجھ رہے ہیں، بد چلن، حرافہ۔ بابا میں وہ نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ میں نے بابا کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ بابا! اگر آپ نے مجھے آوارہ سمجھ لیا ہے تو میرا گلا کھونٹ دیں۔ کند چھری سے میری بوٹی بوٹی الگ کر دیں۔ میں اُف نہیں کروں گی۔ میں تو آج بھی آپ کی ننھی صفورا ہوں۔ جسے آپ اپنے کندھوں پر بٹھا کر سیر کرواتے تھے۔ میں تو ایسی ماں کی بیٹی ہوں جس کے ساتھ بھائی شہادت کے گہڑ پہنے آج بھی راتوں کو گلیوں میں جوانوں کے جذبات آزادی کے لیے بیدار کر رہے ہیں۔ بابا! میں پلید نہیں“۔ بابا نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ ”نہیں صفورا، میری بچی مجھے اپنے خون پر شک نہیں۔ تُو نے جس ماں کا دودھ پیا ہے وہ حوروں سے زیادہ پاک تھی۔ یہ لوگوں کی باتوں کا کیا کروں۔“

میں نے بابا کو بہنا دیا ہے۔ اُسے کچھ نہیں بتایا۔ بھلا

نے اسے بھلا رکھا ہے جمعہ کی رات تک کے لیے۔ میں نے اُسے کہہ دیا ہے کہ جمعہ کی رات وہ شہ گھڑی آئے گی۔ جب میں اس کی دلہن بنوں گی۔“

میں سر سے پاؤں تک لرز گئی۔ یہ میری صفورا تو نہیں۔ میں اس کو نہیں بخشوں گی۔ میرے راج دلارے زروان کی منگ اور ایک ڈوگرہ فوجی کی دلہن بننے جا رہی ہے۔ میں سوچتی ہوئی اپنے گھر لوٹ آئی مگر اس شام بڑا طوفان آیا۔ بادل بھی گرج گرج کر بولے۔ بجلی ایسے چمکتی تھی گویا سب کچھ جلا کر رکھ کر دے گی۔ مگر اس سے بڑا طوفان صفورا کے لیے اٹھایا گیا۔ ماسی ریشماں کے چوکیدار بیٹے نے صفی کو کرل کے بکر کی طرف آتے دیکھا تھا۔

اور اس طوفانی رات میں بھی وہ میرے پاس آگئی۔ سمنائی بھیگی ہوئی۔ میں نے اس کو اپنے کپڑے دیے اور ککلوں کے پاس بٹھا کر قبوے کا پیالہ تھمایا تو وہ کانپ رہی تھی۔ صفی تو کہہاں سے آرہی ہے اور بستی والے کیا کہہ رہے ہیں کیا تو ڈوگرے کرل سے ملنے جاتی ہے۔“

دادی ماں ہنس پڑیں، اب وہ مجھ سے مخاصب تھیں، ”تُو مجھے حسین و جمیل سمجھتی ہے نا مگر اس میں تو سارے کشمیر کا نرسن سمٹ کر آ گیا تھا۔ اس کی ہنسی جلت رنگ بجاتی تھی اور میں اس کی ہنسی کی دیوانی تھی مگر اس رات وہ ہنسی کھنک نہیں رہی تھی۔ کچھ روتی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا، ”بستی والے تو دیوانے ہیں۔ میں تو ہر رات تیرے پاس آتی ہوں تُو تو گواہ ہے نا اس بات کی۔“

”مگر تُو ذرا دیر سے آتی ہے یا اس لیے مجھے بھی شک ہو رہا ہے۔“ جب میں نے اس کی طرف سے آنکھیں چراتے بات کی تو وہ پھر ہنس پڑی۔

”بابا کو کھانا کھلا کر برتن دھو کر عشاء کی نماز پڑھ کر جب تیرے پاس آؤں گی تو دیر ہی ہوگی۔ بابا کو پتہ

کردیں گے مہفورا اور تیرے ساتھ میرا برائی بھی
بے بسی کی موت مر جائے گا۔“

”صبر کرایج! اجی تیری صفی اتنی بے غیت اور
آوارہ نہیں ہے کہ لوگ اسے سنگسار کر دیں۔ غلط
فہمی کو دور بھی تو کیا جاسکتا ہے نا اور شاید مجھے اپنی
صفائی دینے کی ضرورت ہی نہ پڑے اور میرا اللہ
میری عزت کے تار تار آنچل کو خوبصورت ستاروں
کی لڑیوں سے بھر دے۔“

وہ ایسے بول رہی تھی جیسے کوئی خواب میں باتیں
کرتا ہے۔ ”اس کا نام پتہ نہیں کیا ہے مگر میں اُسے جب
راج کہتی ہوں تو وہ خوشی سے پاگل ہو جاتا ہے“ اس کی اس
بات نے میرے صبر کے پیالے کو چھلکا دیا اور میں نے
اسے مدنا شروع کر دیا۔ پر وہ تو ہنس رہی تھی ”اجی، جی
بھر کے مار لے آج مجھے پھر شاید تجھے کبھی یہ موقع نہ ملے۔“
”کیا مطلب کیا تو اُس کہنے کے لیے ہم سب کے
منہ پر کالک مل رہی ہے کیا تو اس کے ساتھ بھاگ جائے
گی۔ باپ کا شملہ زمین میں روندے گی“ میں اب اُس
پر چیخ رہی تھی اور اماں برابر بول رہی تھیں ”کیوں لڑ رہی
ہو تم دونوں۔ کتنی بار کہا ہے ایک دوسرے کی بات سن لیا
کرو۔ پر برداشت ہی نہیں ان لڑکیوں میں“ اماں کو اگر
حقیقت کی خبر ہو جاتی تو شاید اُس کا سانس بند ہو جاتا۔
صفی ہنستی ہر کی اٹھ کر بیٹھ گئی اور بھیگی بھیگی آنکھوں
سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”زری کو دھوکہ
ڈوں کبھی ہو ہی نہیں سکتا! اجی! لیکن جب کہیں سے
فرض کی پکار آجائے تو ایسے ہزاروں زروان قربان
کر دوں گی۔ بیٹھ جا۔ رات گزر رہی ہے اور میں
تجھے وہ سب بتا دینا چاہتی ہوں جو ہونے جا رہا ہے۔
پھر اس نے بہت سی باتیں تو وہی کہیں ہو میں کاپی
لے کر آؤں گی پھر اُس نے اپنی خوبصورت آنکھیں
میرے آنکھوں میں ڈال دیں۔

یہ بھی کوئی بتانے کی بات ہے۔ وہ ڈوگر کرتل جو مجھے اپنی
دلہن بنانے کے خواب دیکھ رہا ہے اور میں کیا میں پوری
جرات اور بہادری سے کچھ کر سکوں گی۔ میرے اللہ!
مجھے صحیح راہ بھی دکھا اور میری مدد بھی فرما۔“

اس کے قدموں کی آوازن کر میں نے کاپی وہیں
رکھی اور ٹوپی پہننے میں محو ہو گئی۔ وہ ہنستی ہوئی اندر آئی
اور میرے اوپر دھڑام سے گر گئی۔ ”میں بہت خوش
ہوں ایرج بس دعا کرو میں جو کام کرنا چاہتی ہوں وہ
اللہ کے کرم سے کر پاؤں۔“

میں نے حیرانگی سے اس کی طرف دیکھا،
پڑھ کر میں جان تو گئی تھی کہ وہ کوئی انہونی کر۔ نے
والی ہے مگر میری ناقص عقل اس انہونی تک پہنچ ہی
نہیں سکی۔ جب میں نے حیران نظروں سے اس کی
طرف دیکھا تو وہ ہنس پڑی۔

”جا ایرج بولی جی کو کھانا کھلا۔ پھر اُن کو دوا بھی
دینی ہوگی میں رات کو آؤں گی نا۔ پھر بہت سی باتیں
ہوں گی حیران نہ ہو۔ تجھے سب کچھ بتاؤں گی۔
تجھے نہیں بتاؤں گی تو اور کسے بتاؤں گی؟“ اور یہ
جمعرات کی رات تھی۔ دن بھر فوجی ٹرکوں کی آوازیں
آتی رہیں۔ پتہ نہیں کیا ہو رہا تھا۔ کوئی بندہ بھی آتا
نظر نہیں آتا تھا مگر یہ تو یہاں ہوتا ہی رہتا تھا۔
ہمارے یہاں جوان لڑکیاں اپنی گرہ میں زہر لیے
پھرتی تھیں اپنی عزت پر حرف آنے سے پہلے وہ چنگی
برزہر انہیں عزت کی موت دے دیتا تھا۔ مجھے
ات کا انتظار تھا وہ آئی مگر دیر سے۔ لوگوں کی
باتوں پر اب مہفورا کے لیے لعنت ملا مت تھی۔ وہ
اس کو پتھر مار مار کر بار ڈالنا چاہتے تھے مگر تاپا ابا کا
پا شملہ ہر ایک کی رادش دیوار ہٹا کھڑا تھا۔

میں نے اُسے ڈانٹ دیا ”کیوں بے موت
مرنے جا رہی ہے لوگ اب کسی بھی وقت تجھے سنگسار

سیارہ ڈائجسٹ

مشتاق ہو گیا ہے

✽ کی ایک اور عظیم ایمان افروز پیش کش

سفرِ کونین کی 63 سالہ زندگی کے دوران وقوع پذیر ہونے والے سینکڑوں معجزات پر مشتمل

معجزاتِ معجز

ان معجزات کے ذریعے قیمت: 175 روپے

✽✽✽ لاتعداد انسانوں کے لیے راہِ ہدایت روشن ہوئی اور
✽✽✽ دنیائے انسانیت پر چھائی ہوئی کفر و جہالت کی تاریکیاں سمٹتی چلی گئیں۔

ایک ایک لفظ عقیدت، محبت، ادب، احترام اور علم و عرفان کی خوشبو سے جانفزار سے معطر

500 صفحات پر مشتمل نفیس کاغذ، عمدہ کمپیوٹر کمپوزنگ اور دیدہ زیب مرقع

اجی.....! وہ زور سے ہنسی، ”وہ عقل کا اندھا اتنا خوش ہوا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ یہ میرا رب ہے اجی! جس نے مجھے اس راہ پہ ڈالا اور میرے لیے ساری راہیں سیدھی کرنا جا رہا ہے ورنہ میں تو کتنی ڈرپوک ہوں تو جانتی ہے۔“

”نہیں صفو! کوئی کشمیری لڑکی ڈرپوک نہیں، ہم سب بہت بہادر ہیں، ہم عزت سے جینا اور عزت سے مرنا جانتے ہیں لیکن میں تیرے لیے ڈر رہی ہوں صفو، تیری ننھی سی جان!“

اس نے میری بات کاٹ دی ”اس ننھی سی جان میں ایمان کی طاقت اور وطن کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ بس کل رات تو نے مجھے کشمیر کی دلہن بنانا ہے اور زری کو بتا دینا میں نے اس سے کوئی دھوکہ نہیں کیا۔ میرے وطن نے مجھے پکارا اور میرے رب نے مجھے حکم دیا تو میں انکاروں پر چلنے کے لیے نکل آئی۔ آ میرے ساتھ لگ کے سو جا کہ پھر ہماری ملاقات فردوس بریں کے تختوں پر ہوگی اور وہاں تو مجھے اپنے بھائی کی دلہن بنائے گی۔“

اس کی خوابناک آواز آہستہ آہستہ مدہم ہو گئی وہ میرے ساتھ لگ کے ایسے سو رہی تھی جیسے کوئی ننھی منی فرشتہ صفت بچی اپنی ماں کے ساتھ چپک کے سو رہی ہو، میری آنکھیں اُسے تکے جاری تھیں اس کا حُسن اور بھی بڑھ گیا تھا شاید اُس کے حُسن سے شرما کر چاند نے بھی سیاہ لبادہ اوڑھ لیا تھا۔

دادی کہہ رہی تھیں، ”میرا جمعہ کا دن کیسا گزرا۔ بنو میں بتا نہیں سکتی، لوگوں کی صفی کے خلاف باتیں سُن سُن کر خون کھول رہا تھا۔ لیکن مجھے صفی کو دی ہوئی قسم کو نبھانا تھا اور اس راز کو اپنے دل کی گہرائیوں میں دفن رکھنا تھا اور سب کو یہی بتانا تھا کہ وہ تو ساری رات

”تیری صفی آج بھی اتنی ہی پاکیزہ ہے جتنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی۔ لیکن سن پہلے دن جب وہ سورما ملا تھا، میرے ارد گرد ایک روشنی کا ہالہ بن گیا تھا اور یہ صرف چار دن پہلے کی بات ہے۔ ان چار دنوں میں رب نے مجھے کیا کیا دکھا دیا تو سوچ بھی نہیں سکتی۔ لیکن میں وہ سب بتا کے وقت ضائع نہیں کروں گی کیونکہ وقت بہت کم ہے۔ سُن میری پیاری ایرج، آنیوالی رات بہت کچھ لارہی ہے۔ آج دن بھر ٹوکوں میں سنوں بارود کے ڈبے آئے اور یہاں کرل کے بڑے ٹینکر میں ذخیرہ ہوتے رہے اور یہ سارا بارود اگلے چند روز میں ہم سے چار بستیاں چھوڑ کر جو بڑا شہر ہے وہاں لے جایا جائے گا اور یہ خبیث خود ہی فساد پیدا کر کے بے دریغ بارود استعمال کریں گے۔ میرے وطن کی گلیاں خون میں نہا جائیں گی اور سیب کے ننھے شگوفے اور آڑو اور خوبابی کے خوبصورت درخت بارود کی آگ سے جھلس جائیں گے۔ کتنے بچے یتیم اور کتنی تیرے میرے جیسی مصوراتیں بیوہ ہو جائیں گی۔ میں اس بار ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ میری دوست آج تیری اور میری آخری ملاقات ہے۔ کل تو مجھے کشمیر کی دلہن بنائے گی اور میں سہاگ رات میں اپنی جان کا نذرانہ اپنے پیارے وطن کو پیش کر کے معمولی سا کام کر جاؤں گی۔ بڑی مشکل۔ سے میں نے اس خبیث سے اپنے آپ کو بچائے رکھا ہے۔ شراب کے نشے میں وہ سب کچھ بول جاتا ہے اور میں اُسے بہت بہادر بڑا سورما کہتی رہتی ہوں۔ میں نے اُسے حُسن اور بہادری کے ایسے سنگھاسن پر بیٹھا دیا ہے کہ اس کی عقل بالکل ماؤف ہو چکی ہے اور اللہ کرے اس کی عقل ماؤف ہی رہے۔ جب میں نے اُسے بتایا کہ میں دلہن بن کر آؤں گی مگر اس شبہ گھڑاں سے پہلے تو نے میرے ساتھ صرف باتیں کرنی ہیں مجھے چھوٹا نہیں تو

کر رہی ہے اجی!“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”آج بڑا خاص لمحہ آنے والا ہے ماں۔ جب چاندنی ہمارے آنکھن میں اترے گی۔“ ماں جو دیکھ نہیں سکتی تھی ہنس پڑی۔ ”بس ٹو اور صفی تو صرف باتیں بنانے میں ماہر ہو۔ آئی نہیں ابھی تیری چاندنی۔“ ”بس آتی ہی ہوگی“ میں نے مختصر سا جواب دیا کیونکہ میں آیت الکرسی کو اپنے لبوں سے جدا کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ ماں کو ابھی علم نہیں تھا کہ صفورا تو کب کی آچکی ہے اور میں اُسے دلہن بھی بنارہی ہوں لیکن ماں کے لاڈلے زروان کی نہیں، اپنے اور اس کے اور سب کے کشمیر کی دلہن۔

جب وہ بھی سنوری میرے سامنے بیٹھی تھی تو میرے اندر جذبات کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ وہ تو پرسکون تھی، بے حد پرسکون کیونکہ وہ ایک اعلیٰ مقصد کی تکمیل کے لیے اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کرنے جا رہی تھی۔

پھر وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی ”تیرے سارے واسے ختم ہو چکے ہیں نا اجی! تجھے یقین ہے نا کہ تیری صفورا اپنے وطن پر اپنا سب کچھ نثار کرنے جا رہی ہے۔ میرے جانے کے ٹھیک پون گھنٹے کے بعد اگر دھماکوں کی آوازیں آنا شروع ہو جائیں تو یقین کر لینا کہ تیری صفی اپنے وطن پر جان نثار کر کے جنت کی راہوں پر چل پڑی ہے۔ اور اگر خدا نخواستہ ایسا نہ ہو تو سمجھ لینا کہ میں نے زہر چکھ کر اپنے آپ کو موت کے اندھے کنویں میں دھکیل دیا ہے کیونکہ کرل کے بینکر سے ہم جیپ پر بڑے بینکر میں جائیں گے۔ جو تقریباً چالیس منٹ دور ہے اور پھر وہ بے صبر سو رہا فوراً مجھے اپنی دلہن بنانے کے لیے اگنی کے پھیرے لینا چاہے گا اور وہی اگنی اس کے لیے جہنم اور میرے لیے جنت کے در کھول دے گی۔ یہ ساری باتیں اُس کی بتائی ہوئی تھیں اجی! میں تو بس ایک پتنگ ہوں۔ ایسی پتنگ

میرے ساتھ ہوتی ہے اور وہ کبھی بھی بُری نہیں ہو سکتی۔ دن میں میں دوبار اس کے گھر گئی وہ بابا کی ساری چیزوں کو سلیقے سے رکھ رہی تھی۔ اس نے گھر کی ہر چیز کو سجا سنوار دیا۔ اس نے بابا کی پسندیدہ ”نجیری بنا کے چھوٹے چھوٹے“ کو لے بنائے اور ڈبے میں ڈال دیئے۔ اس نے دل و ذریا بنائیں اور انہیں بھون کر رکھ دیا۔ میں اُسے دیکھ رہی تھی ایک عجیب ماورائی سا حُسن اس کے چاروں طرف بکھرا ہوا تھا اور وہ مسکرا رہی تھی کوئی عام مسکراہٹ نہیں ایسی مسکراہٹ جو کسی محبوب ترین چیز کو حاصل کرنے کا خواب دیکھتے ہوئے ہوتی ہے۔ پھر فارغ ہو کر وہ نہائی، سیاہ لمبے بالوں کو سکھا کر بڑی سی چٹیا بنائے ہوئے وہ بولی ”اجی! اللہ تعالیٰ نے زندگی کو اپنی امانت کہا ہے نا، میں نے اس کی امانت میں کبھی خیانت نہیں کی اور آج میں اس کی امانت اُسے لوٹانے جا رہی ہوں، اجی! تمہارے مبر اور دعاؤں کی ضرورت ہے، اللہ مجھے اس امتحان میں کامیاب کرے۔“

میں نے آمین کہا۔ تم سوچ سکتی ہو بنو! کہ اُس وقت میرے دل پر کیا گز رہی ہوگی۔ بچپن کی سکھی یوں مجھ سے دُور چلی جائے گی وہ سکھی جس کو میں نے اپنے بھائی کی دلہن بنانا تھا۔ ہم لڑکیاں کیسے کیسے خواب دیکھتی ہیں۔ پر اُن کی تعبیریں تو اوپر والے کے ہاتھ میں ہیں۔ میں نے سارا دن آیت الکرسی کا ورد کرتے گزار دیا اور پھر رات کے بعد اس کے انتظار میں بیٹھ گئی۔ رات ڈھلے جب وہ میرے آنکھن میں اتری تو جیسے چاروں طرف نور ہی نور بکھر گیا۔ اس کی آنکھوں کی جوت بہت بڑھ گئی تھی اتنی کہ بنو! مجھ سے اس کی آنکھوں میں دیکھنا نہ گیا۔ جیسے مہندی کی رات دلہن بہت پارسا، بہت سندر، بہت نکھری ہوئی لگتی ہے نا۔ میری صفوان سب سے بڑھ کر لگ رہی تھی۔ ماں نے دو دفعہ کہا۔ ”آج تو کیا کھٹ پھٹ

کی ”بابا یہ تیری بیٹی کی بارات ہے جس پہ پٹا خنچ چل رہے ہیں۔ تیری بیٹی اپنے وطن کی دلہن بن کے اس پر قربان ہو گئی ہے، روئیں بابا، شہیدوں کے لیے روتے نہیں“ اور میں ماں اور بابا کو لیے اندر آ گئی اور میں نے ساری بات اُن کو تفصیل سے سنائی۔ میں رو بھی رہی تھی اور ہنس بھی رہی تھی۔ اور بابا..... وہ تو شدید عرش کی بلندیوں کو چھو رہے تھے۔ اُن کی پیشانی اتنی نورانی تو کبھی بھی نہ تھی۔ کیا یہ ایک شہید کا باپ ہونے کا اعزاز اللہ نے انہیں عطا فرما دیا تھا۔ ”میری بچی“ پتہ نہیں کیا کیوں، اس لمحے مجھے صفو سے بہت حسد ہوا۔ وہ، میری ہجولی، میری سکھی، میرے قدم سے قدم چلا کر چلنے والی، میرے مشوروں پر عمل کرنے والی پانچ روز کی ریاضت سے کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور میں تو وہیں کی وہیں تھی۔ ایک ڈرپوک، بزدلی چوڑے کی طرح بابا اور ماں کی بانہوں میں سسک رہی تھی۔

وہ دھماکے جانے کتنی دیر بعد تھے لیکن وہ کہاں تھے، صبح تک کسی نہ کسی اُٹار آتی رہی۔ اور ہم ڈرے سبے اپنے گھر میں دیکھ رہے کیونکہ اب گھر گھر تلاشی شروع ہوئے والی تھی اور ہمیں نہیں بتاتا تھا کہ ہماری بستی کی دو شیزو ایک عظیم الشان کارنامہ سرانجام دے کر شہید ہو چکی ہے۔

پھر کئی روز تلاشی میں گزر گئے، بستی کے کسی بندے نے صفورا کا ذکر نہیں کیا حالانکہ سب کو اس کی شہادت کا یقین ہو چکا تھا۔ اگلی راتوں میں میں نے محسوس کیا جیسے کوئی دبے پاؤں آنگن میں چل رہا ہے اور بڑی خوش الحانی سے آیت الکرسی کا ورد کر رہا ہے۔ بہت سے مردوں پر تشدد بھی کیا گیا۔ جن میں صفی کے بابا بھی شامل تھے۔ پھر سب گھروں کو آ گئے۔ بستی میں سرگوشیاں ابھرتی تھیں۔ ”رات کو تم نے دیکھا ایک دلہن گلیوں میں

جس کی ڈور اٹکیاں کاٹ ڈالتی ہے۔ اب مجھے جانے دے کیونکہ وہ شہ گھڑی آنے والی ہے۔ جس کا اس کو انتظار ہے اور مہر بان رحمتوں بھرے لمحے جن کا مجھے انتظار ہے۔ اپنے لبوں کو آیت الکرسی کے ورد سے سجائے رکھنا اُجی! بابا سے کہنا اس کی بیٹی آج بیٹا بن گئی ہے۔ جس کی اُسے ہمیشہ سے حسرت رہی۔ وہ ہمیشہ یہی کہتا رہا کاش میرا بھی کوئی بیٹا ہوتا جسے وطن کی مانگ میں سندور آزادی بھرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتا۔ اب ہم سب جنتوں میں ملیں گے۔“

اور وہ چلی گئی، میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ رات کی سیاہی میں میری آنکھیں اُسے جاتے دیکھ رہی تھیں اور وہ جس پری کی طرح ہواؤں میں اُڑ رہی تھی۔

پھر میں نے اندر آ کر جائے نماز بچھائی اور سجدے میں گر گئی۔ میں رو رہی تھی۔ کیا دُعا کر رہی تھی مجھے کچھ خبر نہیں۔ میرے آنسوؤں سے زمین بھگ رہی تھی۔ میری صفو کی حفاظت کرتا میرے رب اس کی عزت و پاکیزگی کی حفاظت کرنا۔ اسے اپنے امان میں رکھنا باری تعالیٰ! اُسے تنہا نہ چھوڑنا۔ اس شیطان سے اس کی حفاظت کرنا، جانے کتنا وقت بیت گیا۔ پلوں کے نیچے سے کتنا پانی گزر رہا۔ کتنے تارے ڈوبے اور کتنے نئے ابھرے مجھے کچھ خبر نہیں یہ لمحے نہیں تھے صدیاں تھیں۔ جو میرے آنسوؤں کی روانی میں بہے جا رہی تھیں۔

اور پھر ایک دم سے زمین لرز اُٹھی۔ ساری بستی گھروں سے باہر نکل آئی۔ ماں بھی میرا ہاتھ تھامے باہر آ گئی۔ بابا بھی اپنی لائٹنی ٹیکے آ گئے۔ ہر ایک کی زبان پر تھا ”یہ کیا ہو رہا ہے، کیا بستی پر حملہ ہونے والا ہے، کیا ڈوگرے یہاں آ گئے ہیں“۔ ”صفو کہاں ہے اُجی! میری بیٹی کہاں ہے؟“

بابا نے فوراً اُسے تلاش کرنا چاہا تو میں بابا سے لپٹ گئی۔ میں نے بابا کے کان میں روتے ہوئے سرگوشی

گھوم رہی تھی، رات کو تمہیں کسی خوشبو نے گھیرا، بہت سندرستانی سی خوشبو تھی جو آگے آگے جا رہی تھی اور منو دلہن بنی مسکراتی چم چم کرتی میرے آنکھن میں تو روز اترتی تھی۔

بعد میں لوگوں نے کہا کہ ڈوگرہ کرل نٹے میں دھت تھا۔ اس کو اٹھو کر لگی اس کے ہاتھ سے سگریٹ گر کر کسی ڈرم کے ساتھ ٹکرائی اور چاروں طرف تباہی پھیل گئی لیکن یہ ٹھوکر کس نے لگائی کسی کو اس کا علم نہ تھا۔

دادی ماں رو رہی تھیں اور میرا بھی بُرا حال تھا ”وہ بولیں اس کے بعد گھر گھر تلاشی ایک بدروح کی طرح ہمارے علاقے میں کھس آئی۔ جوان بیٹیوں کو کہاں چھپائیں۔ عزتیں کیسے محفوظ ہوں گی۔ ہمارے مفتی صاحب نے ہجرت کا فتویٰ دے دیا اور یوں ہم اپنا وطن اپنی ماں جیسی پاک زمین اپنے لہلہاتے کھیت، شگوفوں سے لدے، درخت اور گنگناتی فضاؤں کو چھوڑ کر آگئے لیکن میری بنو! میرا گیت سن لو۔

میرے وطن! میرے وطن
تیری جنت میں آئیں گے اک دن
ستم شعاروں سے تجھ کو چھڑائیں گے اک دن
گنگناتی گل و نستان نہیں بھولے
حسین پھولوں کی وہ انجمن نہیں بھولے
تیری بہاروں میں پھر مسکرائیں گے اک دن
جہاد حق کے لیے کر رہے ہیں تیاری
دکھائیں گے صفِ دشمن کو شانِ قہاری
تیری فضاؤں میں کلیاں کھلائیں گے اک دن
بھلاؤں کے مناظر تیری بہاروں کے
اور روتے روتے، دادی ماں کی ہچکی بندھ گئی ”وعدہ
کر دو میرے ساتھ! تم لوگ میری جنت کو دشمن کے

چنگل سے آزاد کراؤ گے، وعدہ کرو۔“

اور میں آج صبح کی ڈائری کا وہ صفحہ پڑھ رہی ہوں ”نہ رو بیٹی! میرے گھر کا چراغ تجھ سے روشن ہے۔ صبح! میں اپنی ساری توانائیاں ایک بیٹے کے کاندھے پر رکھنا چاہتا تھا۔ ان ہاتھوں سے پھینکے ہوئے وزنی بم اس کی ملکیت میں دینا چاہتا تھا۔ میری جوانی نے ہزاروں دشمنوں کی جوانیاں خون میں نہلا دی تھیں اور میں سوچتا تھا ایک بیٹا میری اس طاقت کو اور مضبوط کر دے گا میری ننھی کلی! تو یہ سب نہیں کر سکتی! اللہ کرے تیرے وجود سے جنم لینے والے تیرے بیٹے اس خوبصورت وادی کو ابلیسی دشمن کے چنگل سے آزاد کروالیں۔“ ”بابا! میں تیری دعا ہوں۔ میں وہ آہنی ہاتھ بن جاؤں گی جس سے دشمن کو بہت بڑا نقصان ہوگا اور بابا میں تیرا سرخسر سے بلند کروں گی۔“

اور یہ سب پڑھتے ہوئے میں سوچ رہی ہوں ”ناز و نعم میں پلنے والے ہم کیا کبھی اتنے مضبوط ہو سکیں گے۔ ایئر کنڈیشنڈ سکولوں میں پڑھنے والے بچے، اور کمپیوٹر اور آئی پیڈ پہ گیمز کھیلنے والے بچے کیا بھاری بندھنوں اور بموں کا بوجھ اٹھا سکیں گے۔ ہم تو دن بدن ایک نازک اندام قوم ہوتے جا رہے ہیں۔ ایمان کی بہت ساری کمزوریوں کے ساتھ لیکن اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ہمیں سے ایک ایسی قوم پیدا کرے گا جو اسلام کا پرچم لہراتے ہوئے اقبال کے اس خواب کو شرمندہ تعبیر کرے گا۔

چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا
کیونکہ ایک عورت بھی عزم و ہمت کی دیوار بن
سکتی ہے اور عورت کے عزم کے سامنے تو چٹانیں
سرنگوں ہو جاتی ہیں۔



ہنسی علاج غم

حساب

استاد (شاگرد سے) اگر تین مرغیاں اور ایک مرغ ہو تو گل کتنے بنیں گے؟
شاگرد (سوچ کر) جی تقریباً ساٹھ اٹھ سے اور
ان میں سے تقریباً چالیس چڑے بنیں گے۔

(مرسلہ: خالدہ کرمان - وزیر آباد)

دانتوں کا ڈاکٹر

ایک جگہ پہلوانوں کی کشتی ہو رہی تھی۔ ایک صاحب بڑے زور زور سے کہہ رہے تھے۔ ”توڑ دے توڑ دے تیس کے تیس دانت توڑ دے۔“
ایک اور صاحب نے پوچھا۔ ”کیا آپ ان کے سپورٹر ہیں؟“
”جی نہیں میں تو ڈسٹ (دانتوں کا ڈاکٹر) ہوں۔“ جواب ملا۔

(مرسلہ: شہزادی ناہیدہ - ساہیوال)

وجہ

دو دوست کچھ دن بعد ملے تو ایک نے دیکھا کہ دوسرے کے سامنے کے تین دانت ٹوٹے ہوئے تھے۔ پوچھا۔

”ارے یہ کیا ہوا تمہارے سامنے کے تین دانت کہاں گئے؟“

”بار بیوی نے کڑک روٹی بنا کی تھی۔“ جواب ملا۔
پہلا دوست بولا: ”تو بھلے مانس کھانے سے انکار کر دیتے۔“

دوسرے دوست نے جواب دیا۔ ”وہی تو کیا تھا۔“

(مرسلہ: حیدر ناظم - لاہور)

سنہری موقع

بچ (چور سے) تم نے جوہری کی دکان سے زیورات چرا لئے تھے۔

چور۔ جی ہاں۔ بچ۔ مگر کیوں؟

چور۔ کیونکہ جوہری کی دکان کے شوکیں پر تحریر تھا۔ سنہری موقع سے فائدہ اٹھائیں۔

(مرسلہ: انوشین اسد - لاہور)

دعویٰ

ایک بچی ایک عامل کے پاس گیا جس کا دعویٰ تھا کہ وہ روحوں سے ملاقات کروا سکتا ہے اور یوں میں اپنے دادا کی روح سے بات کرتا چاہتا ہوں۔

عامل نے ایک ٹیم تار ایک کمرے میں لے گیا یہاں ایک گنجدار آواز آئی ”کیا بات ہے میرے پوتے“
بچے نے کہا ”دادا جان آپ کی روح یہاں کیا کر رہی ہے۔ آپ کا تو ابھی انتقال بھی نہیں ہوا؟“

(مرسلہ: نعم سلمان - حافظ آباد)

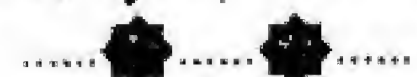
غصہ

ایک بھڑائی ایک جگہ زمین کا معائنہ کرنے گیا۔ وہاں اسے کٹوں نے گھیر لیا۔

بھاگتے بھاگتے اس نے غصے سے کہا۔ ”کاش تمہاری ایک ایکڑ بھی زمین ہوتی تو میں تمہیں سبق سکھا دیتا۔“
(تحریر: مرتضیٰ حسن - پشاور)

افسوس

ایک بڑے شہر کے بک سیلر سے کسی مذہبی آدمی نے مذہب سے متعلق دو کتابوں کے ایڈیشن طلب کئے۔ ایک کتاب کا نام ”خدا کے ماننے والے“ اور دوسری کا نام ”خدا پر اعتماد“ تھا۔ بک سیلر نے وعدہ کیا کہ وہ ہفتے کے اندر یہ نئے ایڈیشن دوسرے شہر سے منگوا دے گا۔ اس نے تار دیا۔ وہاں سے جواب آیا۔ ہمیں افسوس ہے کہ یہاں ”خدا کے ماننے والے“ اور خدا پر اعتماد کرنے والے دونوں ہی ختم ہو چکے ہیں۔



”محبت کی معراج“

محمد سلیم اختر

سارنگ کے جھروکوں سے ایک یادگار تھنہ نواب سعد اللہ خان کی دلہن کی کہانی ہے جس نے اپنی شادی کے لیے چار من الاہنجی فراہم کرنے کی شرط رکھی تھی!

نواب ہاتھی پر سوار تھا، دلہن کا ڈولا سرخ اٹلس اور پھولوں سے سجاتھا، سولے اور چاندی کے پھول اس پر بچھا دیے جا رہے تھے۔ نوان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ گاؤں سے باہر درخت کے نیچے کھڑا شیر و رو رہا تھا۔ ڈولا جب اس کے پاس سے گزرا تو نوان نے ڈولی سے پردہ اٹھا کر شہر سے کہا ”شیر سے جب میں مر جاؤں تو کرا اپنے ہاتھوں دفن کرو دینا۔“



تھی۔ وہ جب چکی پر بیٹھتی تو اس کے خُسن کو چار چاند لگ جاتے۔ اس کی خوبصورتی میں اور بھی اضافہ ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے خُسن کی بے پناہ دولت سے نوازا تھا۔ جو بھی اس خُسن کی دیوی کو دیکھتا۔ مبہوت سا ہو جاتا، حیران رہ جاتا اور اس کے خُسن کو اپنے خوابوں

پٹنہ کے قریب ایک گاؤں لکھل پور میں ایک نہایت ہی غریب شخص کی بیٹی کے خُسن اور خوبصورتی کے بہت ہی چرچے تھے۔ غربت نے بھی اس کا خُسن ماند نہیں پڑنے دیا تھا۔ گویا کیچڑ میں پھول والا معاملہ تھا۔ وہ غربت کی ماری ”ٹا، نمک اور مرچ پیس کر گزار کرتی

اور خیالوں سے نہ جھٹک پاتا۔

ریاست کے ولی عہد سہد اللہ خان کی جب اس پر پہلی نظر پڑی تو قدرت کی صنائی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کے ایک ایک رنگ سے حسن کا چشمہ بہہ رہا تھا۔ ہیرے شہاب جیسی رنگت اور اسکی مدھ بھری نشلی آنکھیں دیکھ کر اسے لگا کہ جیسے اپسرا بھول کر زمین پر اتر آئی ہے۔ ولی عہد اتنا بے قرار ہوا کہ اس نے بے اختیار ہو کر اس کی بانہ پکڑ لی۔ پھولوں سی لدی شاخ جیسی بانہ۔ اس کے ہاتھ میں آنے کی دیر تھی کہ وہ ہاتھ چھڑا کر بھاگ نکلی۔ وہ کھیتوں میں دور تک بھاگتی چلی گئی۔ ولی عہد بھی اس کے پیچھے بھاگتا اسے اپنی محبت کا یقین دلارہا تھا بالآخر اس نے اسے جالیا۔

اسی کھیت میں لڑکی کا باپ کام کر رہا تھا۔ اس نے بیٹی کی چیخیں اور فریاد سنی تو بھاگا..... اس کو آتے دیکھ کر دلی عہد نے لڑکی کو چھوڑ دیا اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر ہوا ہو گیا۔ لڑکی کے باپ نے بیٹی کو گلے سے لگایا اور ولی عہد کو دور تک جاتا دیکھتا رہا۔

اس لڑکی کا نام وحیدن تھا۔

ولی عہد نے ایک عرصہ تک اپنی ہر کوشش کر ڈالی کہ وہ لڑکی اس کی حرم سرا میں آجائے۔ طرح طرح کے لالچ دیئے گئے مگر اسے کامیابی نہ مل سکی۔ وحیدن کے باپ نے جلدی سے اس کی شادی کر دی اور وہ اپنے گھر کی ہو گئی اور اپنے شوہر کے ہمراہ خوش و خرم زندگی گزارنے لگی۔ یہ اس دور کی بات ہے کہ ہر طرف امان و انصاف اور خدا ترسی تھی۔ ولی عہد کا باپ نہایت ہی سخت اور اصول پسند قسم کا انسان تھا اور خاص کر اس معاملے میں وہ زبردستی کا قائل نہ تھا ورنہ وحیدن کسی نہ کسی طرح حرم سرا کی مہمان بن ہی جاتی۔

ولی عہد کو ناکامی ہوئی تو اس نے اس غم کو سینے سے لگالیا۔ اس نے اس غم کو ہلانے کے لیے شراب کا

سہارا لیا اور دن رات شراب کے نشے میں دھت رہنے لگا۔ وحیدن اس کے خوابوں اور خیالوں سے نہ نکل رہی تھی۔ اس نے اوپر تلے کئی شادیاں کر ڈالیں۔ عیش و عشرت کی محفلیں بھی سجا کیں۔ مگر وہ وحیدن کو نہ بھلا سکا۔ وہ جب کبھی وحیدن کو دیکھتا اس کے سینے پر سانپ لوٹنے لگتے۔ وحیدن کئی بچوں کی ماں بن گئی تھی۔ ان میں اس کی بیٹی نوان سب سے زیادہ خوبصورت تھی۔ وہ اپنی ماں پر گئی تھی بلکہ اس سے بڑھ کر تھی۔ وہی رنگ وہی نقش و نگار، وہی روپ، وہی جوانی کا خمار، وہی بانگین..... جسے ولی عہد نے دیکھا تو وہ نوان پر فدا ہو گیا۔

نوان اب جوان ہو چکی تھی جبکہ ولی عہد بڑھا پے کی دہلیز کو چھو رہا تھا مگر اس کا عشق ابھی بھی جوان تھا۔ نوان کو دیکھ کر وہ وحیدن کو بھول گیا اور نوان سے شادی کرنے کے خواب دیکھنے لگا وہ نوان سے شادی کر کے اپنی وہ حسرتیں پوری کرنا چاہتا تھا جو وحیدن کے نہ ملنے سے ناکام ہو گئی تھیں۔ مگر نوان ولی عہد کے ارادوں سے بے خبری تھی وہ تو اپنی دنیا میں اور پیار میں مگن تھی۔ گاؤں کا چرواہا شہر، نوان سے بے پناہ محبت کرتا تھا وہ ایک گھبرو جوان تھا اور مردانہ حسن میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ پورے گاؤں میں اس جیسا بہادر اور لٹھ باز جوان نہیں تھا۔ چاندنی راتوں میں جب وہ بانسری کی تان چھیڑتا تو راہ چلنے والے بھی ٹھٹک جاتے۔ اس کی بانسری میں ایک جادو تھا۔ حسن و عشق کا جادو جو سرچڑھ کر بولتا تھا۔ نوان اس سے محبت کرتی تھی۔ شہر و نوان سے محبت کے زیادہ عہد و پیمان نہ کیے بلکہ اس سے شادی کرنے کا کھل کر اظہار کر ڈالا اس نے اپنی ماں کو نوان کا رشتہ لینے اس کے گھر بھیج دیا۔

وحیدن بھی بڑھا پے کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھی پھر بھی وہ اسی طرح حسین تھی۔ اسے ایک پچھتاوا

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور عظیم پیشکش

حج عمرہ اور زیاراتِ نبویہ

شائع ہو گیا ہے

قیمت 175 روپے

- ① نقشہ ارض القرآن مع اہم قرآنی مقامات کی نشان دہی
- ② مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا روڈ میپ
- ③ حج اور عمرہ کی ادائیگی کا طریقہ آسان اور عام فہم زبان میں
- ④ اہم تاریخی مقامات کا نام، وجہ تسمیہ، محل وقوع، تصاویر اور ان سے متعلق
- ⑤ تاریخی واقعات کا بیان نیز متعلقہ آیات اور احادیث کے حوالہ جات
- ⑥ تحریروں، تصویروں اور جدید نقشوں سے مزین یہ کتاب ہی نہیں حج اور عمرہ پر جانے والوں کے لئے ایک مکمل گائیڈ ہے۔

سیارہ ڈائجسٹ 240 ریوانگراؤن لاہور فون 042-37245412

اس سے مڈ بھڑ ہوتی تو اس کی آنکھوں میں وہی پیار دیکھ کر وہ پچھتانے لگتی کہ اس کی شادی ولی عہد سے ہوتی تو وہ کیسی حسین زندگی گزار رہی ہوتی۔ نوان کے لیے شیرو جودا ہے کا رشتہ آیا تو اسے ایسا لگا کہ جیسے وقت کی مہار کسی نے تھام لی ہو۔ وحیدن جانتی تھی کہ نوان شیرو سے پیار کرتی ہے۔ اسے لیے اس نے نوان کو اپنی مثال دیتے ہوئے کہا کہ پیار ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا، زندگی گزارنے کے لیے مال و دولت کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور بھی بہت کچھ درکار ہے۔ مگر نوان کچھ نہ بولی۔۔۔۔۔ وہ خاموش ہی رہی۔

شیرو کی ماں روزانہ ہی وحیدن کے گھر آنے لگی اور نوان کے رشتے کی بات کرتی مگر وحیدن کا جواب

اب بھی تھا اور وہ کہتی تھی کہ ایک غریب انسان کی بیوی بن کر میں نے اپنی قدر و قیمت کھودی ہے۔ کاش میں محل کی رانی بن کر رہتی اور مزے سے راج کرتی دنیا کی ہر چیز میرے قدموں میں ہوتی۔

اس کا غریب شوہر سنتا تو ڈکھی سا ہو جاتا اور کہتا ”وحیدن! جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ میں نے غریب ہونے کے باوجود تجھے اتنا پیار دیا ہے کہ دنیا جانتی ہے کہ تمہیں تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ تجھے اتنی خوبصورت اور پیاری اولاد دی ہے۔“

مگر وحیدن اب باسودہ خواہشات اور پچھتاؤں کی بھینٹ چڑھ چکی تھی۔ اسے خوبصورت ولی عہد یاد آتا۔ تو پچھتاوے اسے پھیر لیتے گاؤں میں کبھی کبھار

تاخیر

ایک ٹیلر ماسٹر ایک پوشاک بنانے والی فرم میں پچیس برس سے ملازم تھا اور وہ کبھی بھی کام پر تاخیر سے نہ پہنچا تھا۔ ایک روز وہ نو بجے کی بجائے دس بجے اپنے کام پر پہنچا تو اس کے سر اور بازوؤں پر پلاسٹر اور پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ فرم کے مالک نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔۔۔۔۔ ”تم دیر سے کیوں آئے ہو؟“ ٹیلر ماسٹر: میں ناشتے کے بعد تیسری منزل پر واقع اپنے مکان کی کھڑکی سے جھانک رہا تھا کہ نیچے گر گیا۔ ”تو اسی میں ایک گھنٹہ لگ گیا۔“ فرم کے مالک نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

(دعا حیدر۔ لاہور)

کرامات

مقابلے کے امتحان میں امیدوار سے پوچھا گیا: ہندوؤں کے ایسے دو لیڈروں کے نام بتائیے جن میں سے ایک نے مسلمانوں کو سینے سے لگایا اور دوسرے نے پیچھے سے چھرا گھونپا۔ امیدوار: بابا پو اور گاندھی جی۔

بورڈ کا چیئر مین: آپ بالکل صفر ہیں افسری خاک کریں گے؟ آپ کو اتنا معلوم نہیں کہ گاندھی کو بابا پو کہا جاتا ہے۔ آپ تشریف لے جائیے۔

امیدوار: جناب! مجھے تو بہت کچھ معلوم ہے لیکن شاید آپ لنگوٹی کی کرامات سے واقف نہیں ہیں۔

لا جواب

ایک خاتون نے ایک فقیر کو بہت سے پرانے کپڑے دیتے ہوئے کہا یہ سب تمہارے کام آ جائیگے۔ انہیں معمولی سی مرمت کی ضرورت ہے زیادہ سے زیادہ ایک دن کا کام ہے۔ ٹھیک ہے بیگم صاحبہ تو پھر میں کل آ جاؤنگا۔ فقیر نے کپڑے وہیں چھوڑ کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

(مرسلہ: نصیر اختر۔ لالہ موی)

مرہٹہ پیشور بالاجی باجی راؤ، پورے ہندوستان پر اپنے راج کے خواب دیکھ رہا تھا۔ ایک قیامت سی پاتھی۔ نفسا نفسی کا دور دورہ تھا۔ مغل حکومت طوائف الملوکی کا شکار تھی۔ ولی عہد شاہ عالم کرناٹک میں تھا اور دلی کے لال قلعے میں شاہ عالم کے بیٹے جوان بخت تھے۔ سد اشید بھاؤ اور بسواس راؤ نے تین لاکھ لشکر کے ساتھ دلی میں قدم رکھا۔ قلعہ دار یعقوب خان اور اس کے پانچ ہزار سپاہی اتنے بڑے لشکر کا مقابلہ قلعہ بند ہو کر کرب کرتے۔ مجبوراً قلعہ مرہٹوں کے حوالے کرنا پڑا۔ مرہٹوں نے جوان بخت کو تخت نشین کر کے وزارت شجاع الدولہ والی اودھ کے حوالے برائے نام کر دی۔

ایسے میں سارے کاروبار بند تھے۔ منڈیاں اور بازار ویران تھے۔ نوان کی فرمائش نواب کے لیے تھوڑا سا مسئلہ تو بنی مگر اس نے حکم یافتہ کیا کہ کسی طرح پانچ من الاچھی فراہم کی جائے تاکہ وہ بارات لے کر جاسکے۔ بمشکل تین من الاچھی ملی۔ نواب کے کاروندوں نے مزید فراہمی سے انکار کر دیا۔ نواب نے پھر سختی سے حکم دیا کہ کسی بھی شہر اور کسی جگہ سے الاچھی خریدی جائے ورنہ کسی کی خیر نہیں۔ کارندے حکم پا کر پھر سے الاچھی کی تلاش میں نکلے وہ بنارس اور فیض اودھ تک گئے اور کسی نہ کسی طرح الاچھی لے ہی آئے۔

وحیدن اس روز بہت خوش تھی کہ اس کے گھر نواب کی بارات آنے والی تھی۔ نہایت شان و شوکت و ہوم دھڑکے اور باجے گاجے کے ساتھ بارات آئی۔ ہزاروں روپے لٹائے گئے۔ وہ رنج الاول کی نو تارخ تھی۔ جب نوان کا نام بدل کر نزہت محل رکھا گیا۔ نواب ہاتھی پر سوار تھا، دلہن کا ڈولا سرخ اطلس اور پھولوں سے سجاتھا، سونے اور چاندی کے پھول اس پر بچھاؤ کیے جا رہے تھے۔ نوان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ گاؤں سے باہر درخت کے نیچے کھڑا

نہ پا کر ایک روز بولی اور کہنے لگی ”وحیدن! ہم بھی تمہاری طرح غریب لوگ ہیں مگر تم تو جانتی ہو کہ نوان اور شیرو ایک دوسرے سے کتنا پیار کرتے ہیں نوان کی شادی کے لیے ہاں کر دے وہ دونوں تمام عمر خوش رہیں گے، اب کوئی نواب زادہ تو نہیں آئے گا نوان کو بیاہئے۔“

وحیدن بولی ”میں نوان کی شادی کسی نواب ہی سے کروں گی شیرو سے نہیں۔“

وحیدن نے یہ کہہ کر شیرو کی ماں کو انکار کر دیا۔

سعد اللہ خان، جو اب نواب بن چکا تھا۔ اس نے بھی اپنے آدمی وحیدن کے پاس نوان کے رشتے کے لیے بھیج دیئے۔ وحیدن کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ اس نے نوان کو بتایا مگر وہ بے چاری کیا کہتی۔ وہ جان گئی تھی کہ اس کی ماں شیرو سے تو اس کی شادی کسی صورت نہ کرے گی اس نے سن رکھا تھا کہ نوابوں کی شادیوں میں ”الاچھیاں“ عطر اور پھول آتے ہیں۔ نوان نے تو زندگی میں الاچھی دیکھی بھی نہ تھی۔ نہ جانے اس کے من میں کیا سمائی کہ وہ بولی اور ماں سے کہنے لگی ”نواب سے کہو کہ میری بری بیس پانچ من الاچھیاں لاسکتا ہے تو میں شادی کے لیے تیار ہوں!!“ نوان نے یہ سوچا تھا کہ الاچھی کوئی بہت ہی مہنگی چیز ہوگی۔ نواب نہ لاسکے گا اور شادی سے انکار کر دے گا۔ یوں اس کی شادی شیرو سے ہو جائے گی یہ نوان کی سادگی اور بھولپن تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ الاچھی تو ایک سستی چیز ہے جو نواب کے لیے ناممکن نہیں ہوگا۔

یہ 1760ء کا ذکر ہے اس وقت حالات کچھ زیادہ ہی خراب تھے۔ مرہٹے ملک میں جابھی مچا رہے تھے اور تخت تاراج کر رہے تھے۔ راجہ بھرت پور اور سورج مل جاٹ، مہار راؤ بکر اور سندھیا کا ساتھ دے رہے تھے ان کے فوجی شہر میں لوٹ مار کرتے پھر رہے تھے۔

اس نے نوان کی قبر پر ایک ریشمی چادر چڑھائی اور روتے ہوئے بولا ”یہ بھی میری شادی اور یہ میری دلہن جو مٹی کے نیچے سو رہی ہے۔“

اپنی محبت کو یادگار بنانے کے لیے بوڑھے کڑاے شیر و نے دن رات محنت کر کے مٹی سے ایک مقبرہ بنالیا۔ مٹی کے ہر ذرے میں اس کی محبت فروزاں تھی۔ کوئی ذرہ اور کوئی اینٹ ایسی نہ تھی جس پر اس کے آنسو نہ ٹپکے ہوں۔

مٹی کا یہ انمول مقبرہ آج بھی محبت کی داستان لیے ہوئے ہے۔ چاندنی راتوں میں یہ روشن روشن مقبرہ اپنی داستان محبت زبان خموشی سے بیان کرتا ہے۔ آج بھی پنہ کے قریب گنگا کے کنارے مٹی کا یہ خوبصورت مقبرہ پوری آب و تاب کے ساتھ جھمکا رہا ہے۔ اسے ”مقبرہ الاچھی بیگم“ کہا جاتا ہے۔ دور دور سے سیاح اور محبت کے متوالے آکر محبت کی یادگار دیکھتے ہیں اور پھر سر جھکا کر نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

ہر سال یہاں عرس منعقد ہوتا ہے۔ محبت کرنے والے اور نوجوان لڑکیاں یہاں آکر چادریں چڑھاتی ہیں۔ یہ چادریں محبت کی ائین ہوتی ہیں اور ان کو تحفے میں دیا جاتا ہے۔ خاص طور پر ویلنٹائن ڈے کو تو یہاں محبت کے متوالوں کا ایک ہجوم ہوتا ہے۔ ریشمی چادروں کا ایک انبار لگ جاتا ہے۔ جو بطور تحفہ ایک دوسرے کو دی جاتی ہیں۔ اس چادر کے ہر تار میں محبت کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ نوان کی انٹ وفا کی خوشبو..... جو یہ ثابت کرتی ہے کہ محبت بھی نہیں مرنی لیکن اپنا آپ منواتی ہے۔ محبت زندہ رہتی ہے۔

نوان مٹی سے بنی تھی، مٹی میں مل گئی اور اس کا مقبرہ بھی مٹی کا ہی بنا۔ جو اہل دل کو سنگ مرمر سے بنے تاج محل سے بھی زیادہ پیارا لگتا ہے اور یہی نوان اور شیر و کی محبت کی معراج ہے۔



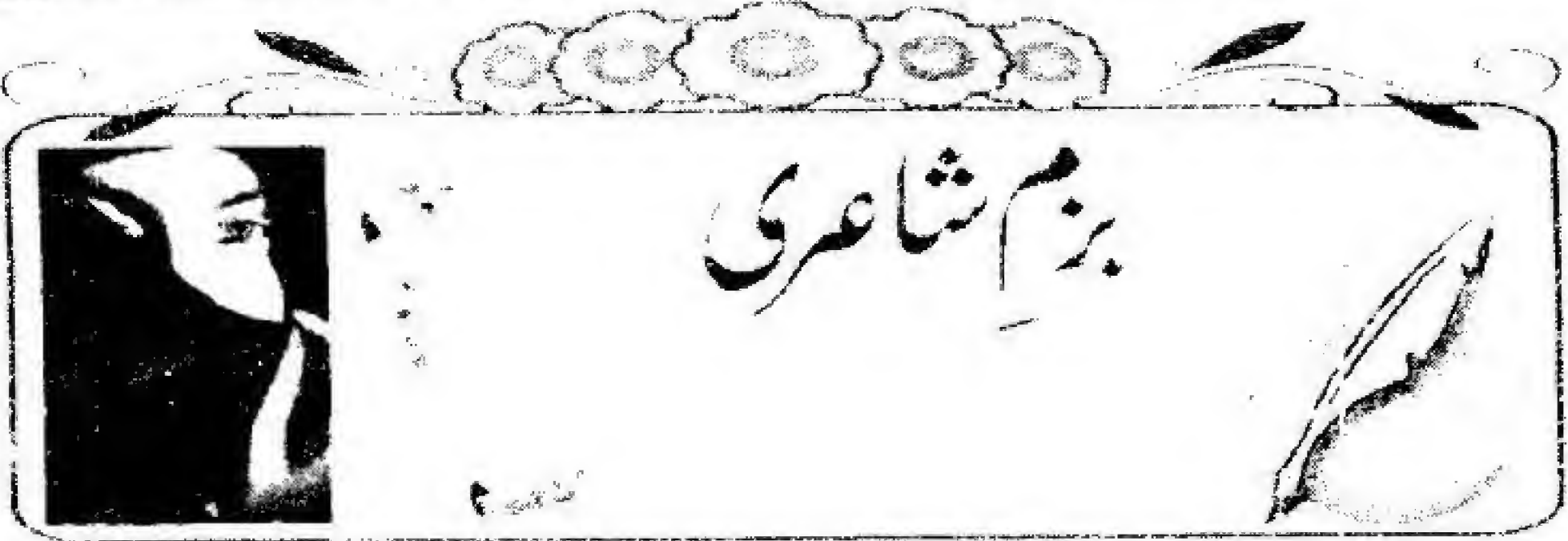
شیر و رہا تھا۔ ڈولا جب اس کے پاس سے گزرا تو نوان نے ڈولی سے پردہ اٹھا کر شیر و سے کہا ”شیرے! جب میں مرجاؤں تو آکر اپنے ہاتھوں دفن کر دینا۔“

شیر و نے روتے ہوئے وعدہ کر لیا۔ نواب نے سن لیا اور نئی نوپا دلہن کی یہ خواہش پوری کرنے کا وعدہ کر لیا۔ نواب نے نوان کو الاچھی نل کا خطاب دے ڈالا۔

چند برس گزرے تو نواب کا انتقال ہو گیا محل میں چار بیوائیں موجود تھیں۔ نوان روزانہ ہی صبح کو محل کے جھرونگے میں آکر بیٹھ جاتی اور وہاں سے شیر و کو دیکھا کرتی۔ وہ وسال گزر گئے۔ یہاں تک کہ اس پر بھی بڑھاپا آ گیا۔ 53 سال ایک طویل عرصہ ہوتا ہے۔ 53 سال نوان نے شیر و کو دور دور سے دیکھ کر گزر دیئے۔ وہ اتنے برس سے موت کا انتظار کرتی رہی کیونکہ مرنے کے بعد ہی وہ اپنے محبوب کی بانہوں میں جا کر سکون سے ابدی نیند سو سکتی تھی۔ نوان کی آخری تمنا یہی تھی۔ یہی اس کی آخری خواہش تھی۔ شیر و روز صبح جھرونگے کے باہر آکر کھڑا ہو جاتا تھا۔ ایک دن وہ حسب معمول آیا تو نوان وہاں موجود نہیں تھی۔ اس کا دل گھبرانے لگا کیونکہ اتنے برسوں میں کبھی ناغہ نہیں ہوا تھا۔ محل کے دروازے پر آکر پوچھا تو معلوم ہوا کہ نوان بیمار ہے۔ شیر و بہت ہی فکر مند ہو گیا۔ پندرہ دن یوں ہی گزر گئے۔ نوان پندرہ دن بیمار رہ کر مر گئی۔ شیر و کو پتہ چلا تو وہ روتا پینٹا آیا تھا۔ نوان جس نے ایک جھونپڑی میں جہنم لیا تھا موت اسے محل میں لے آئی تھی۔

نوان کو سب الاچھی نل کے نام سے پکارتے تھے۔ نواب کی بڑی بیگم نے اس کی لاش شیر و کے حوالے کی اور طنز سے بولی ”یہ الاچھی واقعی تمہارے لیے موزوں تھی۔“

شیر و روتا پینٹا نوان کو محل سے لے آیا اور اسے گنگا کے کنارے برگد کی چھاؤں میں اسے دفن کر دیا۔



غزل

جیسے بھی ہو تم میرے ہو
اک بار کہو تم میرے ہو
سو باتوں کی بات ہے یہ
تم جہاں بھی رہو بس میرے ہو
دنیا سے کچھ نہ چھپانا تم
سب سے کہہ دو تم میرے ہو
اب سوچ پیار کو چھوڑو بھی
مجھے اپنالو تم میرے ہو
سب کی باتیں اب جانے دو
بس مہر کہے تم میرے ہو
(مہر نسیم/ لاہور)

آخردہمبر کی ایک نظم

دہمبر پھر آگیا ہے!
بہت سارے گمشدہ لمحے
مجھے آوازیں دیتے ہیں
بہت سارے دلکش مناظر
یادوں کے جھروکوں سے جھانک کر
بیٹے ہوئے وہ رنگین موسموں کی
داستانیں سناتے ہیں
مجھے ان سارے لمحوں کو
آج آخر شب تک

ڈھونڈنا ہے

بہت سارے لفظوں کے
گیت بننے ہیں
بہت ساری ساعتوں کو
کہانیوں کی صورت محفوظ کرنا ہے
گلاب موسموں کی داستانیں بھی
رقم کرنی ہیں
ذرد رتوں کی اداس ساعتوں
کے افسانے بھی لکھنے ہیں
انگوٹھانے کو جو بہت دور رہتے ہیں
مگر آنکھوں میں بستے ہیں
درد کی صورت دل میں سمائے ہیں
(ڈاکٹر زرخشاں انجم)

غزل

ایک پردہ سا ہے جو حاکل اٹھایا جائے
جلوہ حسن حسن یار دکھایا جائے
اس نے جب اپنی کہانی میں مجھے چھوڑ دیا
اب ضروری ہے کہ کردار نبھایا جائے
جسدِ خاکی تو میرا کج لحد پہنچ گیا
اب میرا خون بھی مقتل سے اٹھایا جائے
اس نے آتا ہے جو سائے سے بھی ڈر جاتا ہے
رات کافی ہے کوئی دیپ جلایا جائے
جس نہج پر تھا محبت پہ وہ رانجھے کا یقین

اور مجھ پہ کھلے رات کسی اور طرح سے
یا جھومتا گاتا ہوا آئے گا ادھر وہ
یا گزرے گی برسات کسی اور طرح سے
نہے زیست خواب کچھ بھی کہے سوچ لیا ہے
دکھنا ہے تجھے ساتھ کسی اور طرح سے
لب لطف کے اسرار نہیں کھلتے ہیں مجھ پر
کر مجھ سے ملاقات کسی اور طرح سے
نہر کا گہرا اختیار پھر اک بار نظارہ
نہر کا کھلے رات کسی اور طرح سے
(ایس۔ امتیاز احمد)

غزل

کاش کہ ہم بھی تمہیں جان سے پیارے ہوتے
کاش ہر موڑ پر تم ساتھ ہمارے ہوتے
دھڑکی جاتا تھا گڑ پاس نہ آئے ہوتے
خواب آنکھوں میں ہماری نہ اُٹارے ہوتے
میں بکھرتا نہ کبھی زیست کے ہنگاموں سے
انکھیں سے جو مرے بال سنارے ہوتے
تیری الفت کی شمع رہتا اگر ساتھ تر!!
ہیت کے ہم نہ یہ بازی کبھی ہارے ہوتے
سنگ تو مدے رہاتے نے مگر کوئی نہ تھا!!
پیارے جس نے ہمیں پھول بھی مارے ہوتے
شامیں کرتے نہ مرے ہم کوئی حزن نہ تھا
کاش کچھ سے مرے ساتھ گزرتے ہوتے
دوبے دلا نہ یوں نوق سے ڈوبا ہوا
تم بھی اک بار جو ساحل سے پکارتے ہوتے
نیر دیتا نہ سزا مجھ کو وہ تنہائی کی
مرے دامن میں اگر چاند ستارے ہوتے
(نیر رضاوی)

اس سے آگے تو میرے وہم کا سایہ جائے
یہ جواک بوجھ سا کاندھوں پر میرے ہے نصرت
کس کا سر ہے یہ میرے پاس بتایا جائے
(نصرت عارفین / انتخاب: یاکمین کنول)

غزل

آنکھوں میں سیلاب ہے پیارے اور ہے کیا
اجڑا اجڑا خواب ہے پیارے اور ہے کیا
نیند بکھر جاتی ہے ہر اک آنکھ پر
دل میرا بیٹاب ہے پیارے اور ہے کیا
نصرت کی دیوار کھڑی ہے ساجوں میں
پیار بہت نایاب ہے پیارے اور ہے کیا
آج بھی میری سوچ کے گہرے ساگر میں
کشتی اک غرقاب ہے پیارے اور ہے کیا
آج بھی رانا اپنا جیون شیشے کا
درد کا ایک ہی باب ہے پیارے اور ہے کیا
(قدیر رانا۔ راولپنڈی)

غزل

تیرے دم آخرت پر تجھے الوداع بھی نہ کہہ سکی
تیری سادگی اتنی حسین بھی تجھے بے وفا بھی نہ کہہ سکی
عشق جرم تھا! مگر میں کر بیٹھی تجھ سے
کتنی نادان تھی دنیا اسے خطا بھی نہ کہہ سکی
تیری یاد نے مجھے کبھی تنہا ہونے نہ دیا
آن تنہا ہوئی بھی تو خود کو جدا نہ کہہ سکی
تجھے پوجنے کی مدد کر دی ساحل نے آج
تو شر تھا نہ کچھ خدا بھی نہ کہہ سکی!!
(ساحل نور)

غزل

دن بھر وہ گھرے بارت کسی اور طرح سے

ماضی

درد سے لرزے ہوئے دن رات ہیں
 زلف کی بکھری ہوئی زنجیر ہے
 ٹوٹے تاروں کی کچھ چنگاریاں
 پھول کی بکھری ہوئی تقدیر ہے
 داستان اُبھی ہوئی اک پیار کی
 اک ادھورے خواب کی تعبیر ہے
 چوڑیوں کے چند ٹکڑے اور اک
 خون سے لکھی ہوئی تحریر ہے
 اب تو بس اس دامن ویراں میں ہے
 ایک ماضی جو تری تصویر ہے
 (وصف وفا)

غزل

ساقی چالان کیے جائیں گے سے خانوں کے
 تاپ یکساں نہیں رکھتے ہیں جو پیمانوں کے
 اگر گرانی میں جہاں پھول ہوئے ہیں ارزاں!
 ریٹ دو گئے ہیں ہونے لگے گلدانوں کے
 حضرت شیخ کو حق گوئی کی توفیق کہاں؟
 وہ تو بھوکے ہیں اوّل روز سے نذرانوں کے
 ہم سے ہی کار نمایاں کی توقع رکھنا!
 ہم کہ سرخیل ہیں اس شہر میں دیوانوں کے
 بعض لوگوں کے رویوں سے پتہ چلتا ہے!
 بھیڑیے آگئے ہیں بھیس میں انسانوں کے
 اب تو تہواروں کی آمد سے ہی خوف آتا ہے
 تانے بندھ جاتے ہیں سسرال سے مہمانوں کے
 شتب ہونے ہاؤسنگ کی سکیموں کے لیے
 بخت بیدار ہوئے جب بھی بیابانوں کے
 کوئی اس شمع پہ تعزیر لگا دے اے کاش

بے سبب قتل کیے جاتی ہے پروانوں کے
 ماں کے ممتا سے جدا پیار سے بیوی کا نعیم
 ذائقے جیسے الگ ہوتے ہیں 2 کھانوں کے
 (نعیم نیازی)

غزل

کسی کو مناؤں یہ جی چاہتا ہے
 ہنسوں اور ہنساؤں یہ جی چاہتا ہے
 سرراہ آٹھل وہ رخ سے ہٹا دیں
 کہ پھر زخم کھاؤں یہ جی چاہتا ہے
 مجھے جام ایسا نظر سے پلا دے
 غموں کو بھلاؤں یہ جی چاہتا ہے
 کہ اب بن تمہارے بسر کیسے ہوگی
 میں ان کو سناؤں یہ جی چاہتا ہے
 تباہی کا احساس اپنی دلا کر
 انہیں آزماؤں یہ جی چاہتا ہے
 بہاروں کا موسم مجھے راس آئے
 میں غنچے کھاؤں یہ جی چاہتا ہے
 مجھے ان سے الفت ہوئی جا رہی ہے
 میں ان کو بتاؤں یہ جی چاہتا ہے
 اُجالے اخوت کے پھیلیں جہاں میں
 دیا وہ جلاؤں یہ جل چاہتا ہے
 دیا درس الفت کا اقبال تم نے
 جہاں کو سناؤں یہ جی چاہتا ہے
 (اقبال آرزو)

غزل

مُدی اور بھلی سب گزر جائے گی
 یہ کشتی یونہی پار کا اتر جائے گی
 طے گا نہ کچھیں کو گل کا پتہ
 ہر اک پگھڑی یوں نکل جائے گی

پہرے گرم نکالے سب نے!
 کبل اور رضائی..... سردی
 گرمی کے دن بیٹے..... سن لو!
 موسم کی انگڑائی سردی!
 کھاؤ پیسے اور..... با دام!
 پی لو سوپ کرو..... آرام!
 گاجر موٹی حلوہ جات
 سردی کی ہیں سب سوغات
 آئی سردی آئی سردی
 یہ لو! غضب کی آئی سردی
 (ڈاکٹر نعیم احمد ادیب)

غزل

جو اہل عشق ہیں نایاب ہوتے جاتے ہیں
 یہ زندگی کے چلن خواب ہوتے جاتے ہیں
 نشے کی جھانجھ میں پیر مغاں کے منصوبے
 جوار یوں کے حسیں خواب ہوتے جاتے ہیں
 وہ ذرے جن پہ نہ سورج کی پڑ سکیں کرنیں
 تمام کرک شب تاب ہوتے جاتے ہیں
 ابھی تو صاحب ظرف و ضمیر ہیں کچھ لوگ
 مگر یہ لوگ بھی کیا ہوتے جاتے ہیں
 تھا جس کی گونج سے آبادیوں میں واویلا
 زمیں میں جذب وہ سیلاب ہوتے جاتے ہیں
 گزرے ہیں جو شام و سحر کے ہنگامے
 کتاب وقت کا اک باب ہوتے جاتے ہیں
 (احسان دانش)

غزل

مستانہ ہے جا یونہی مستانہ ہے
 پیانہ تو کیا چیز ہے میخانہ ہے

رہیں گے نہ ملاج یہ دن جدا
 کوئی دن میں گنگا اتر جائے گی
 ادھر ایک ہم اور زمانہ ادھر
 یہ بازی تو سو بسوسے ہر چاہے گی
 نہ پوری ہوگی ہیں امیدیں نہ ہوں
 یونہی عمر ساری گزر جائیگی
 سنیں گے نہ حالی کی کب تک صد
 یہی ایک دن کام کر جائیگی
 (الطاف حسین حالی)

غزل

ابھی عیسیٰ ہو مریضوں کا خیال اچھا ہے
 ہم مرے جاتے ہیں تم کہتے ہو حال اچھا ہے
 تجھ سے مانگوں میں بھی کو کہ بھی پھل جائے
 سو سوالوں میں سے یہی ایک سوال اچھا
 جس کا انجام مصیبت وہ خوشی بھی ہے مری
 جس کا انجام خوشی ہو وہ ملاں اچھا ہے
 روز آتا ہے میرے دل کو تسلی دینے!
 تجھ سے اے دشمن جاں تیرا خیال اچھا ہے
 کہتے ہیں آج تو ناخن سے مرے دی تشبیہ
 کل کہو گے ترے ابرو سے ہلال اچھا ہے
 شک سے بوسہ ابرو نہیں دیتے وہ امیر
 کہوں کیا میں نے غزل میں کہ ہلال اچھا ہے
 (امیر مینائی)

سردی

کیسی سب کی حالت کر دی
 یہ لو! نصیب کی آئی سردی
 اٹھناؤ! مل کھاتی سردی
 ٹھنڈک خوب ہے لائی سردی

ایک بھی رستے نے تیرے شہر میں روکا نہیں
درو کا رستہ ہے یا ہے ساعت روز حساب
سینکڑوں لوگوں کو روکا ایک بھی ٹھہرا نہیں
شہنشی آنکھوں کے جگنو کا نپتے ہونٹوں کے پھول
ایک لمحہ تھا جو امجد آج تک گزرا نہیں
(امجد اسلام امجد)

غزل

شراب چیز ہی ایسی ہے نہ چھوڑی جائے
یہ میرے یار کے جیسی ہے نہ چھوڑی جائے
ہر ایک شے کو جہاں میں بدلتے دیکھا
مگر یہ ویسی کے ویسی ہے نہ چھوڑی جائے
اسی کے دم سے کھلتی ہیں یہ بوجھل راتیں
مگر یہ پانی کے جیسی ہے نہ چھوڑی جائے
یہی تو ٹوٹے دلوں کا علاج ہے انجم
میں کیا کہوں تجھے کیسی ہے نہ چھوڑی جائے
(سردار انجم)

کہ غرق مئے و جام، غم گردش لیا
تو اے دل، ناکام حکیمانہ ہے جا
مئے نوشی کے آداب سے آگاہ نہیں تو
جس طرح کہے ساقی میخانہ ہے جا
اس مکر کی بستی میں ہے مستی ہی سے ہستی
دیوانہ بن اور با دل دیوانہ ہے جا
مئے خانے کے ہنگامے میں کچھ دیر کے مہماں
ہے صبح قریب اختر دیوانہ ہے جا

(اختر شرانی)

غزل

رات بھر اس کشمکش میں اک پل سویا نہیں
کل میں جب جانے لگا تو اس نے کیوں روکا نہیں
یوں اگر سوچوں تو اک اک نقش ہے سینے پہ نقش
ہائے وہ چہرہ کہ پھر بھی آنکھ میں بنتا نہیں
کیوں اڑاتی پھر رہی ہے در بدر مجھ کو ہوا
میں اگر اک شارب سے ٹوٹا ہوا پتا نہیں
آج تنہا ہوں تو کتنا اجنبی ماحول ہے

خاص اعلان

محترم قارئین! بزم شاعری میں آپ کی دلچسپی کے پیش نظر ادارہ نے ایک خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس کے تحت ہر ماہ ایک خوش نصیب شاعر/شاعرہ کا تعارف بمعہ تصویر شائع کیا جائیگا۔ جو احباب اس سلسلہ میں شریک ہونا چاہتے ہیں وہ اپنی تازہ غزل/نظم/پسندیدہ شاعر کی غزل/نظم اور دیگر تفصیلات کے ساتھ درج ذیل کوپن پُر کر کے سیارہ ڈائجسٹ: 244 مین مارکیٹ ریواڑ گارڈن لاہور پر ارسال کریں۔

کوپن برائے اس ماہ کا شاعر

یہاں اپنی

تصویر

منسلک کریں

نام:

عمر:

پسندیدہ شاعر:

پسندیدہ غزل/نظم:

مشاغل:

تاریخ پیدائش/برج:

شادی شدہ/غیر شادی شدہ:

ای میل:

نوٹ: اپنی پسندنا پسند شاعری کی ابتدا مزاج اور دیگر تفصیلات الگ صفحے پر درج کر کے بھیجئے۔



ذہنی دباؤ عورتوں کو سہیلیوں کے قریب کر دیتا ہے



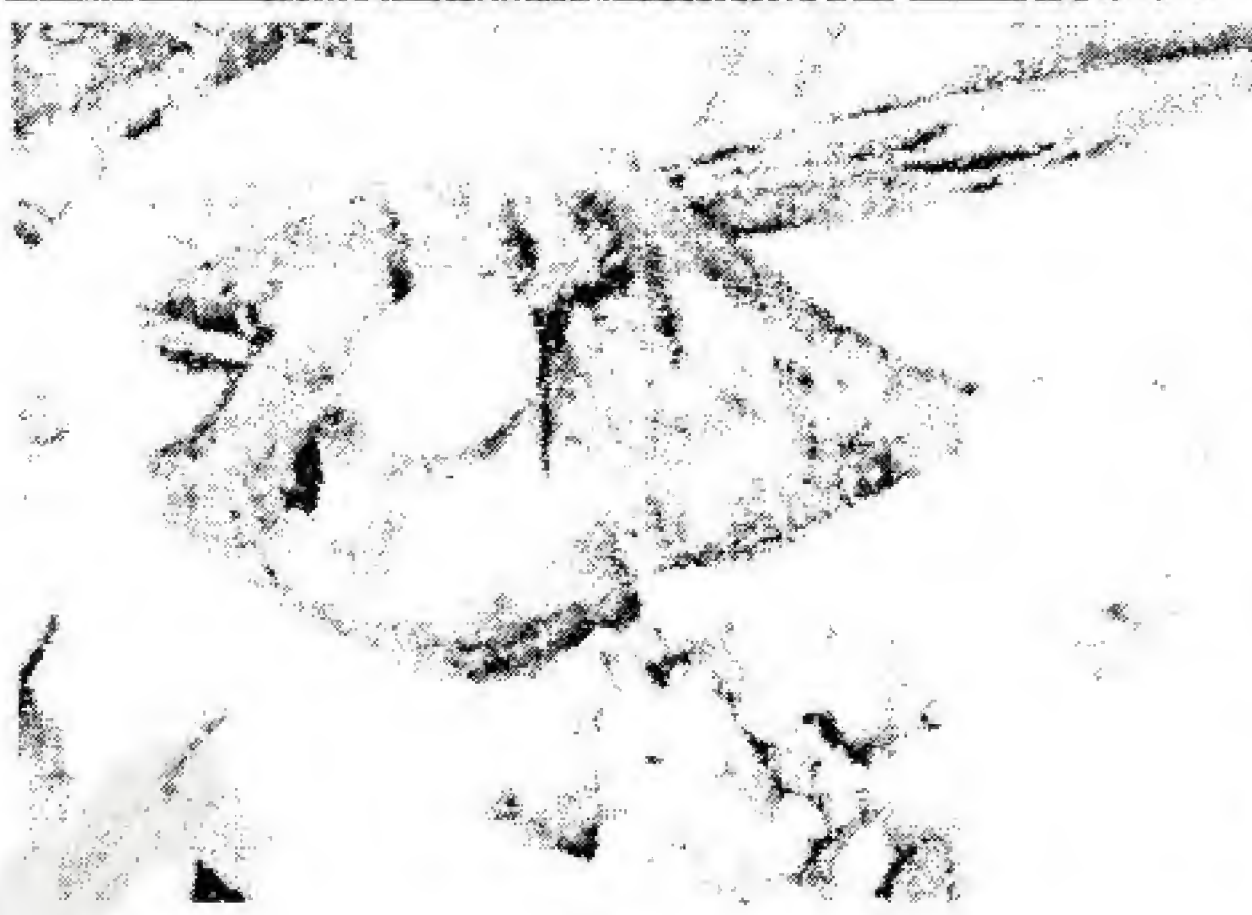
”ویانا یونیورسٹی“ کے مطالعاتی جائزہ سے پتا چلا ہے کہ مرد اور عورت ذہنی دباؤ کی حالت میں مختلف برتاؤ کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ماہرین کہتے ہیں کہ ذہنی دباؤ کی حالت عورت خود کو اپنی سہیلیوں سے زیادہ قریب کر دیتی ہے جبکہ اس کے برعکس مرد دباؤ کی حالت میں خود کو اپنی ذات تک محدود کر لیتا ہے۔ مرد اس موقع پر زیادہ انا پرست بن جاتا ہے لیکن دوسری جانب عورت میں

دوسروں کے نقطہ نظر کو سمجھنے کی صلاحیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ماہر نفسیات کلاز لام کے مطابق لوگوں میں دباؤ سے نمٹنے کی حکمت عملی کے طور پر دو بنیادی رویے ظاہر ہوتے ہیں جس میں یا تو وہ خود کو اپنی ذات تک محدود کر لیتے ہیں یا متبادل کے طور پر زیادہ کھلے دل سے دوسروں کے ساتھ میل جول بڑھانا شروع کر دیتے ہیں۔ محققین نے بتایا کہ نتائج سے یہ واضح ہو گیا کہ دباؤ کی حالت میں عورتوں میں پرسکون نظر آنے والے اپنے ہم منصب مردوں کی بہ نسبت دوسروں کے نقطہ نظر کی تفہیم زیادہ بہتر تھی۔ البتہ مردوں پر اس کیفیت کا مخالف اثر ہوا تھا جو ان میں دوسروں کے احساسات کو سمجھنے کی صلاحیت کو کمزور بنا رہی تھی۔

خواتین قوت سماعت کی حفاظت کے لیے مچھلی کھائیں: تحقیق

طبی ماہرین نے قوت سماعت کی حفاظت کے لیے ایک آسان نسخہ تجویز کیا ہے کہ خواتین کو بڑھاپے میں قوت سماعت کے نقصان کے خطرے کو کم کرنے کے لیے مچھلی کھانی چاہیے۔ محققین کا کہنا ہے کہ ہفتے میں کم از کم دو بار مچھلی کھانا اس دائمی مرض کی روک تھام یا اس میں تاخیر کا سبب بن سکتا ہے۔ ہارورڈ میڈیکل اسکول سے منسلک محققین کے مطابق انھوں نے ایک ایسا مضبوط کنکشن دریافت کیا ہے جس سے مچھلی اور اس کے تیل میں موجود اومیگا 3 فٹی ایسڈ کھانے اور قوت سماعت کو نقصان پہنچنے کے امکان میں کمی کے درمیان تعلق ظاہر ہوا ہے۔

محققین نے تجربے میں 65 برس کی خواتین کو شامل کیا جن کی 1991ء سے 2009ء تک ماہرین نے نگرانی کی۔ اس دوران 11,000 خواتین سماعت کے کسی نہ کسی مسئلے سے دوچار ہوئیں۔ ہفتے میں دو یا زائد بار مچھلی کا استعمال کرنے والی خواتین میں سماعت کے نقصان کا خطرہ 20 فی صد کم رہا۔ بہ نسبت ایسی خواتین کے جو کبھی



بفتوں، مہینوں یا پھر برسوں میں پھٹلی کا استعمال کرتی تھیں۔ امریکن برقی آف کلیننگل نیوزیشن میں شائع ہونے والی تحقیق میں بتایا گیا ہے کہ قوت سماعت کے نقصان کے خطرے کو کم کرنے کے لیے کسی بھی قسم کی پھٹلی کھانا مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر گرہر کے بقول، ”پھٹلی سماعت کی صحت کے لیے بہت فائدہ مند ہے اور سماعت پر کیے براہ

راست اثر انداز ہوتی ہے؟ اس قدرتی طریقہ کار کے بارے میں ہم لاعلم ہیں۔ لیکن انھوں نے خیال ظاہر کیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس کا تعلق کان کے اندر خون کے بہاؤ سے ہو جسے توانائی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے اور پھٹلی اور اس کے تیل میں موجود اومیگا تھری فیٹی ایسڈ خون کے بہاؤ میں مددگار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر گرہر بن کے مطابق یہ مطالعہ خواتین کی صحت کے لیے فوراً۔ میں پھٹلی کے فوائد کی ایک تازہ ترین مثال ہے۔ اس سے قبل کئی تحقیقات میں ظاہر ہوا ہے کہ پھٹلی میں موجود میوان پروٹین اور اومیگا تھری فیٹی ایسڈ کے استعمال سے دل کے امراض اور الزائمر کا خطرہ کم کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح حاملہ ماؤں کو ضروری غذائی اجزاء فراہم کرنے کا اہم ذریعہ ہے۔

خواتین صرف تعاون نہیں مقابلہ بھی پسند کرتی ہیں: تحقیق

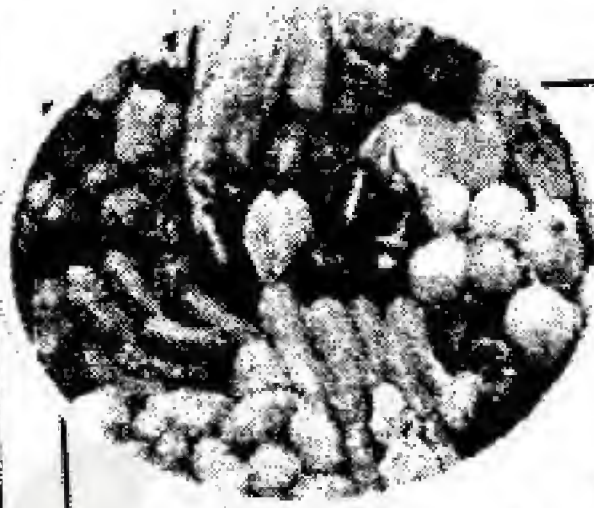
انسانی معاشرے میں ایک تصور عام ہے کہ مرد، عورت کے مقابلے میں اپنے گرد و پیش سے زیادہ آگے رکھتا ہے اور اسی لیے وہ مسابقت میں زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس عورتیں مقابلے سے گھبراتی ہیں اور انھیں تعاون کرنے میں زیادہ بہتر تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن ایک حالیہ تحقیق سے وابستہ سائنس دانوں نے اس تصور کی نفی کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کے مطالعے میں اگرچہ یہ خیال درست ثابت ہوا ہے کہ مرد مقابلے کو زیادہ پسند کرتے ہیں اور اس سے پورے طور پر لطف اندوز ہوتے ہیں، لیکن دوسری جانب یہ تاثر بھی غلط ثابت ہوا ہے کہ عورتیں مقابلے سے زیادہ تعاون کو پسند کرتی ہیں۔ فن لینڈ کی ’اٹو یونیورسٹی‘ سے منسلک تحقیق کاروں کی ٹیم نے مسابقت اور تعاون کے ساتھ کھیلنے کے لیے جس قسم کا جسمانی رد عمل ظاہر ہوتا ہے، اس کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔

نتیجہ سے پتا چلا کہ مردوں نے تعاون سے زیادہ مقابلے کو انجوائے کیا جبکہ عورتیں یکساں طور پر مقابلے اور تعاون، دونوں سے ہی لطف اندوز ہوئیں۔ ڈاکٹر میٹھیاز نے کہا کہ کھیل کے دوران نہ تو مردوں نے اور نہ ہی عورتوں نے منفی جذبات کے حوالے سے کوئی واضح فرق محسوس کیا، جس سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ مسابقتی رویے کی حوصلہ افزائی میں صرف مثبت جذبات کردار ادا کرتے ہیں۔ تحقیق کاروں کا کہنا ہے کہ نتائج سے واضح ہوتا ہے کہ کھیل کے دوران عورتیں مقابلے کے برعکس تعاون حاصل کرنے پر زیادہ لطف اندوز نہیں ہو رہی تھیں۔ محققین کے مطابق یہ ہو سکتا ہے کہ مردوں کے حوالے سے پایا جانے والا یہ تصور کہ وہ تعاون کے بجائے مقابلے کو زیادہ پسند کرتے ہیں، قدرتی اختلافات کے بجائے مصنوعی توقعات کا نتیجہ ہو۔



سیارہ بچن کارنر

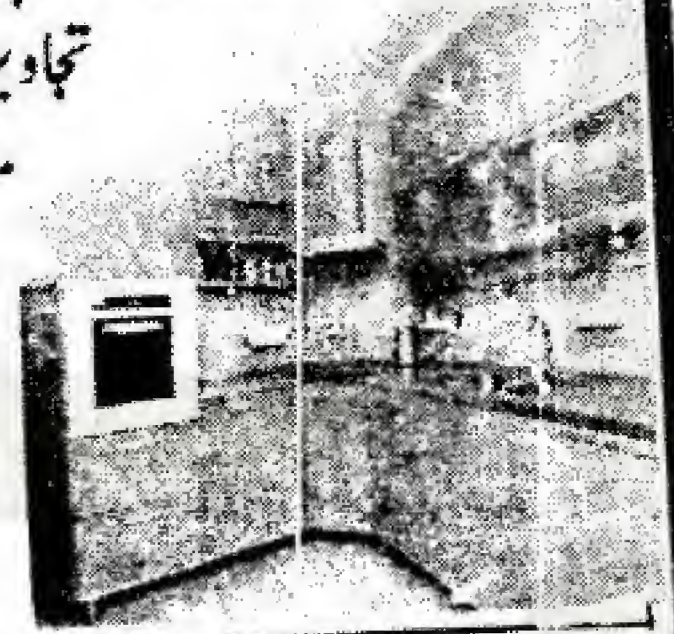
جویریہ کامران



خواتین قارئین کی دلچسپی اور پسند کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم نے کھانوں کی تراکیب پر مبنی خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس میں آسان مگر معیاری اور نئی تراکیب پیش کی جائیں گی۔ ان تراکیب پر عمل کر کے نہ صرف آپ اپنے گھر والوں کو نت نئے ذائقہ دار کھانے فراہم کر سکتی ہیں بلکہ روایتی ڈشز پکانے کی بوریت سے بھی نجات حاصل کر سکتی ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ آپ کو بہترین تراکیب فراہم کر سکیں۔ اس سلسلے میں آپ ہمیں اپنی تجاویز اور آراء سے آگاہ کرتے رہیے۔ نیز آپ ہمیں خود بھی نئی اور معیاری تراکیب لکھ کر بھیج سکتی ہیں جنہیں آپ کے نام کے ساتھ شائع کیا جائے گا اور بہترین ترکیب پر اعزازی شمارہ بھی آپ کو ارسال کیا جائے گا!

email: sayyaradigest@gmail.com

www.facebook.com/sayyaradigest



شاہن کوفتے

اجزاء:

مشینی قیمہ

پیاز

چنے کی کھیلیں

نمک مرچ

کھی

لہسن اورک

ٹماٹر

زیرہ

انڈے

ترکیب:

آدھا کلو

دو عدد

تھوڑی سی

حسب ذائقہ

حسب ضرورت

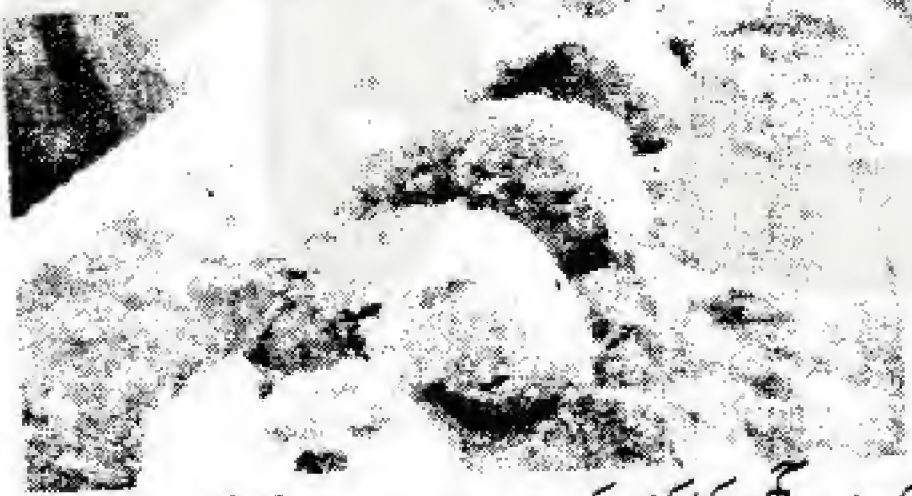
دو چمچ پیاز ہوا

ایک عدد

دو چمچ

چھ عدد

پسے ہوئے ہوں) پھر قیمہ کو انڈوں کے گرد لپیٹیں اور کوفتے بنائے انڈوں کے گرد قیمہ لپیٹنے سے قبل اس میں چنے کی کھیلوں کا چورا بھی ملا دیں۔ کوفتے بنانے

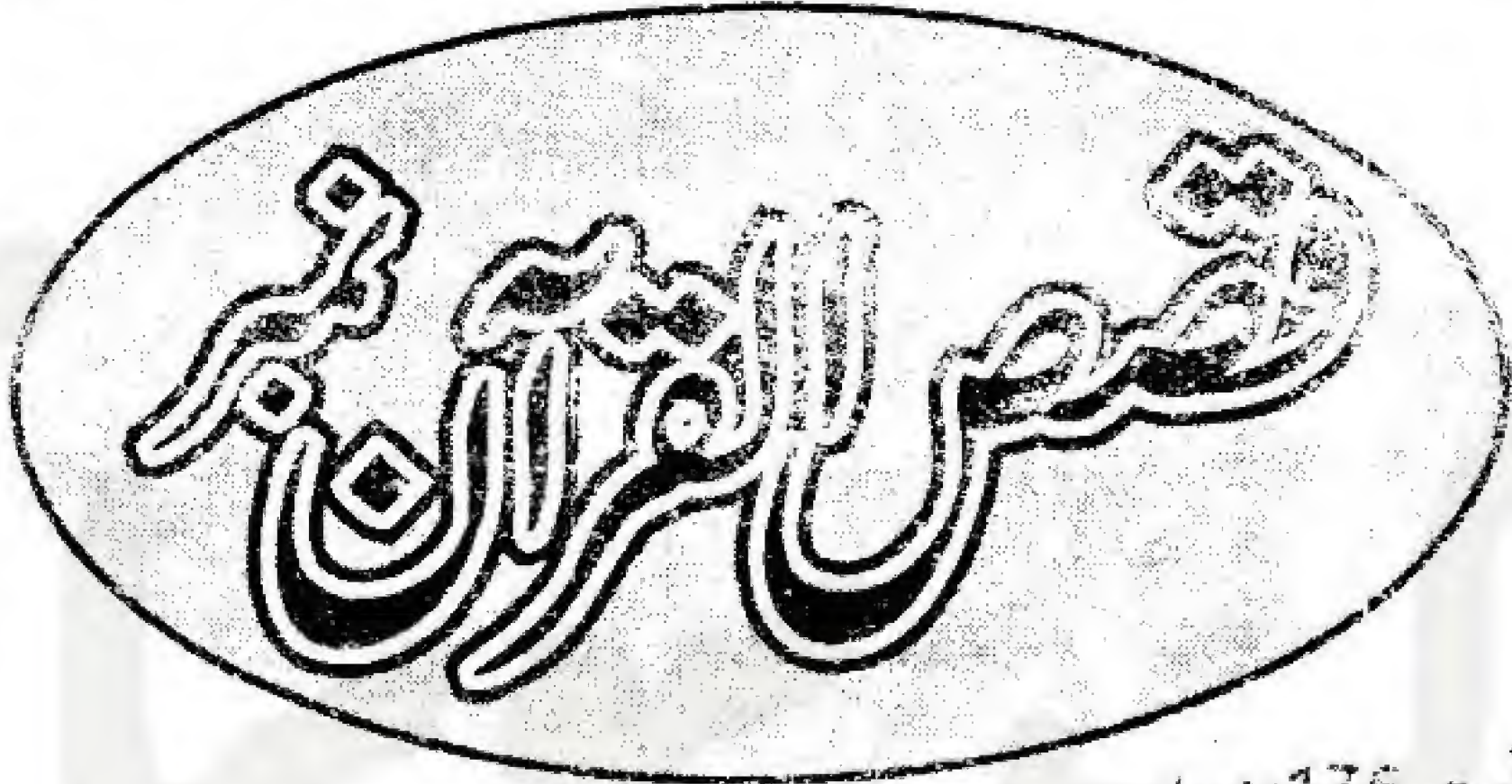


کے بعد کھی کرکڑا کر اور انڈا پھینٹ کر کوفتے اس میں بھگو بھگو کر تل لیں پھر پیاز کھی میں ہلکا براؤن کر لیں اور مصالحہ بھونیں اس میں سوکھا دھنیا اور زیرہ ڈال دیں اور پھر ٹماٹر بھی ڈال دیں اور خوب بھونیں۔ سب کچھ یکجان ہونے کے بعد اس میں تھوڑا سا پانی ڈال دیں اور گریوی اپنی پسند کی رکھ کر

قیمہ باریک چس لیں اور اس میں گرم مصالحہ اور ہری مرچیں اور ہر ادھنیا مس کر لیں (سب مصالحہ

بشائع ہو گیا ہے

سیارہ ڈائجسٹ کے لازوال اسلامی نمبروں میں ایک اور اضافہ



قیمت 175 روپے

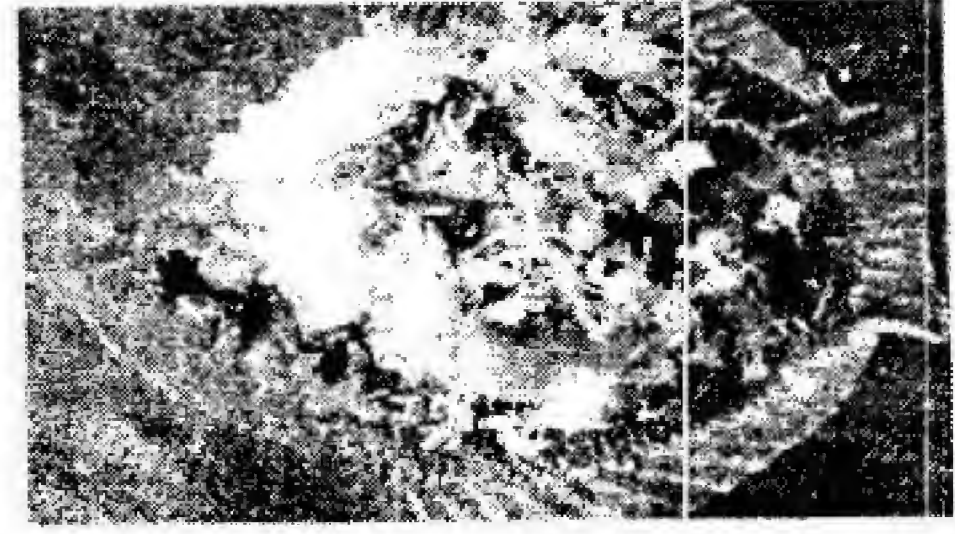
✽ ان تمام واقعات کا جدید علم و تحقیق کی روشنی میں تفصیلی ذکر جو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی اور اس کی امت کو بتانا ضروری سمجھے
✽ انبیائے کرام کی مقدس اور پاکیزہ زندگیوں سے وابستہ واقعات
✽ قصے ان قوموں کے جن پر انبیائے کرام کی نافرمانی، اللہ تعالیٰ کے احکامات سے روگردانی اور سرکشی کے باعث عذاب الہی نازل ہوا

عمدہ ترتیب، دلچسپ انداز بیاں اور پرکشش رنگین ٹائٹل
500 صفحات پر مشتمل یہ عظیم الشان نمبر جلد پیش کیا جائے گا

سیارہ ڈائجسٹ: 240 مین مارکیٹ ریواڑ گاڑڈن لاہور۔ فون: 245412 37

گرم مصالحہ اور کٹا ہوا دھنیا ڈال دیں پھر اس میں کوفتے ڈال دیں شاہی کوفتے تیار ہیں۔

زردہ



اجزاء:

ایک کلو	چاول
ڈیڑھ کلو	چینی
ڈیڑھ پاؤ	گھی
ایک چھٹانک	بادام
ایک چھٹانک	پستے
ایک چھٹانک	شمش
چار عدد	الانچی

ترکیب:

چاول کو اُبلنے کیلئے چولہے پر چڑھا دیں اور اس میں تھوڑا سا زردارنگ ڈال دیں جب چاول ایک کئی رہ جائے تو اس کا پانی نیتھار کر دم دے دیجئے پھر ڈیڑھ کلو چینی میں ایک پاؤ پانی ڈال کر چاشنی تیار کر لیں گھی میں بادام پستے، الانچی اور شمش ڈال کر سرخ کر لیں اور اس میں تیار کی ہوئی چاشنی ڈال دیں اور اسے اُبلے ہوئے چاولوں میں ڈال کر چولہے پر رکھ دیں اور چچہ چلاتی رہے یہاں تک کہ چاشنی خشک ہو جائے تھوڑی سی زعفران دودھ میں گھول کر دم کے ساتھ ڈال دیں اور اسے ہلکی آنچ پر چھوڑ دیں جب دم ہو جائے تو چولہے سے اُتار لیں زردہ تیار ہے۔

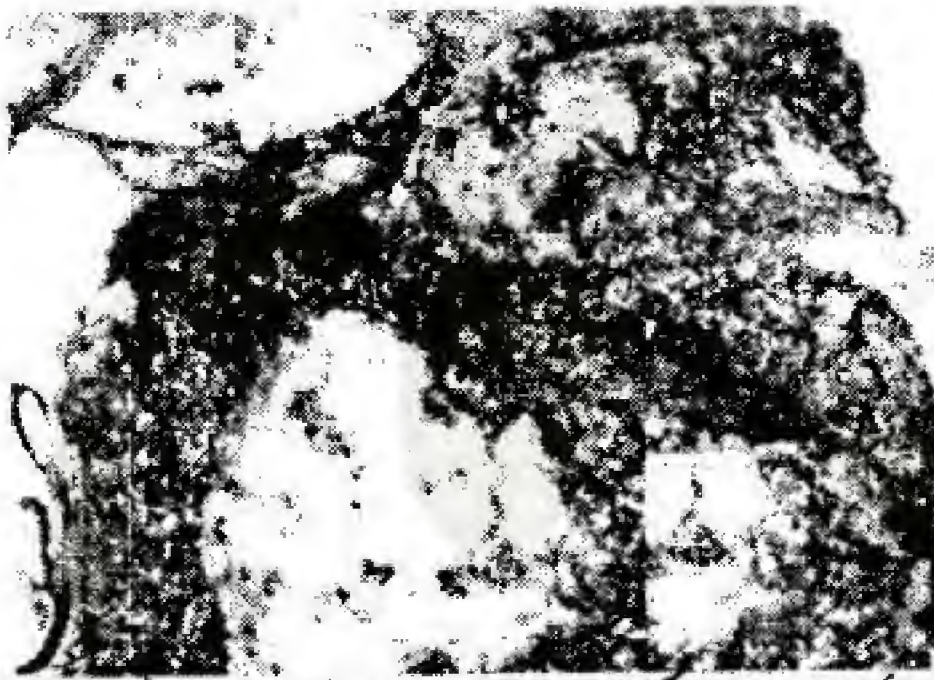
ہرا مصالحہ چکن

اجزاء:

چکن (12 ٹکڑے) 1-1/2 کلو

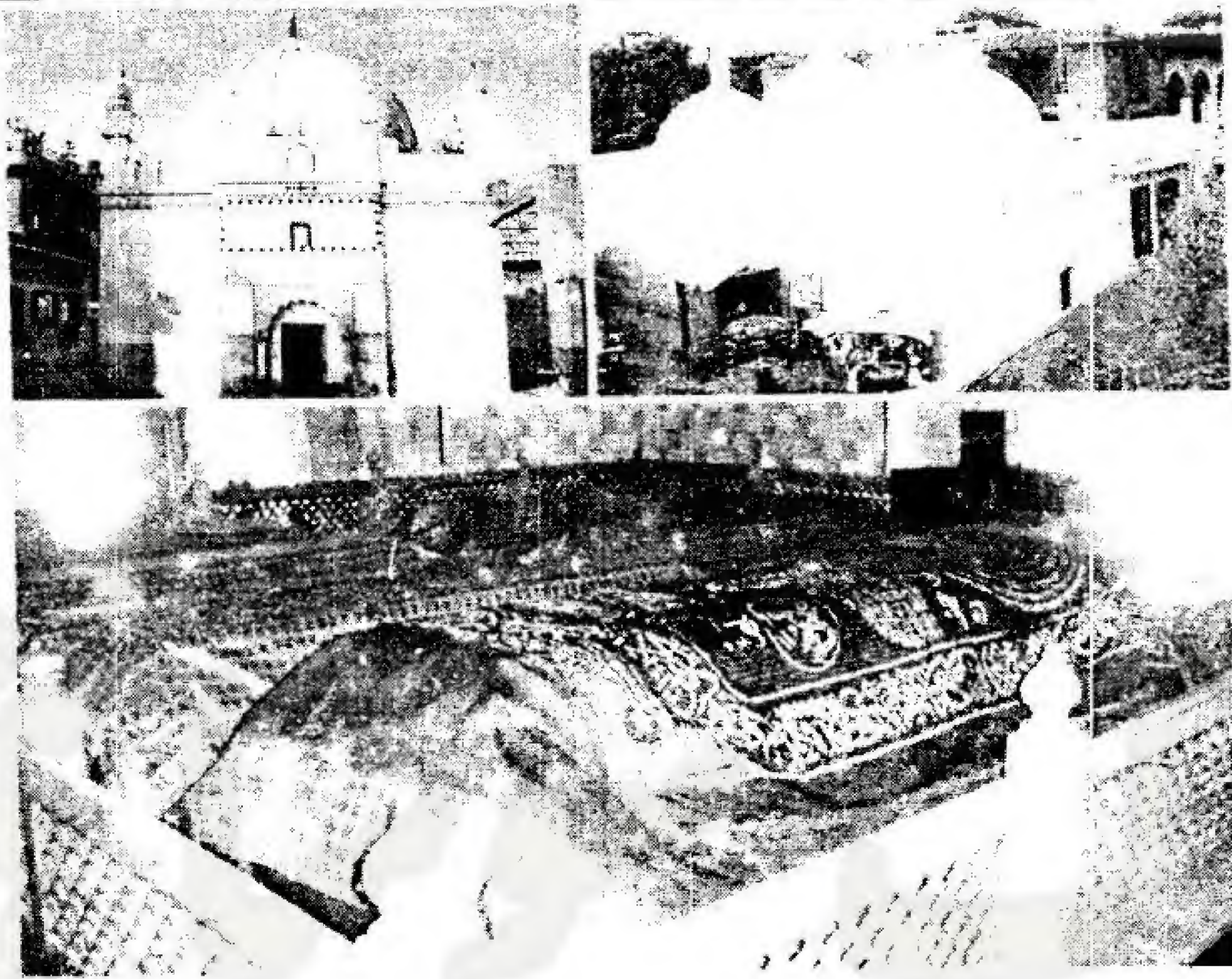
ہری مرچ	8 عدد
ہرا دھنیا	2 گٹھی
درمیانی پیاز باریک سلائس	2 عدد
ادرک لہسن کا پیسٹ	1 کھانے کا چمچ
کئی کالی مرچ	1 چائے کا چمچ
لیموں	3-4 عدد
دہی	1/2 عدد
تیل	1 کپ
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب: پہلے 1 کھانے کا چمچ ادرک لہسن کا پیسٹ اور حسب ذائقہ نمک کو 1/2 کپ دہی کے ساتھ بلینڈ کر لیں۔ اب 1-1/2 کلو چکن کو ایک پین میں ڈالیں اور اوپر سے اس پر دہی ڈال کر مکس کریں اور بغیر ڈھکے پکائیں، یہاں تک کہ پانی خشک ہو جائے۔ پھر دوسری پین میں تیل گرم کر کے اس میں 2 عدد درمیانی پیاز کے سلائسز کو ہلکا سا براؤن کر لیں، اب پیراز نکال کر الگ رکھیں یہاں تک کہ وہ خستہ ہو جائے۔ پھر اسے پین میں تیار چینی ڈال کر



پکائیں۔ اب چکن کو الگ سے فرائی کر کے چینی میں شامل کریں۔ پھر اس میں 1 چائے کا چمچ کئی کالی مرچ، فرائی کی ہوئی پیاز اور تین چار لیموں کا رس ڈال کر ہلکی آنچ پر تھوڑی دیر پکنے کیلئے چھوڑ دیں۔ آخر میں سادے چاول یا پرائیڈوں کیساتھ سرو کریں۔





پروفیسر غلام رسال

حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ

اللہ کے کامل ولی کی زندگی کے ایمان افروز واقعات جو ہمارے لیے مشعل راہ ہیں

لوگ حیرت سے اُسے دیکھتے پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ جاتے۔ انہی راہ گیروں میں اُس نوجوان کا ایک پرانا استاد شیخ فتح اللہ بھی تھے۔ انہوں نے جب اپنے لائق اور ہونہار شاگرد کو اس حال میں دیکھا تو حیرت میں پڑ گئے کہ آیا یہ واقعی انہی کا شاگرد ہے۔

حلیہ سے وہ نوجوان دیوانہ سا دکھائی دیتا تھا۔ پکھرے بال گردوغبار سے اٹا وحشت زدہ چہرہ لیے دیوانہ وار مستانہ نعرے بلند کرتا چلا جا رہا تھا۔ جسم پر پہنا ہوا خرقہ یوں جھول رہا تھا جیسے کسی مداری نے اُدٹ پٹانگ سا لباس پہن رکھا ہو۔ سبھی راہ چلتے

وہ ذہین شاگرد جس کی ذہانت اور علم دوستی کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ جو اپنی ابتدائی عمر میں ہی قابل تعریف کتب کا منصف بن چکا تھا۔ جس کی صرف کے موضوع پر لکھی کتابوں کو وقت کے کامل فن اساتذہ نے یہ کہہ کر سراہا تھا کہ ”علم میں یہی ایک کتاب کافی ہے۔“ چنانچہ اُس نوجوان کو اس دیوانگی سے عالم میں دیکھ کر استاد جتنی بھی حیرت محسوس کرتا کم تھی۔ اس کے بڑھ کر انہوں نے اپنے شاگرد کو جاکھڑا اور حیرت زدہ کرتے ہوئے کہا ”یہ کیا مداریوں کی سی حالت بنا رہی ہے؟“ نوجوان نے جو استاد کو دیکھا تو آنکھوں میں لمحہ بھر کو آشنائی کی چمک پیدا ہوئی جو اگلے ہی لمحے ماند پڑ گئی پھر بے رخی سے جواب دیا ”میں مداریوں میں سے نہیں ہوں“ استاد نے اس کا ٹوٹا لیے بغیر تاسف بھرے انداز میں کہا ”افسوس! ہم تو تمہاری قابلیت اور طباعی کی تعریفیں کرتے نہ تھکتے تھے اور تم ہو کہ ہمیں جھٹلانے کے درپے ہو۔ دیوانوں کا بھیس بدلے ہمیں جھوٹا ثابت کرتے پھر رہے ہو، کچھ پڑھ بھی رہے ہو یا یونہی دیوانگی میں دن گزار رہے ہو؟“ نوجوان شاگرد نے لہرا کر جواب دیا ”پڑھ رہا ہوں..... پڑھ رہا ہوں..... میں حیرانی کی کتاب پڑھ رہا ہوں“ یہ کہہ کر دیوانہ وار ایک طرف کو دوڑ لگا دی اور چند لمحوں بعد نظروں سے اوجھل ہو گیا اور شیخ فتح اللہ اپنے شاگرد کی حالت پر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

یہ نوجوان جس کی اس کے استاد بے پناہ عزت کرتے اور اس کی قابلیت کی مثالیں پیش کرتے تھے۔ تاریخ میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے نام سے مشہور ہو۔ 860 ہجری میں روولی کے ایک مشہور عالم شیخ اسماعیل کے ہاں پیدا ہوئے۔ باپ نے بیٹے میں ٹھہری فطری و پیدائشی خوبیاں پہچان

لیں۔ سو دوسری اولاد سے بڑھ کر چاہا اور تعلیم و تربیت کا خاص انتظام کیا اور بیٹے نے بھی ثابت کر دیا کہ باپ کی نظر نے دھوکہ نہیں کھایا تھا۔ باپ کی اس توجہ کو عبدالقدوس نے رایگاں نہ جانے دیا اور ہونہار اولاد کی طرف باپ کے اندازوں اور خواہشات کی تکمیل کی خاطر طالب علمی کے زمانہ میں ہر لمحہ مطالعہ میں صرف کیا، کتابوں سے عشق پیدا کیا۔ رات کو عبادت کی خاطر چمکتے۔ ان بھر علوم ظاہری حاصل کرتے اور رات خالق حقیقی وحدہ ولا شریک کے آگے سجدے میں گرے اُس کی ثناء پڑھتے علم و ادب کے دائرے میں پروان چڑھتے پھلتے پھولتے رہے۔ شیخ اسماعیل نے بھی بیٹے کی اس عبادت اور علمی جدوجہد کو مسرت و رشک سے دیکھا۔ بیٹے کو دیکھتے تو آنکھیں منور ہو جاتیں۔

یہ سلسلہ شفی بخش طور پر جاری تھا کہ ایک دن اچانک عبدالقدوس کے سینے میں ٹہانے کیسی آگ بھڑکی کہ جذب کی غیر معمولی کیفیت طاری ہو گئی۔ وجد کے عالم میں کپڑے پھاڑے اور دیوانہ وار نعرے بلند کرتے باہر نکل آئے۔

ماں کو جب بیٹے کی حالت کا علم ہوا تو صدمے سے غدھاں ہو گئیں۔ شوہر فوت ہو چکا تھا اور بیٹے نے دیوانہ بن کر بیوگی کا صدمہ پھر سے تازہ کر دیا تھا۔ وہ روتی ہوئی اپنے بھائی قاضی دانیال کے پاس گئیں اور بیٹے کی حالت کا ذکر رو کر بیان کیا۔ قاضی دانیال بھی بھانجے کا حال سن کر آبدیدہ ہو گئے۔ شہر کے حاکم تھے فوراً کارندوں کو بھیج کر بھانجے کو بلایا۔ قریب بٹھا کر نرمی سے پوچھا ”قدوس یہ کیا حالت بنا رکھی ہے رے۔ ماں کو کیوں تنگ کرتا ہے اور یہ تعلیم کیوں چھوڑ دی۔ یاد رکھو اگر یہی حال بنائے رکھا تو ہم تجھے سخت سزا دیں گے۔“

قدوس نے یہ سن کر چلا چلا کر کہنا شروع کر دیا

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور عظیم پیش کش

عباداتِ رمضان المبارک

شائع ہو گیا ہے

قیمت 175 روپے



رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جس نے رمضان المبارک کے آنے کی خوشی منائی اللہ تعالیٰ اسے ایک سال تک خوشیاں عطا فرماتا ہے اور جس نے رمضان المبارک کے جانے کا غم منایا اس سے ایک سال غم دور ہٹا دیتا ہے۔

- رمضان کیا ہے۔
- رمضان اور روزہ
- رمضان اور قرآن
- رمضان اور شبِ قدر
- رمضان اور اعتکاف
- رمضان اور تراویح
- رمضان کی عبادات
- وظائف اور دعائیں
- رمضان اور نوافل
- رمضان کی عبادات کا اثر تمام سال کیسے رہتا ہے۔
- رمضان میں عورتوں کے مسائل اور ذمہ داریاں
- ایک مکمل اور جامع گائیڈ۔ گھر کے ہر فرد کیلئے۔ آپ کے دوست احباب کیلئے رمضان کا بہترین تحفہ!
- اپنے آرڈر سے جلد مطلع فرمائیں۔
- خود پڑھیں اور دوسروں کو پڑھائیں

سیارہ ڈائجسٹ۔ 240 مین مارکیٹ، ریواز گارڈن لاہور۔ فون: 37245412

”ہم سزائیں گے، ہمیں سزا دو سخت سزا دو“ اس اثناء میں کہیں سے گیت کی آواز آئی۔ گانے کا عبدالقدوس کے کانوں میں پڑنا تھا کہ وجد میں آگئے حالت غیر ہو گئی۔ ماموں نے جو بھانجے کا یہ حال دیکھا تو دکھ سے بہن سے کہا ”بہن! پریشان نہ ہو، اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ آبادیاں اس کے لیے زنجیر بن گئی ہیں۔ یہ قیاس بن چکا ہے۔ صحرائی اس کے مرض کا واحد علاج ہے، کچھ نہ کہو اسے۔“

عبدالقدوس کو اب بالکل کھلی چھٹی مل چکی تھی۔ سارا وقت مجذوبوں اور قلندروں کی صحبت میں رہتے مگر کسی پل قرار نہ تھا۔ سینے میں آگ مٹ کر کی تو بجھنے کا کسی طور پر نام نہ لے رہی تھی۔ ہر پل بے چین ہر لمحہ بے قرار عشق دیوانہ وار سفر کرتا رہا۔ بے خود سے ہو کر کبھی کہاں نکل جاتے کبھی کدھر کا رخ کرتے۔ ایک دن اسی بے خودی و بے قراری میں دیوانہ وار کہیں بھاگے جا رہے تھے کہ ایک شخص نے آپ کی راہ روک لی اور پوچھا ”شیخ..... یہ راستہ تو رودلی سے باہر کی طرف جاتا ہے کدھر کا ارادہ ہے؟“

قدوس نے جوش میں اسے سامنے سے ہٹا کر کہا ”ہٹ جا ہمارے راستے سے..... ہم خدا کے شہر جا رہے ہیں.....“ ”اچھا!“ وہ شخص آپ کی بات سن کر مسکرا پڑا اور کہا ”شیخ خدا کے شہر جاتا ہے تو شیخ احمد عبدالحق کی درگاہ سے جا۔“

شیخ عبدالحق چشتی سلسلے کے مشہور بزرگ تھے۔ اُن کی درگاہ رودلی میں ہی تھی۔ جہاں اُن دنوں اُن کا پوتا شیخ محمد سجادہ نشین تھا۔

راہ گیر کی بات نے عبدالقدوس پر اس قدر اثر کیا کہ یک بیک دوبارہ رودلی کی طرف پلٹے اور دیوانہ وار درگاہ کی طرف دوڑنے لگے اور درگاہ کے در پر پہنچ کر ہی دم لیا۔ شیخ عبدالحق کی خانقاہ میں داخل ہوتے ہی اُن کی حالت میں تغیر سا رونما ہوا۔

طبیعت میں رہی بے قراری کسی حد تک زائل ہونے لگی۔ چنانچہ اب آپ کا بیشتر وقت درگاہ میں ہی گزر نے لگا۔ شیخ عبدالحق کی روح سے فیوض حاصل کرنے لگے جس نے آپ کے وجود میں پھیلی بے چینی و بے قراری ختم کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا چنانچہ اب زیادہ تر درگاہ میں بیٹھے عبادت کرتے رہتے۔ کبھی دل کی تپش بڑھنے لگتی تو ویرانوں میں نکل جاتے۔ آبادیوں سے دور سنسان وادیوں میں جاتے اور عبادت کرتے۔ مختلف بزرگان دین کے مقبروں پر حاضری دیتے اور جب بے خودی طاری ہوتی اور تہجد کا وقت قریب آ جاتا تو شیخ عبدالحق ”حق حق..... حق حق حق“ کی صدا بلند کرتے تو غفلت سے بیدار ہوتے اور عبادت میں مشغول ہو جاتے۔

شیخ عبدالحق کی درگاہ کے سجادہ نشین شیخ محمد جوان تھے اور قدوس کے ہم عمر بھی۔ سو شیخ عبدالقدوس کو آپ سے محبت تو تھی لیکن وہ عقیدت نہ تھی جو کسی مرید کو مرشد سے ہوتی ہے کیونکہ شیخ قدوس فیض یاب تو براہ راست شیخ عبدالحق سے ہی ہو رہے تھے۔ اس لیے اب بیعت کے معاملے میں تامل سے کام لے رہے تھے۔ وہ شیخ محمد کے ہاتھوں جب بھی بیعت کا سوچتے دل مطمئن نہ ہوتا۔ پھر مصیبت یہ تھی کہ جب دل میں کسی اور کے ہاتھ بیعت کرنے کا خیال جڑ پکڑتا اور وہ درگاہ سے نکلنے لگتے تو شیخ عبدالحق راہ روک کر پوچھتے ”قدوس!..... تو کدھر چلا..... تو ہمارا ہے..... ہمیں چھوڑ کر کہاں جاتا ہے۔“

جب بار بار یہ صورتحال پیدا ہوئی تو ایک دن حضرت قدوس جھنجھلا کر تڑپ کر بولے ”حضرت اگر میں کسی اور کے ہاتھوں بیعت کروں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ مجھے آپ سے چھین لے گا۔ میں آپ کا ہوں آپ کا رہوں گا۔“

آپ کی بات سن کر شیخ عبدالحق نے جواب دیا

یہ سن کر شیخ عبدالقدوسؒ کی حالت غیر ہو گئی اور لرزہ اندام ہو کے آپؒ کے قدموں میں گر گئے۔ شیخ عبدالحقؒ نے نرمی اور شفقت سے آپؒ کو اٹھایا اور کہا ”قدوس..... آج سے ہم نے تجھے اللہ تک پہنچایا۔“

اس واقعہ کے بعد نہ صرف رودلی بلکہ آس پاس کی تمام آبادیوں میں حضرت شیخ عبدالقدوسؒ کا شہرہ عام ہو گیا۔ لوگ حیرت اور تجسس کے مارے آپؒ کو دیکھنے آتے۔ لوگوں میں مشہور تھا کہ حضرت شیخ الحقؒ کے مزار پر ایک درویش رہتا ہے۔ اُس کے گلے میں ایک گدڑی لٹکی رہتی ہے جو پیوندوں سے تیار کی گئی ہے۔ وہ درویش پیوند لگانے کے لیے گلی کوچوں میں گھومتا ہے۔ دھجیاں اکٹھی کر کے انہیں پاک کرتا ہے اور پھر انہی دھجیوں کو ٹوپی اور گدڑی میں ٹانگ دیتا ہے۔

شیخ عبدالقدوسؒ خدا کی عبادت میں مسلسل مصروف رہتے لیکن اس کے باوجود وقت نکال کر عبادت کے ساتھ ساتھ اساتذہ و شیوخ کی خدمت بھی انتہائی عقیدت احترام سے کرتے۔ دن کا اکثر وقت پانی لانے، لکڑیاں کاٹنے، جھاڑو دینے اور کپڑے دھونے میں گزر جاتا۔ چٹائی کے لیے گارا بناتے تو اس حد تک اپنے کام میں محو ہو جاتے کہ کسی بات کا ہوش نہ رہتا۔ ایسے میں اساتذہ اپنے اس سعادت مند شاگرد کو خود اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلا دیتے۔

حضرت شیخ محمدؒ کی بڑی بہن ایک عابدہ اور صالح خاتون تھیں۔ قسمت کی ستم ظریفی سے ایک ایسے شخص سے بیابانی گئی جو ہرگز آپؒ کے قابل نہ تھا۔ جتنی آپؒ نیک، پاکباز اور عبادت گزار تھیں۔ اتنا ہی وہ شخص کمینہ خصلت اور بد اعمال تھا۔ پتہ نہ اُن کی زندگی جہنم کا نمونہ بنی ہوئی تھی۔ حضرت شیخ محمدؒ اور ان کی والدہ اُم کلثوم بیٹی کی حالت دیکھتیں اور اُس کی ازدواجی زندگی کی اس ناموافقیت پر دُکھ سے

”قدوس..... دوسروں سے بیعت لے گا کیا ہم مُردہ ہیں؟“ یہ کہتے ہی انہوں نے خود کو قدوسؒ کے سامنے ظاہر کر دیا۔ حضرت قدوسؒ یہ دیکھ کر لرز گئے ”لیکن شیخ عبدالحقؒ اُن کی حالت سے بے نیاز اُن کا ہاتھ تھام کر اپنے پوتے شیخ محمدؒ کے پاس لے گئے اور اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اب کی مرتبہ آپؒ نے بھی عاجزانہ انداز میں شیخ محمدؒ کا ہاتھ تھام کر اُسے بوسہ دیا اور اکساری اندازی میں کہا ”شیخ! مجھے تھام لیجئے۔“

حضرت شیخ محمدؒ نے مرشد ہونے کے باوجود آپؒ سے مریدوں والا برتاؤ نہ کیا۔ بلکہ عزت و احترام سے پیش آتے اور ہم رتبہ رفیق کی طرح آپؒ کے ساتھ مل کر عبادت و ریاضت کرتے۔ شیخ قدوسؒ نے بھی اپنے مریدی کے اس ابتدائی دور میں سخت مجاہدے کیے۔ نفس کو مار پیٹ کی، طلب کو دھتکارا شیخ عبدالحقؒ کے مزار پر خود جھاڑو دیتے۔ پانی بھر کر لاتے اور جھاڑ پونج کرتے۔ قلبی حدت کو دور کرنے کے لیے راتوں کو ریاضتوں میں بسر کرتے اور دن رات عبادت میں مشغول رہتے۔

ایک دن جب حضرت عبدالقدوسؒ اور حضرت شیخ محمدؒ درگاہ میں بیٹھے وظائف میں مصروف تھے۔ درگاہ زائرین سے بھری تھی۔ ہر سو مقدس سی شخصک کا احساس ہوتا تھا اور وظائف کا غلغلہ ہر ”واز میں حاوی تھا۔“

ناگاہ شیخ عبدالحقؒ کا روضہ شق ہوا اور آپؒ ظاہری حالت میں مزار سے باہر نکلے۔ لوگ اس منظر کی تاب نہ لاسکے اور بے ہوش ہو کر گر پڑے شیخ قدوسؒ اور شیخ محمدؒ تعظیم سے کھڑے ہو گئے۔ حضرت عبدالحقؒ آگے بڑھ کر قدوسؒ کے پاس آن کھڑے ہوئے اور یہ شعر پڑھا۔

مرا زندہ پندار چوں خویشتن
من آیم بجاں گر تو آئی بہ تن

دل میں شادی کی خواہش پیدا ہو گئی۔ انہی دنوں وہ اپنے ایک مربی کے ساتھ رہتے تھے۔ یہ بات آپ نے اُن کے سامنے کہی تو وہ بھی خوش ہو گئے اور کہنے لگے ”حضرت..... اگر اجازت ہو تو میں آج ہی آپ کی طرف سے شادی کا پیغام لے کر حضرت شیخ محمد کے گھر جاتا ہوں۔ اس امید کے ساتھ کہ اللہ مجھے ان کے در سے ناکام نہیں لوٹائے گا۔“

حضرت عبدالقدوسؒ نے ہنس کر انہیں اپنی رضامندی کا اشارہ دے دیا۔

اس واقعہ سے چند دن قبل ایک رات اُم کلثوم نے رات خواب میں دیکھا کہ اُن کے بیٹے شیخ محمدؒ کا مرید حضرت قدوسؒ وجد کی حالت میں سامع میں ہے اور اُن کا ایک پاؤں بھی ٹوٹا ہوا ہے اور ابھی وہ اس پر غور ہی کر رہی تھیں کہ شیخ عبدالحقؒ خواب میں ہی نمودار ہوئے اور کہا ”بھو! اس بچے کو اپنے سائے میں لے لو، یہ معصوم اور شریف اللہ کا اور میرا پیارا ہے اس کی پرورش دل و جان سے کرنا۔“

اگلی صبح اُم کلثوم بیدار ہوئیں تو انہیں رات کا خواب اچھی طرح ازبر تھا۔ مسرت سے اُن کا چہرہ کھلا جاتا تھا۔ کافی دنوں سے وہ چھوٹی بیٹی کی شادی کے سلسلے میں پریشان تھیں۔ بڑی صاحبزادی کا انجام دیکھ چکی تھیں اس لیے دودھ کا جلا ہونے کے سبب چھانچھ بھی پھونک کر پینا چاہتی تھیں۔ سو جب شیخ عبدالحقؒ نے انہیں چھوٹی پوتی کے لیے برکات عندیہ دیا تو خوش ہو گئیں۔ عبدالقدوسؒ کے پاؤں کا ٹوٹنا اس بات کی علامت تھا کہ آپ درویش کامل ہیں خدا کے سوا ہر چیز سے بے نیاز۔ صرف اللہ کے آگے دست سوال پھیلانے والے پرہیزگار متقی جن کا کام صرف اور صرف عبادت کرنا اور خدائے برحق و واحد کی حمد و ثناء میں زندگی بسر کرنا ہے اور عبدالحقؒ کا یہ کہنا کہ

کڑھتی رہتیں۔ اس تلخ تجربے کے بعد عہد کر چکی تھیں کہ چھوٹی بیٹی کو بیاہیں گی تو کسی نیک اعمال شخص کے ساتھ اور وہ بھی اُس شخص کے ساتھ جس کے متعلق شیخ عبدالحقؒ کی تائید ہو۔

انہی دنوں اُن کے گھر کی ایک کنیز حضرت عبدالقدوسؒ سے حضرت شیخ محمدؒ کے دھلے کپڑے لینے گئی تو حضرت قدوسؒ کو دیکھ کر شرارت بھرے لہجے میں بولی ”حضرت..... اب تو آپ جیسے جوان شادی کر کے باپ بنے پھرتے ہیں۔ آپ کا کیا ارادہ ہے۔ ساری عمر ایسے ہی گزار دیں گے یا کچھ کریں گے؟“

حضرت عبدالقدوسؒ کنیز کی بات سن کر مسکرا پڑے اور بولے ”بی بی! تم تو اچھی طرح مجھے جانتی ہو بھلا مجھے جیسے شب و روز گزارنے والے درویش کو اپنی بیٹی کون دیکا اور پھر میں خود اپنی اس آزاد زندگی کو کیوں کھودوں، اہل و عیال کے جھنجھٹ میں پڑ کر کیوں غلامی کی زنجیریں پہن لوں۔ بی بی! تم اپنا مشورہ اپنے پاس ہی رکھو۔ مجھے اپنی آزادی کی اس لذت سے محروم کرنے کا منصوبہ نہ بناؤ۔ میں تو عمر بھر مجرد رہنا چاہتا ہوں۔ اب تک ویرانوں اور جنگلوں میں زندگی گزاری ہے جو باقی بچی ہے خدا کی رضا سے وہ بھی گزر جائے گی اور ایک دن گناہی کے کسی گوشے میں کم ہو جاؤں گا۔“

لیکن کنیز بھلا کہاں چھوڑنے والی تھی۔ مفت مشورے دینا اُس کا دل پسند مشغلہ تھا۔ سو جاتے جاتے کہہ گئی ”حضرت، میں تو کہتی ہوں کہ آپ اپنے پیر شیخ محمدؒ کی چھوٹی بہن سے عقد کر لیں۔ ماشاء اللہ شادی کے قابل ہے۔ آپ کی اور اُس کی جوڑی بھی اچھی رہے گی۔“

یہ بات شیخ عبدالقدوسؒ کے دل کو لگی اور اُن کے

آپ کی یہ حالت دیکھ کر شادی میں آئی عورتیں تاسفانہ انداز میں اُم کلثوم سے بولیں ”بہن..... تجھے چھوٹی بیٹی کے لیے اور کوئی بر نہ ملا تھا جو اس دیوانے درویش کے ساتھ اُس کی قسمت پھوڑ ڈالی۔ ابھی تو بڑی بیٹی کا گھر بھی آباد نہ ہو سکا اور چھوٹی کو بھی اندھے کنوئیں میں دھکیل دیا۔“ اُم کلثوم نے سب کچھ خندہ پیشانی سے سنا اور اطمینان سے لبوں پر تبسم سجائے بولیں ہر کام اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے۔ اس کام میں اُسی کی رضا بھی سو ہو گیا۔“

حضرت عبدالقدوسؒ نے شادی تو کر لی مگر اپنے اندر تبدیلی نہ لاسکے۔ اب بھی وہی حال تھا اکیلے تھے تو کھانے پینے کا کبھی خیال نہ کیا بیوی پائی تب بھی یہی روش رکھی۔ فقر و غارتگی میں دن گزارتے۔ بیوی صابر تھی دو رو چار چار دن فاقوں میں گزار دیتی مگر اُف نہ کرتی۔ حضرت قدوسؒ زراعت کرتے تھے مگر جو پیداوار ہوتی وہ سب غریبوں میں بانٹ دیتے۔ آباؤ اجداد کی طرف سے اچھی خاصی جائیداد مل سکتی تھی مگر کبھی اس طرف دھیان نہ دیا۔ مصائب جھیلنے، تکالیف اٹھاتے اور خدا کی یاد میں مشغول رہتے۔ اللہ کے سوا ہر کسی سے ترک تعلق اختیار کر رکھا تھا۔ رشتہ دار تھے۔ آپس میں میل جول کی وجہ سے ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے چونکہ آپؒ نے کبھی اُن سے تعلق نہ رکھا تھا سو انہوں نے بھی آپؒ کو بھلا دیا۔ شادیاں ہوتیں یا کوئی اور تقریبات، تب ایسے موقعوں پر رشتہ دار ایک دوسرے کے گھر خوان بھیجتے اور آخر میں یاد آتا کہ شیخ قدوسؒ کا گھر تو رہ ہی گیا۔ مگر یہ خیال بھی آتا جب کچھ بھی باقی نہ بچا ہوتا لیکن شیخ عبدالقدوسؒ بے نیازی و بے گانگی سے زندگی بسر کرتے رہے صرف اللہ سے لو لگائے رہے۔

”بہو اسے اپنے سائے میں لے کر اچھی طرح پرورش کرتا“ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ انہیں داماد بنا لیں۔

جس دن۔۔۔ اُم کلثوم نے یہ خواب دیکھا تھا تب سے بے چین تھیں کہ آخر حضرت عبدالقدوسؒ سے بات کیسے کی جائے پھر ایک دن رب عظیم نے اُن کی یہ مشکل حل کر دی اور حضرت قدوسؒ کے مربی آپؒ کی طرف سے بیاہ کا پیام لے کر حضرت شیخ محمدؒ کے پاس آئے جو والدہ سے تمام واقعہ سن چکے تھے سو جھٹ پیغام منظر کر لیا گیا۔

شادی کی تاریخ طے کر دی گئی جو آہستہ آہستہ کر کے نزدیک آگئی۔ شہر میں مشہور ہو گیا کہ آج ایک دیوانے درویش کا بیاہ ہے۔ شادی والے دن بھی حضرت قدوسؒ نے اپنی مصروفیات نہ بدلیں بلکہ حسب معمول بھاڑو دینے اور پانی بھرنے میں مصروف رہے۔ رسومات کی ادائیگی کے لیے قریبی رشتے دار آپ کے پاس آئے اور نہلا دھلا کر نیا لباس پہنایا اور پھر بارات کی شکل میں یہ لوگ آپؒ کو حضرت شیخ محمدؒ کے گھر لے گئے۔ شہر کے لوگ بھی علاقے کے مشہور درویش کی شادی کی خبر سن کر جوق در جوق شیخ محمدؒ کے گھر پہنچنا شروع ہو گئے۔ نکاح پڑھایا گیا جلوے کا وقت آیا تو شادی میں آئی لڑکیوں نے ہندی میں یہ گیت چھیڑ دیا

کہو کہ کھول دینا شہ دیکھا لو ری
اس کھونٹ ری کارن شہ ہاتھ مرو ری
گیت سننا تھا کہ حضرت عبدالقدوسؒ پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی کچھ دیر کے لیے وہ بھول گئے کہ آج وہ کس روپ میں کس جگہ بیٹھے ہیں سو اسی بے خودی میں کھڑے ہو گئے اور وجد میں آ کر بیش قیمت نیا جوڑا پھاڑ ڈالا اور دیوانہ وار رقص کرنے لگے۔

سکندر لودھی کا زمانہ تھا۔ 897 ہجری کا دور شیخ حسام الدین ایک بزرگ کامل گزرے ہیں۔ ایک دن سکندر نے آپ سے کہا ”حضرت آپ کی خدمات دیکھتے ہوئے میں چاہتا ہوں کہ آپ کو کچھ نہ کچھ اس کا صلہ دیا جائے اور اب آپ ہی فرمائیے کہ آپ کو کس چیز کی آرزو ہے۔“

شیخ حسام الدین نے فرمایا ”میرے ذمے احتساب کا شعبہ دے دیں اور ساتھ کام کرنے کے لیے مختصر سی جماعت تاکہ میں دین میں منکرات و بدعات چھلانے والوں کا قلع قمع کر سکوں“ چنانچہ سکندر لودھی نے ان کی خواہش کے مطابق جو انہوں نے مانگا تھا، دے دیا۔ شیخ حسام الدین دربار سے رخصت ہو کر گجرات، دکن، مالوے کے دورے پر گئے۔ وہاں کے معاشرے کا جائزہ لیا اور اسلام میں جو بدعات پھیل چکی تھیں ان کو ختم کیا اور تمام علماء و شرفاء سے اقرار کروایا کہ آئندہ وہ اسلام میں کسی بدعت کو پروان نہ چڑھائیں گے۔ اور نہ خود اس میں اضافہ کریں گے۔

اس کامیاب اور تفصیلی دورے کے بعد جب دہلی دربار میں اس کی رپورٹ دی تو بادشاہ بھی آپ کی کارکردگی جان کر خوش ہوا اور کہا کہ وہ اپنا کام جاری رکھیں۔

دہلی میں کچھ عرصہ قیام کے بعد حضرت حسام الدین اپنے مشن کی تکمیل کی خاطر ملتان کے سفر پر روانہ ہوئے۔ وہاں آپ نے بے انتہا کام کیا اور دین میں داخل بدعات کا خاتمہ کرنے کے لیے دن رات کوشاں رہے۔ یہاں تک کہ کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد آپ نے پانی پت جانے کا ارادہ کیا۔ پانی پت پہنچ کر آپ کو حضرت عبدالقدوس کے بارے میں جانکاری حاصل ہوئی تو ساتھیوں سے کہا ”بھائیہ!... پہلے ہمیں کنگوہ چل کر حضرت

عبدالقدوس کو تائب کرنا چاہیے وہ خود کو قطب الاقطاب کہلاتے ہیں اور بعض غیر شرعی امور کے پابند ہیں۔ زندگی وجد و حال میں بسر کر رہے ہیں لہذا انہیں سیدھا راستہ دکھا کر ہی آگے بڑھیں۔“

چنانچہ قافلے کا اگلا پڑاؤ کنگوہ تھا۔ وہاں پہنچ کر آپ نے حضرت عبدالقدوس کو پیغام بھجوایا کہ وہ شریعت حضور اکرم ﷺ کی تائید کریں اور سرور و وجد و حال کی حالتوں سے دور رہیں۔ آپ نے جو حسام الدین کا یہ پیغام پایا تو خندہ پیشانی سے جواب بھجوایا۔ ”حضرت ہمیں اقرار ہے کہ ہم غیر شرعی کاموں میں ملوث ہو گئے ہیں اور اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ احکام شرعی سے روگردانی کسی طور پر مناسب نہیں سو ہم اللہ کے حضور توبہ استغفار کرتے ہیں اور آئندہ بچنے کی دعا مانگتے ہیں“ چنانچہ اس کے بعد آپ نے واقعی چند دن سماع کے بغیر گزارے۔ لوگ جو آپ کو اچھی طرح جانتے تھے کہ سماع کے بغیر تو آپ کا گزارہ نہیں۔ اب اس حال میں آپ کو دیکھتے تو حیرت کا اظہار کرتے۔ ساتھ ہی دہلی دہلی آواز میں یہ بھی کہہ جاتے کہ حضرت سکندر لودھی کے محتسب اعلیٰ سے خائف ہو چکے ہیں۔ اگرچہ اس نوعیت کی باتیں حضرت عبدالقدوس کے کانوں میں بھی پڑی تھیں مگر انہوں نے اس پر مطلق توجہ نہ دی۔

ابھی آپ کو سماع سے دور ہوئے چند دن ہی ہوئے تھے کہ ایک رات جب تہجد کی زلٹ اٹھے تو آپ کے کانوں میں ایک عورت کے دوہا گانے کی آواز آئی۔ شیخ قدوس نے جو دوہے کے درد بھرے بول سنے تو وجد میں آگئے اور دیوانہ وار رقص کرنے لگے۔ ضبط کا یارا نہ رہا۔ وجد کی کیفیت میں رقص کرتے جاتے اور دیوانہ وار نعرے لگاتے جاتے۔ پھر جب ذرا اعتدال میں

رہے تھے۔ شیخ قدوسؒ جو سنبھل چکے تھے اور آپ کے نزدیک ہی ٹھہرے تھے نرمی سے آپ کی بات سن کر بولے ”حسام الدین..... روشنی تو ابھی بہت دور ہے لیکن اطمینان رکھ ایک روز وہ تمہارا مقدر بنے گی“ یہ کہا اور سب کو حیرت زدہ چھوڑ کر اپنی عبادت گاہ میں داخل ہو گئے۔

ایک رات جو شیخ قدوسؒ سے ایک خلیفہ نے کشف دیکھا تو حیران رہ گیا اتنی رات گئے آپ مطالعہ میں مصروف تھے۔ حجرے میں چراغ جل رہا تھا جس کی روشنی میں آپؒ اُسے کتاب کھولے بیٹھے نظر آئے۔ اگلی صبح خلیفہ آپؒ کے پاس آیا اور کہنے لگا ”حضرت رات آپ نے بڑی مشقت اٹھائی کہ رات بھر چراغ جلانے پڑتے رہے۔“

یہ سن کر حضرت شیخ عبدالقدوسؒ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور آپؒ نے خلیفہ کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا ”نہیں..... میں کہاں رات بھر جاگتا رہا ہوں۔ ارے بھی ہم نو رات بھر آرام سے سوتے رہے۔“ خلیفہ نے یہ سن کر حیرت سے آپ کو دیکھا اور تذبذب میں پڑ گیا۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا رات خود اُس نے اپنی آنکھوں سے شیخ قدوسؒ کو حجرے میں چراغ جلانے پڑتے دیکھا تھا۔ آپؒ نے جب خلیفہ کو بہ متذبذب دیکھا تو متبسم ہو کے کہا ”خلیفہ یہ بات اچھی طرح جان لے کہ اولیاء جو دنیا کے سامنے نیند میں ہوتے ہیں بظاہر ایسا نہیں ہوتا بلکہ وہ جاگ رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے اُن کی نیند بھی عبادت میں شمار ہوتی ہے۔“ پھر کچھ دیر توقف کے بعد کہنے لگے ”اگرچہ یہ حکم انبیاء کرام کے لیے ہے مگر انبیاء کے اتباع کی وجہ سے اولیاء بھی اس سے فیض یاب ہو جاتے ہیں لیکن اولیاء نیند کے بعد اٹھ کر وضو کی تجدید ضرور کرتے ہیں کیونکہ وہ انبیاء کے لیے مخصوص حکم ہیں۔“

آئے تو حضرت حسام الدین کو کھلوا بھیجا۔
”حضرت..... میں تو آتش زدہ لکڑی کی مانند ہو چکا ہوں اور آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ آتش زدہ لکڑی کی آتش سے جنگل میں نہ تو خشک لکڑی بچ سکتی ہے اور نہ ہی تر۔ جو چیز گرفت میں آئے اسی کو جلا ڈالتی ہے تو مولانا اگر آپ میری یہ کیفیت دور کر سکتے ہیں تو بے شک آئیں میں آپ کا احسان مند رہوں گا۔“

یہ پیغام پا کر حضرت حسام الدین نے اپنے ایک بندے کو بھیج کر معلوم کروایا کہ جا کر دیکھو شیخ قدوسؒ اس وقت کس حالت میں ہیں۔ وہ بندہ گیا اور آپ کو دیکھ کر آنے کے بعد حضرت حسام سے بولا ”حضرت وہ توجہ کی کیفیت میں بے خود ہوئے دیوانہ وار رقص کر رہے ہیں۔“ حضرت حسام نے اُسی سے چند بزرگان کو اکٹھا کیا اور ایک ہاتھ میں دڑالے کر آپؒ کی خانقاہ کی طرف چل کھڑے ہوئے لیکن جو بھی آپؒ کو وجہ کی حالت میں ایسے جلالی انداز میں دیکھا تو دفعتاً آپؒ میں ایک تبدیلی پیدا ہوئی۔ اور پھر اچانک شیخ حسام الدین کی حالت میں ایک تغیر رونما ہوا۔ کہاں وہ حضرت عبدالقدوسؒ کو سیدھا راستہ دکھانے دڑے سمیت آئے تھے اور کہاں یہ حالت کہ خود بھی بے تابی سے دستار اُتار پھینکنے کے بعد ایک بلند آواز نعرہ لگا کر پروانے کی مانند شیخ عبدالقدوسؒ کے گرد گھومنے لگے۔

لوگوں نے حیرت سے یہ منظر دیکھا جب حسام الدین صحیح حالت میں آئے تو لوگوں نے پوچھا ”حضرت..... یہ کیا ہو گیا تھا آپ کو؟ آپ کس مقصد کی خاطر آئے تھے اور کیا کر کے جارہے ہیں تو حسام الدین تھکے تھکے سے انداز میں بولے ”ہم..... ہم غلطی پر تھے، ہم تاریکی میں تھے آج ہمیں اُجالا نصیب ہوا ہے۔ اب تک ہم اندھیرے میں بھٹک

کی کامیابی حاصل نہ ہوئی تو بد قسمت سوچوں میں گم ہو گیا کہ اب کہاں جائے؟ کہاں جا کر اپنی قسمت آزمائے؟ کس بادشاہ شہزادے کا در دیکھے؟ انہی سوچوں میں تھا کہ اچانک اُس کے دل میں آیا کہ آج تک بادشاہوں اور شہزادوں کے پاس جاتا رہا ہوں لیکن فیض کسی سے حاصل نہیں ہوا۔ اب کی مرتبہ کیوں نہ کسی بزرگ اور درویش کے حضور حاضری دوں۔ شاید اللہ کے اُن نیک بندوں کے طفیل میرے حالات پلٹا کھا جائیں اور نصیب میں کبھی یہ غم و پریشانی دُور ہو جائے۔ سو یہ ارادہ کر کے چل کھڑا ہوا اور گھومتا پھرتا۔ رودلی آن پہنچا۔ وہاں پہنچ کر اُس نے لوگوں سے دریافت کیا ”بھائیو..... حالات کا ستایا ایک بد نصیب انسان ہوں، روٹی قسمت کو منانے خدا کے نیک بندوں کی دعاؤں کا خواہش مند ہوں، کیا رودلی میں کوئی نیک بزرگ حق ہیں جن کے سامنے رو رو کر اپنا حال سناؤں اور اُن سے سفارش کراؤں کہ اللہ مجھے وقت کے اس گرداب سے نکال کر سکون بخشنے۔“

لوگوں نے اس پریشان حال شخص کو دیکھا، تکالیف اور مصائب جس کے چہرے سے صاف پڑھے جاتے تھے۔ سو انہوں نے اُس سے ہمدردی کا برتاؤ کیا اور اُسے حضرت عبدالقدوس گنگوئی سے ملنے کی نصیحت کی۔

عمر خان یہ سنتے ہی حضرت عبدالقدوسؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ کی بزرگی، تقدس اور تقویٰ سے بہت متاثر ہوا۔ دل سے کہا عمر یہی وہ بزرگ ہیں جن کی طفیل تمہارے حالات بدلتے دیر نہ لگے گی۔ سو اُسی وقت آپ کے قدموں گر گیا اور رو رو کر ہچکیوں کے درمیان فریاد کرنے لگا۔ ”حضرت میری مدد کیجئے، میں تارک الدنیا ہوں، نہ گھر بار رہا نہ ٹھکانہ، آپ مجھے اپنی پناہ میں لے لیں۔ اپنے دامن

خود کو پورے کا پورا شریک نہیں کرتے۔“

پانی پت کا ایک شخص برسات کے موسم میں حضرت بوعلی قلندر کے مزار پر حاضر دینے گیا تو روضے میں داخل ہوتے ہی حیرت سے وہیں رُک گیا۔ روضے میں اس نے دیکھا کہ قلندر کا سر مبارک تو روضہ میں ہی ہے لیکن انہوں نے اپنا ایک پاؤں باہر نکال کر ایک بزرگ کے زانو پر رکھا ہوا ہے۔ وہ بزرگ اُن کی پابندی کے ساتھ لگا بیٹھا تھا۔ چہرے سے جلال نکلتا تھا اور جس کی پیشانی سے نور نکل رہا تھا۔ چنانچہ وہ شخص حیرت سے وہیں کھڑا کھڑا رہ گیا۔ اچانک اُن بزرگ کی جو نظر اُس شخص پر پڑی تو وہ آہستہ سے اٹھے اور اُس شخص کا ہاتھ تھام کر اُسے قلندر کے پاس لائے اور اُس کا سر جھکا کر قلندر کے قدموں میں ڈالا پھر اچانک قلندر اور بزرگ دونوں اُس شخص کی نظروں سے اوجھل ہو گئے اور وہ حیرت زدہ کھڑا رہ گیا۔ بزرگ کی شکل اُس کے دل و دماغ میں چسپاں ہو کر رہ گئی۔ بہت دیر دماغ پر زور ڈالتا رہا کہ آخر قلندر کے ساتھ بزرگ کون تھے؟ لیکن وہ جان نہ پایا ہاں البتہ بزرگ کی صورت اُس کے دل پر نقش ہو چکی تھی۔

اس واقعہ کے سات سال بعد جب وہ کرنال کسی کام سے گیا، تو انہی بزرگ کامل کو دیکھ کر ٹھٹھک کر رہ گیا۔ یہ وہی بزرگ تھے جسے اُس نے بوعلی قلندر کے مزار پر دیکھا تھا سو حیرت و استہبابہ سے لوگوں سے دریافت کیا کہ یہ کون بزرگ ہیں۔ لوگوں نے اُسے جواب دیا یہ بزرگ کامل حضرت عبدالقدوس گنگوئیؒ ہیں۔

سکندر لودھی کا دور حکومت تھا۔ سن 897 ہجری کا وقت لودھی دربار کا ایک امیر بادشاہ سے کسی بات پر ناراض ہو کر دربار چھوڑ کے چلا آیا۔ حالات کی گردش میں ایسا آیا کہ خون پور گیا مگر وہاں کسی قسم

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور عظیم پیشکش

حج عمرہ اور زیارات عمرہ

شائع ہو گیا ہے

قیمت 175 روپے

- ① نقشہ ارض القرآن مع اہم قرآنی مقامات کی نشان دہی
- ② مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا روڈ میپ
- ③ حج اور عمرہ کی ادائیگی کا طریقہ آسان اور عام فہم زبان میں
- ④ اہم تاریخی مقامات کا نام، وجہ تسمیہ، محل وقوع، تصاویر اور ان سے متعلق
- ⑤ تاریخی واقعات کا بیان نیز متعلقہ آیات اور احادیث کے حوالہ جات
- ⑥ تحریروں، تصویروں اور جدید نقشوں سے مزین یہ کتاب ہی نہیں حج اور عمرہ پر جانے والوں کے لئے ایک مکمل گائیڈ ہے۔

سیارہ ڈائجسٹ 240 ریوازاگارڈن لاہور فون 042-37245412

میں جگہ دے کر اس غریب کو مصائب کے سائے سے دور کریں۔

شیخ عبدالقدوسؒ اس بدنصیب کی حالت پر بہت متاثر نظر آ رہے تھے۔ ہمدردی سے سرشار ہو کر بولے ”نادان اٹھ..... بے صبرا کیوں ہوا جا رہا ہے، جب اللہ کی اس زمین پر میرے لیے جگہ ہے تو تمہارے لیے کیوں نہ ہوگی۔ ہر بشر اللہ کے نزدیک برابر ہے۔ جا۔ بے فکر ہو کر جاتیرا کھٹکول کبھی خالی نہ ہوگا۔ جا خدا کی عبادت کر اور اسی سے مدد مانگ۔ ہم کون ہوتے ہیں نادان تجھے غموں و مصائب سے بچانے والے۔ ہر فعل پر صرف خدا واحد ہی کا اختیار ہے جس کی مرضی کے بغیر ہوتا کچھ نہیں مل سکتا۔“

آپ کی باتیں سن کر عمر خان کوتلی ہوئی۔ دل نے کہا عمر خان اب تیری بدنصیبی کے دن ٹل گئے اور ابھی اُسے اس خوش اسیدی میں دو چار روز ہی گزرے تھے کہ سکندر لودھی اُن طرف سے تجھے و تحائف کے انبار کے ساتھ اُسے دربار طلب کیا گیا اور عزت و احترام کے قول و قرار کا وعدہ کیا گیا۔ عمر خان یہ جان کر خوشی سے بے قابو ہو گیا اور عقیدت سے پر غم آنکھیں لیے آپ کے پاس آن کھڑا ہوا اور کہنے لگا ”حضرت آج آپ کے طفیل مجھے یہ عزت و مرتبہ دوبارہ حاصل ہوا ہے۔ میں آپ سے جدا نہیں ہونا چاہتا آپ میرے ساتھ شاہ آباد (ضلع کرنال) چلیں اور وہاں قیام فرما کر بندگان خدا کو فیض پہنچائیں۔“

آپ نے اُس کی بات مان لی اور شاہ آباد جا کر علم و عرفان کی شمع کی روشنی سے شاہ آباد کو منور کیا۔ رشد و ہدایت کے چشمے جاری کیے۔ طالبین دور دور سے پروانوں کی مانند آنے لگے اور آپ کے ارد گرد جمع رہتے۔

ایک طویل عرصہ شاہ آباد میں قیام کیے آپ کو گزر چکا تھا۔ علم و ہدایت کی جو شمع آپ نے روشن کی تھی

اُس سے ہزار ہا لوگوں نے اپنے باطن میں دھلی تاریکی کو منور کیا۔ ایک دن آپؒ کی اہلیہ نے کشف میں دیکھا کہ خراسان سے ایک آگ اُٹھی ہے جو ہر چیز کو جلاتی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی ہے اور پھر آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ جس قدر جلد ہو سکے اپنے بچاؤ کا انتظام کر لو کوئی مصیبت نازل ہو اسی چاہتی ہے۔

اور پھر جلد ہی تیموری سلسلے کے بابر بادشاہ نے ہندوستان پر ایسی یلغار کی کہ سامنے آئی ہر چیز کو خاک کی طرح اڑاتا ہندوستان کا مختار کل بن گیا۔ ان حالات میں جب ہر طرف نفسا نفسی کا عالم تھا۔ بستیاں تباہی و بربادی سے دو چار تھیں آپ شاہ آباد چھوڑ کر گنگوہ آ کر رہنے لگے۔

شیخ عبدالقدوسؒ فارسی اور ہندی کے شاعر کی حیثیت سے بھی ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ نثر میں بھی کئی کتب تحریر کیں۔

شیخ قدوسؒ ایک صائم الابر عابد تھے۔ عبادتوں میں آپ کو نماز، ذکر الہی اور قرآن کی تلاوت سے گہرا شغف تھا۔ شدید سردی اور برف باری میں پاؤں اور پنڈلیاں پھٹ جاتیں پھر بھی نماز پڑھتے رہتے۔ چار سو کعتیں دن کو اور اتنی ہی رات کو ادا کرتے لیکن خشوع و خضوع کا یہ عالم تھا کہ موسم کی شدت سے بے نیاز عبادت الہی میں تندی سے مصروف رہتے۔

آپؒ نے چوہاسی سال کی طویل عمر پائی اور 23 جمادی الآخر 944 ہجری کو اس دنیا سے پردہ اختیار کر لیا۔ آپ کا مزار گنگوہ ضلع سہارن پور میں آج بھی لوگوں کے نزدیک ایک مقدس زیارت گاہ ہے۔ چار سو سال سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود تاریخ میں آپ کی یہ آواز آج تک محفوظ ہے۔

شریعت لا معبود الا اللہ طریقت لا مقصود الا اللہ۔
اور حقیقت لا موجود الا اللہ۔



بہلا وا.....!

ایس۔ امتیاز احمد

(مغرب سے کشید)

”دی ٹیوٹر“

تحریر: مائیکل بروئن

صاف دل لوگ صاف گو بھی ہوتے ہیں
ازدواجی زندگی میں صاف گوئی تعلقات میں استواری پیدا کرتی ہے
لیکن ہر معاملے میں صاف گوئی نقصان بھی پہنچا سکتی ہے
ایک نیک دل شخص کی روداد جس کا انتقام قدرت نے لیا.....!!



”لورنا“ اس نے نرمی سے کہا ”کچھ دنوں سے تم کچھ بدلی بدلی نظر آ رہی ہو۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“
”بدلی بدلی سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ لورنا بولی۔ ”میں تو ایسی کوئی بات محسوس نہیں کر رہی۔“
”ممکن ہے یہ میرا وہم ہو“ ویلیس نے آہستہ سے کہا ”بس ایک خیال ذہن میں آیا تھا، اس کا اظہار

ویلیس ایک حقیقت پسند اور صاف گو شوہر تھا۔ وہ ازدواجی معاملات میں شکوک و شبہات کا قائل نہیں تھا۔ نہ خود کوئی بات چھپاتا تھا اور نہ ہی اپنی بیوی لورنا سے ایسی توقع رکھتا تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ بدظنی سے فتنہ جنم لیتا ہے۔ اسی لیے جب اس نے لورنا کے رویے میں بے اعتنائی محسوس کی تو وضاحت طلبی میں کوئی دیر نہیں لگائی۔

کر دیا، تم کچھ خیال نہ کرنا۔

لورنا نے دنواز مسکراہٹ سے شوہر کی طرف دیکھا۔
”آج کل تم نے کچھ زیادہ ہی سوچنا شروع کر دیا ہے۔
یہ بات تمہاری صحت کے لیے مفید نہیں ہے۔“

ولیس نے لورنا کے لہجے میں دبا ہوا طنز محسوس کر لیا
تھا اس لیے اس نے مزید بولنا مناسب نہیں سمجھا۔
اس کی عمر لورنا سے اٹھارہ سال زیادہ تھی اور اسے عمر
کے اس تفاوت کا بخوبی احساس تھا۔ لورنا ہنوز جوان
اور پُرکشش تھی اور باآسانی نئی دنیا آباد کر سکتی تھی۔

پارکنگ کی دشواری کے پیش نظر ولیس عام طور پر بس
کے ذریعے دفتر جاتا تھا۔ ایک روز تاسازی طبع کے
باعث وہ دفتر سے جلدن اُٹھ گیا۔ راستے میں ایک موڑ
کے قریب جب اس نے لورنا کو کار میں بس کے
نزدیک سے گزرتے دیکھا تو اسے سخت تعجب ہوا۔ اس
تعجب کا ایک پہلو تو یہ تھا کہ لورنا کو ڈرائیونگ نہیں آتی
تھی۔ کم از کم ولیس کے علم کے مطابق ایسا ہی تھا اور
دوسرا حیرت انگیز پہلو یہ تھا کہ لورنا کے پہلو میں ایک
خوبرو نو جوان بیٹھا ہوا تھا جو بڑے انہماک سے اس کے
ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ کار چند لمحوں تک بس کے ساتھ
ساتھ چلتی رہی تھی یہ محض اتفاق ہی تھا کہ اس پرولیس کی
نظر پڑ گئی۔ عجلت میں وہ کار کی نمبر پلیٹ نہیں دیکھ
سکا لیکن رنگ اور ماڈل وہی تھا جو اس کی کار کا تھا۔ لورنا
کا چہرہ گو اس نے صرف ایک رخ سے دیکھا تھا تاہم
اسے یقین تھا کہ اس نے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی
تھی۔ لباس کا رنگ اور سٹائل اس کا جانا پہچانا تھا۔

ولیس کی پیشانی حکمن آلود ہو گئی۔ ان کی شادی کو تین
سال ہو چکے تھے۔ اس دوران میں اس نے لورنا کو
ڈرائیونگ سکھانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی لیکن ناکام رہا
تھا۔ سنیہ نگ وکیل پر ہاتھ رکھتے ہی لورنا پر گویا سکتہ
طارق ہو جاتا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس کے لاشعور
پر کئی نامعلوم خوف مسلط ہو۔ اس کی بڑی خواہش تھی

کہ لورنا ڈرائیونگ سیکھ لے اور دوسری بیویوں کی طرح
اسے دفتر چھوڑ آئے اور شام کو واپس لے آئے۔ یا تو
لورنا شروع ہی سے ڈرائیونگ جانتی تھی یا اس نے حال
ہی میں ڈرائیونگ سیکھی تھی۔ ہر دو صورتوں میں یہ سوال
پیدا ہوتا تھا کہ اس نے یہ بات چھپائی کیوں۔

شادی سے قبل وہ لورنا سے زیادہ واقف نہیں تھا۔ وہ
ایک فرم میں استقبالیہ کلرک تھی۔ ولیس کا رہا باری سٹیٹ
نہیں وہاں چھپ کر تھا۔ چند ملاقاتوں کے بعد دونوں
میں دوستی ہو گئی پھر تعلقات دوستی سے آگے بڑھ گئے
اور بالآخر وہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہو گئے
لیکن کیا وہ واقعی ایک دوسرے کے ہو گئے؟ اپنے ذہن
میں پیدا ہونے والے اس سوال کا ولیس کے پاس کوئی
جواب نہیں تھا۔ لورنا کے اس پر راز روپے نے اسے
اُلجھن میں ڈال دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس
کے ساتھ تعلق نہیں تھی۔ پہلے اس نے براہ راست
بواب طلبی کا ارادہ کیا جیسا کہ وہ ہمیشہ کرتا تھا لیکن اس
مرتبہ صورت حال زیادہ سنگین تھی۔ اس بات کا قوی
امکان تھا کہ لورنا جھوٹ کا سہارا لینے کی کوشش کرتی
اور آئندہ کے لیے محتاط ہو جاتی۔

”آج کا دن کیسا گزرا ڈارلنگ؟“ اس نے
سرسری طور پر پوچھا۔

”اچھا گزرا!“ لورنا نے جواب دیا۔ ”آج میں
باسکومب گئی تھی۔“ ”کوئی خاص کام تھا؟“
”کیا تمہیں ہر بات بتانی ضروری ہے؟“

ولیس کو اس بات پر حیرت ہوئی لیکن لورنا کے
ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ کہنے لگی ”شاید تم بھول
گئے کہ ہماری شادی کی سالگرہ قریب آرہی ہے۔
میں شاپنگ کرنے گئی تھی تم نے آج کیا کام کیا؟“
”وہی جو روز کرتا ہوں آج طبیعت خراب تھی اس
لیے جلدی اُٹھ گیا۔“

شادی کی سالگرہ سے ایک روز قبل اس نے لورنا

”اوہ شکر ہے۔“ لورنا نے کہا ”میں تو ڈر رہی گئی تھی۔ بہر حال تمہیں ڈاکٹر کو ضرور دکھانا چاہیے۔“ فی الحال ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں!“ ویلس بولا ”تم نے ڈرائیونگ کب سیکھی؟“ ”افسوس کہ میرا راز کھل گیا۔ میں شادی کی سالگرہ پر تمہیں چونکا دینا چاہتی تھی۔“

”اس سے زیادہ کیا چونکاؤ گی!“ ویلس نے کہا ”میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم ڈرائیونگ سیکھ لو گی۔ یاد ہے میں نے تم پر کتنی محنت کی تھی لیکن تم نے اتنی جلدی ڈرائیونگ کیسے سیکھ لی؟“

”میں نے تمہیں بتائے بغیر ایک ڈرائیونگ سکول میں داخلہ لے لیا تھا گزشتہ ہفتے کورس مکمل ہونے پر مجھے لائسنس بھی مل گیا ہے۔“

”تعجب خیز! لیکن تم تو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی خوفزدہ ہو جاتی تھیں۔“

”میرا ڈرائیونگ انسٹرکٹر بہت شاندار آدمی ہے۔ وہ نہایت صبر اور استقلال کے ساتھ ڈرائیونگ سکھاتا ہے تمہاری طرح فوراً آپے سے باہر نہیں ہو جاتا۔ جس کا کام ہوتا ہے وہی اسے بخوبی انجام دے سکتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ شوہر سے کبھی ڈرائیونگ نہیں سیکھنی چاہیے۔“

ویلس نے ہولے سے سر ہلایا۔ گویا اس خوفزدہ نوجوان کے بارے میں بھی وضاحت ہو گئی تھی جسے اس نے کار میں لورنا کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ نوجوان اس کا ڈرائیونگ انسٹرکٹر تھا۔ یہ جاننے کے باوجود بھی ویلس پوری طرح مطمئن نہیں ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس ضمن میں مزید تحقیقات کرے گا۔

اگلے روز لورنا نے اسے پیلے رنگ کا لفافہ دیا۔ ویلس نے متجسس نظر سے لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ لفافے کے اوپر لورنا نے اسے ہاتھ سے اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ لفافے کے اندر سالگرہ کا کارڈ اور لورنا کا ڈرائیونگ لائسنس تھا۔

سے کہا کہ وہ اسے کنٹری کلب میں ڈنر کھانا چاہتا ہے۔ لورنا نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا۔

ٹھیک آٹھ بجے دونوں تیار ہو کر کلب روانہ ہو گئے۔ کنٹری کلب شہر سے باہر ایک تفریحی مقام پر واقع تھا۔ رات تاریک اور سڑک سنسان تھی۔ نصف راستہ طے کرنے کے بعد ویلس نے یکا یک بریک لگا دیے اور اپنی سیٹ پر تقریباً ڈھیر ہو گیا۔ لورنا کی خوشگوار گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

”ویلس؟“ اس نے گھبراہٹ سے کہا ”کیا ہوا تمہیں۔“ ”ہاں نہیں! دل ڈوب سا رہا ہے۔“

لورنا چند لمحوں تک بے حرکت بیٹھی رہی۔ ویلس نے الٹ الٹ کر کہا ”کوئی کار یا فیکسی روکویا کلب سے مدد لانے کی کوشش کرو۔ میں اب کار نہیں چلا سکتا۔“

لورنا نے کھڑکی سے سر نکال کر باہر دیکھا۔ اس پاس کوئی کار نظر نہیں آرہی تھی۔ ویلس آرام سے سیٹ پر پڑا ہوا لورنا کے رد عمل کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ نیم وا آنکھوں کے گوشے سے لورنا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر تک سوچنے کے بعد لورنا کار کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی اور گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آگئی۔

”اس ویرانے میں مدد ملنے کا کوئی امکان نہیں“ اس نے کہا ”مجھے خود ہی کچھ کرنا پڑے گا۔“ اس نے ویلس کو آہستگی سے دھکیل کر قریبی سیٹ پر گرادیا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ پھر بولی ”کلب میں کوئی نہ کوئی ڈاکٹر ضرور ہو گا۔ فکر کرنے کی کوئی بات نہیں، بس آرام سے بیٹھے رہو۔“

چند لمحوں کے اندر کار دوبارہ سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ لورنا بڑی سہارت کے ساتھ ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ کچھ دور جانے کے بعد ویلس اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”میری طبیعت ٹھیک ہو گئی ہے“ اس نے خمار آلود لہجے میں کہا ”ہاں نہیں اچانک مجھے کیا ہو گیا تھا!“

جب وہ گاڑی کی طرف جارہے تھے تو ویس کے ذہن میں عجیب قسم کے خیالات جنم لے رہے تھے۔ اس نے اُن خیالات کو جھٹکنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا کہ وہ ایک بار پھر بدظنی کا شکار ہو رہا ہے۔ اس وقت ساحل کی سیر کا ارادہ محض اتفاق بھی ہو سکتا ہے۔ جب وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے لگا تو لورنا نے آگے بڑھ کر کہا ”آج میں ڈرائیونگ کروں گی“۔

اس بات نے ایک بار پھر اسے الجھن میں ڈال دیا۔ اس وقت ساحل کی سیر کا ارادہ اور پھر ڈرائیونگ پر اصرار خالی از علت نہیں تھا۔ ویس کی چھٹی حس دماغ کے پیچھے حصے میں خطرے کی گھنٹی بج رہی تھی۔ ”ڈرائنگ!“ اس نے پیار سے کہا ”کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ میں ڈرائیونگ کروں۔ رات کا وقت ہے اور راستہ پر خطر ہے۔ تم نے نئی نئی ڈرائیونگ سیکھی ہے اس لیے تمہیں احتیاط کرنی چاہیے۔“

”ڈرنے کی قطعاً کوئی بات نہیں تم ذرا دیکھنا میں کتنی مہارت سے کار چلاتی ہوں!“ لورنا نے کہا لیکن اس کے ذہن میں کچھ اور تھا۔ وہ سوچ رہی تھی اسی دن کے لیے تو میں نے کار چاانی سیکھی تھی۔ وہ اس منصوبے کی تفصیلات کے بارے میں سوچنے لگی جو اس نے اور ایڈ نے تیار کیا تھا۔ وہ اپنے ذہن میں ان تفصیلات کو دہرانے لگی۔ ایڈ اس وقت پہاڑی کے موڑ پر ان کا منتظر تھا۔ وہ چوٹی پر پہنچنے سے پہلے اپنی آمد کی اطلاع دینے کے لیے انڈیکٹر لائٹ دو دفعہ جلائے گی۔ جب کار چوٹی سے چند قدم کے فاصلے پر رہ جائے گی تو ایڈ تیزی سے سڑک پر آجائے گا۔ لورنا اسے بچانے کے بہانے کار کو کنارے کی طرف موڑ دے گی۔ کنارے کے عین اوپر پہنچ کر وہ بریک لگائے گی اور دروازہ کھول کر باہر کود جائے گی پھر ایڈ کار کو ذرا سی کوشش سے نیچے دھکیل دے گا۔

”اس منصوبے میں سب سے اہم کام تمہارا ہے“ ایڈ نے لورنا سے کہا تھا ”مجھے دیکھتے ہی تم رفتار کم

یہ سب کچھ دیکھ کر اسے ندامت سی ہوئی۔ اس نے ہمیشہ بدظنی سے گریز کیا تھا لیکن اس مرتبہ شاید شیطان اس پر غالب آگیا تھا۔ اسی دن وہ اپنے دفتر میں بیٹھا سوچ رہا تھا۔ وہ کسی سستے ناول کے کردار کی سی حرکت کر رہا تھا۔ میں نے یہ سوچنا شروع کر دیا تھا کہ لورنا بے وفا ہے اور دولت کی خاطر مجھے قتل کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ مجھے اس گھٹیا حرکت کی تلافی کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے۔ لورنا میرے بارے میں کیا سوچ رہی ہوگی؟ عین اس وقت لورنا فون پر بات کر رہی تھی ”میرا خیال ٹھیک تھا ایڈ۔ اس روز ویس نے ہمیں کار میں گزرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔“

”اور جعلی ڈرائیونگ لائسنس نے اسے مطمئن کر دیا ہوگا؟“

”فی الحال تو وہ مطمئن ہو گیا ہے لیکن اب ہمیں اپنے منصوبے پر عمل درآمد کر ہی ڈالنا چاہیے۔“

”کل رات کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔“

”میں تھوڑی دیر میں تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں“

ایڈ نے کہا ”ظاہر ہے کہ ویس تو دفتر جا چکا ہوگا باقی تفصیلات وہیں طے کریں گے۔“

اُسی روز رات کے کھانے سے فراغت پا کر لورنا نے ویس سے کہا ”آج کچھ تفریح کا موڈ ہو رہا ہے۔“

”میں سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے؟“ ویس بولا

”کہیں چمنے کا ارادہ ہے؟“ ”آج ساحل کی سیر کرتے ہیں“

ویس یہ سن کر چونک سا گیا۔ ساحل وہاں سے تین میل کے فاصلے پر تھا۔ وہاں تک جانے والی سڑک ایک اونچی پہاڑی کے اوپر سے ہو کر گزرتی تھی۔ اس پہاڑی پر بسا اوقات حادثات ہوتے رہتے تھے۔ ویس سوچ رہا تھا کہ لورنا بے وقت وہاں کی سیر کیوں کرنا چاہتی ہے؟ اس نے اپنی حیرت چھپاتے ہوئے کہا ”اوہ کیوں نہیں؟“

سیارہ ڈائجسٹ کی حسب روایت ایک اور عظیم پیشکش

شائع
ہو گیا
ہے۔

والدین نمبر

قیمت 175 روپے

● ایک تاریخی دستاویز جو انشاء اللہ یقیناً ہر گھر کی کامیابی اور فلاح کا ذریعہ بنے گی۔

● جس میں قرآن اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں:

● والدین کے فضائل، آداب، حقوق، فرائض اور ان کے شایان شان مستند مواد اور محکم استنباط پر مبنی واقعات اور دیگر مواد کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

ہر گھر میں پیار و محبت
کی تحریک کا آغاز کیجئے

خود بھی پڑھیے اور دوسروں
کو بھی پڑھائیے

سیارہ ڈائجسٹ - 240 مین مارکیٹ ریوارز گارڈن لاہور
فون: 042-37245412

کردینا اور کنارے کے عین اوپر پہنچ کر بریک لگا دینا۔ تمہارے باہر آنے ہی میں کار کو ہزار فٹ کی بلندی سے نیچے لڑھکا دوں گا۔ تمہاری ذرا سی غلطی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ بریک کنارے کے عین اوپر پہنچ کر لگنے چاہئیں، نہ ایک۔ ایچ آگے نہ ایک ایچ پیچھے۔

”تم کوئی فکر نہ کرو!“ لورنا نے کہا تھا ”تم نے دیکھا نہیں میں ایک ہفتے کی ریہرسل کے دوران میں کتنی عمدگی سے بریک لگاتی رہی ہوں!“

انہی خیالات کے بیچ و خم میں وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی اور کار کو آگے بڑھا دیا۔

”کیا سوچ رہی ہو لورنا؟“ ویلس نے پوچھا۔

”آں ہاں..... کچھ نہیں۔“

”کبھی کبھی میں ہنسوں کرتا ہوں کہ تم ڈننی طور پر مجھ سے بہت دور چلی گئی ہو۔“

”آج کل تم ضرورت سے زیادہ ہی سوچنے لگے ہو۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے“ ویلس نے کہا ”اب ذرا

احتیاط کرنا، پہاڑی علاقہ شروع ہو رہا ہے۔“ لورنا کے

ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ وہ بیسیوں مرتبہ

اس طرف آنچلی تھی۔ اس کی نگاہ سامنے سڑک پر جمی ہوئی

تھی۔ جب چوٹی سوگزدور رہ گئی تو اس نے رفتار کم کر دی

اور دو مرتبہ انڈیکسٹر لائن جلائی۔ موڑ کے قریب سفیدے

کے درخت کی لوٹ میں کھڑے ہوئے ایڈ نے یہ اشارہ

دیکھ لیا۔ جب کار چند قدم کے فاصلے پر رہ گئی تو وہ

منصوبے کے مطابق داڑتا ہوا سڑک پار کرنے لگا۔

”دیکھنا سامنے آدی ہے“ ویلس نے چیخ کر کہا۔

لورنا نے نہایت مہارت کے ساتھ گاڑی کو دائیں

طرف موڑا اور عین کنارے کے اوپر پہنچ کر بریک لگا

دیئے۔ پھر جیسے ہی وہ دروازہ کھول کر باہر نکلی، فضا میں

ایک چیخ اور دھماکے کی آواز بلند ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی

مخالف سمت سے آنے والی کار ایک جھٹکے کے ساتھ رک

گئی۔ ویلس بھی دروازہ کھول کر باہر آ گیا اور خوفزدہ نظر

سے سڑک کے وسط میں پڑی ہوئی لاش کو دیکھنے لگا۔

دوسری کار سے ایک لویئر عمر شخص باہر آیا اور ویلس کو

مخاطب کر کے کہنے لگا ”آپ نے دیکھا جناب! میری

اس میں قطعاً کوئی غلطی نہیں۔ یہ شخص پہلے آپ کی کار

سے بچنے کے لیے بھاگا تھا۔ یہ تقریباً سڑک پار کر چکا تھا

لیکن پھر اس کے ذہن میں نہ جانے کیا ذہن سہلی کہ

دوبارہ اسی کنارے کی طرف واپس بھاگا۔ میری کار بالکل

قریب پہنچ چکی تھی اور بریک لگانے کا وقت گزر چکا تھا۔

”شاید یہ کوئی دیوانہ تھا“ ویلس نے کہا ”بڑے

آرام سے درخت کے پیچھے کھڑا تھا۔ جب ہماری

کار بالکل قریب پہنچ گئی تو سڑک پار کرنے کے لیے

بھاگا۔ اگر میری بیوی بروقت بریک نہ لگاتی تو ہم کار

سمیت ہزار فٹ کی بلندی سے نیچے لڑھک جاتے۔“

پھر ویلس اور لورنا کو پولیس کے آنے تک وہاں

رکنا پڑا۔ واپسی پر ویلس نے لورنا سے کہا ”ڈارلنگ

میں ایک چھوٹا سا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔“ لورنا نے

حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

”آج جب ہم سیر کے لیے روانہ ہو رہے تھے تو

میرے دل میں تمہارے متعلق بدگنی پیدا ہوئی تھی۔ پتا

نہیں کیوں میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ تم

میرے خلاف کوئی منصوبہ بنا چکی ہو۔ اب تمہارے معصوم

چہرے کی طرف دیکھ کر مجھے اپنے اس لائسنس خیال پر سخت

ندامت ہو رہی ہے۔ یہ تم جانتی ہو کہ میں ایک حقیقت

پسند شوہر ہوں۔ اپنے دل میں کوئی میل نہیں رکھتا۔“

”اس وقت تمہارے دل کا کیا حال ہے؟“

”شیشے کی طرف صاف ہے“ ویلس بولا۔

”تو پھر ندامت کی کیا بات ہے ڈیر!“ لورنا نے

پورے خلوص کے ساتھ کہا ”انسان کا دل سمندر کی

مانند ہے اور سمندر میں سرکش ہوا کی وجہ سے کبھی کبھی

حلاطم بھی پھا ہو جاتا ہے۔“



جنوں رنگ

ندیم شاہ

اس کے ساتھ ہی میں نے مستانہ کے جسم پر پے در پے وار کرنے شروع کیے اور پھر ایک گھاؤ ایسا لگایا کہ چاقو اس کے جسم میں پھنس کر رہ گیا۔ میں نے پوری قوت سے اسے نکالنے کی کوشش کی جب وہ باہر نہیں آیا تو میں نے اسے گھما دیا۔ پھر چاقو کے باہر آتے ہی مستانہ نے آخری ہنسی لی۔



بعض مجرم ایسے ہوتے ہیں جن کی وجہ بظاہر سمجھ نہیں آتی، ایک مجرم کا اعتراف نامہ

ایک جنون سا مجھ پر سوار تھا اور میں اسے مار رہا تھا۔ اس کی زبان چل رہی تھی۔ وہ گندی گندی گالیاں بک رہا تھا۔ اور میں ہر گالی پر وار کر رہا تھا۔ اب یاد

قتل کر دیا، میں نے اسے جان سے مار دیا۔ وہ حیدر آباد کے سینئر صحافی تھا۔ میں نے چاقو سے پتا نہیں کتنے وار کیے، میں چاقو گھونپتا ہی چلا گیا۔

ضرور ہے۔“ستانہ سیال نے کہا ”گھر میں کوئی نہیں ورنہ تمہیں چائے ضرور پلاتا۔“

”میں جانتا ہوں گھر میں کوئی نہیں ہے“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ یہ بات میں نے درست کہی تھی۔ میرے علم میں تھا کہ اس کے گھر والے کہیں گئے ہیں۔ لیکن میرا یہاں آنے کا ارادہ نہیں تھا مگر شہنشاہ سے ملاقات ہوئی تو اس نے کہاں کہ اس کے پاس پیسے بالکل نہیں ہیں۔ میرے پاس بھی نہیں تھے ورنہ میں اس کی ضرورت پوری کر دیتا۔ پھر اچانک ہی مجھے ستانہ سیال کا خیال آیا اور میں نے اس سے کہا ”ایک جگہ سے پیسے مل سکتے ہیں، لیکن تھوڑا سا ڈرامہ کرنا پڑے گا ہمارے ذرا سی کوشش سے وہ شخص بلیک میل ہو سکتا ہے۔“

”تو پھر چلو کوشش کر لیتے ہیں۔“

اس کے بعد ہی میں شہنشاہ کے ساتھ گھر سے نکلا تھا۔ میں نے گھر سے چلتے ہوئے چاقو بھی جیب میں رکھ لیا تاکہ ڈرانے دھمکانے کے کام آسکے۔ ہم لوگ صدر سے ہیر آباد تک پیدل ہی گئے تھے، راستہ بھر ہم لوگ ستانہ سیال کو بلیک میل کرنے کے سلسلے میں ہی باتیں کرتے رہے تھے۔ ستانہ سیال کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے ہی میں نے شہنشاہ کو تاکید کی تھی کہ بات تحمل اور طریقے سے کرنا، بے صبری کا مظاہرہ کھیل بگاڑ سکتا ہے کیونکہ وہ صحافی ہے اور صحافی عموماً دلیر بھی ہوتے ہیں۔ وہ دھمکی بھی دے سکتا ہے لیکن اس کی دھمکی میں آنے کی ضرورت نہیں اگر ہم اس کی دھمکی میں آئے تو نہ صرف ہمارا کام نہیں ہوگا بلکہ وہ ہمیں پھنسا بھی سکتا ہے سمجھ گئے میری بات!“ آخر میں شہنشاہ کو پکا کرنے کے لیے کہا تھا۔

کر کے مجھے افسوس اور دکھ ہو رہا ہے، وہ تڑپ رہا تھا، خود کو میرے، وار سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہر وار پر دو تین گندی گالیاں دے رہا تھا، آخر کار اس نے آخری ہچک لی اور اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ اس کی زبان رُک گئی۔ لیکن میرا ہاتھ نہیں رُکا۔ میں نے آخری وار کیا اور اس سے الگ ہو گیا۔ میرے کپڑے اس کے خون سے لت پت ہو گئے تھے ”اس کے کپڑوں کی تلاشی لو“ میں نے اپنے دوست شہنشاہ کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

ٹی وی کی تیز آواز میں شاید شہنشاہ میری بات نہیں سُن سکا تھا ”چل بھاگ چلیں ندیم شاہ!“ اس نے قدرے تیز آواز میں کہا ”اس سے پہلے کہ یہاں کوئی آجائے۔“ میں آگے بڑھ کر ٹی وی کی آواز کم کی۔ یہ آواز میں نے خود ہی بڑھائی تھی تاکہ کمرے میں ہونے والی گفتگو کی آواز باہر والے نہ سُن سکیں۔ جب ہم اس صحافی کے کمرے میں داخل ہوئے وہ تنہا ہی بیٹھا ہوا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ مسکرا دیا تھا۔ اس کی آواز اب بھی میرے کانوں میں گونجتی ہے ”بہت دن بعد آئے ہو شاہ، کہاں گئے تھے؟“

”یہ شہر بہت بڑا ہو گیا ہے تم تک پہنچنے میں اتنی دیر لگ گئی۔“ میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا ”اس سے مویہ میرا دوست شہنشاہ ہے!“

”کہاں رہتا ہے شاید میں نے اسے پہلے بھی دیکھا ہے“ صحافی نے کہا ”بیٹھ جاؤ۔“

”تمہاری نظریں بہت تیز ہیں ستانہ سیال!“ میں نے صحافی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ”شہنشاہ کو تم نے ضرور ہی دیکھا ہوگا۔“

”یہ تو یاد نہیں لیکن میں نے اسے دیکھا

میری بات کاٹ کر کہا اور ایسے ہاتھ چلایا جیسے مجھے مارنا چاہتا ہو۔

میں بھی اپنی جگہ کھڑا ہو گیا اور دوسرے ہی لمحے میں میرے ہاتھ میں چاقو تھا ”اسے دیکھ رہا ہے، اتنے وار کروں گا کہ نہ جسم پہچانا جائے گا اور نہ شکل!“

اس فقرے کے ساتھ ہی مستانہ سیال مشتعل ہو گیا اور پھر اس سے پہلے کہ وہ ہم پر حملہ کرتا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا ایک ہاتھ سے منہ بند کیا اور چاقو شہنشاہ کی طرف اچھالتے ہوئے اشارہ کیا کہ اس پر وار کر دے۔ شہنشاہ نے فوراً چاقو اٹھا کر مستانہ سیال پر وار کر دیا۔ اس نے اس وار کو روکنے کی کوشش کی لیکن وہ میری گرفت سے نکل نہیں سکا۔ ہاں یہ ہوا کہ اس کے منہ پر سے میرا ہاتھ لمحہ بھر کے لیے ہٹ گیا۔ اس نے کئی گالیاں بک دیں اور شہنشاہ نے اس کے جسم پر کئی وار کر دیئے، لیکن مستانہ میری گرفت سے نکلنے کی مسلسل کوشش کر رہا تھا اور اسے جیسے ہی موقع ملتا وہ گندی گندی گالی بک دیتا تھا۔ جب مستانہ سیال نے شہنشاہ کے دس بارہ وار برداشت کر لیے تو میں نے اسے ایک طرف دھکا دے کر گرا دیا اور پھر شہنشاہ کے ہاتھ سے چاقو لے لیا۔

”تم اسے ابھی مار نہیں سکے۔ دیکھو، یہ کیسے مرتا ہے“ اس کے ساتھ ہی میں نے مستانہ کے جسم پر پے در پے وار کرنے شروع کیے اور پھر ایک گھاؤ ایسا لگایا کہ چاقو اس کے جسم میں پھنس کر رہ گیا۔ میں نے پوری قوت سے اسے نکالنے کی کوشش کی جب وہ باہر نہیں آیا تو میں نے اسے گھما دیا۔ پھر چاقو کے باہر آتے ہی مستانہ نے آخری لہجی لی۔

”تم کس طرح جانتے ہو، میرے گھر میں کوئی نہیں۔“ مستانہ سیال نے پوچھا ”کیا تم ہماری ٹوہ میں رہتے ہو۔“

”تمہاری ٹوہ میں رہنے کی ضرورت کیا ہے“ میں نے کہا ”اور میرا خیال ہے تمہیں یہ بھی بتانے کی ضرورت نہیں کہ مجھے کیسے معلوم کہ اس وقت تمہارے گھر میں کوئی نہیں۔“

”چھوڑو! یہ بتاؤ کیسے آنا ہوا؟“

”آنا تو کام سے ہی ہوا ہے“ میں نے کہا ”اس شہنشاہ کو پیسوں کی ضرورت ہے اور یہ تمہارا کام بھی کرے گا۔“

”کیا مطلب؟“ مستانہ سیال نے کہا۔

”کیا تمہیں مطلب بھی سمجھانا پڑے گا۔“ میں نے آنکھیں نکال کر کہا ”میں جانتا ہوں تم لڑکوں سے کیا کام لیتے ہو شہنشاہ تمہارے کام آسکتا ہے۔ تم اس کی ضرورت پوری کرو یہ تمہاری کرے گا۔“

”کیا بکواس ہے“ مستانہ سیال نے تیز آواز میں کہا ”تم نے کیا سمجھا ہے مجھے۔“

میں نے ہاتھ بڑھا کر ٹی وی کی آواز تیز کی اور کہا ”تیز آواز میں بات مت کرو ورنہ انجام بُرا ہوگا۔“

”کیا بُرا ہوگا؟“ مستانہ سیال نے اپنی جگہ سے کھڑے ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

میں اس سے پہلے ہی کھڑا ہو گیا اور اسے کندھوں سے پکڑ کر بٹھاتے ہوئے بولا ”اب انسانوں کی طرح جیب میں جتنے پیسے ہیں باہر نکالو۔ زیادہ تیز بولنے اور اچھلنے کی کوشش کرو گے تو ہم محلے میں تیری عزت خاک میں ملا دیں گے۔ یہ لڑکا باہر نکل کر شور مچا دے گا کہ تم اس کے ساتھ بُرا کام کرنے لگے۔“

”خاموش رہ کیے انسان!“ مستانہ سیال نے

جہنم لیتی ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ میرا تعلق کسی ایسی تنظیم سے نہیں جو دہشت گرد ہو، میرا تعلق کسی جرائم پیشہ گروہ سے بھی نہیں لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ مجھے کسی چیز کی ضرورت بھی نہیں۔ میری ضروریات بھی ہیں، میں انہیں پورا کرنا بھی چاہتا ہوں۔ اس کے لیے میرے ذہن میں کئی منصوبے آتے اور مٹتے رہتے ہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ کہیں ڈاکا ڈالنے، کسی کو اغوا کر کے تاوان حاصل کرنے کے بجائے..... کسی بھی شخص کو بلیک میل کر کے مال بنایا جاسکتا ہے۔ گھناؤنے الزام سے بچنے کے لیے کوئی بھی اپنی جیب خالی کر سکتا ہے۔ جس وقت شہنشاہ میرے پاس آیا اس وقت بھی میں ایسے ہی منصوبے پر غور کر رہا تھا اور شہر کی مختلف شخصیات کے چہرے میری نگاہوں کے سامنے گردش کر رہے تھے۔ جب شہنشاہ نے اپنی جیب خالی ہونے کی بات کی تو اس وقت میری نگاہوں کے سامنے مستانہ سیال کا چہرہ گردش کر رہا تھا۔ جب میں نے شہنشاہ کو اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا تو اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ مستانہ اس وقت مکان میں اکیلا ہوگا۔ وہ اکیلا نہیں ہوتا تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا، میں یہ بات جانتا تھا کہ جس کمرے میں وہ ہوتا تھا وہ کمرہ تو مکان ہی کا تھا لیکن اس کمرے کا مکان سے کوئی تعلق بھی نہیں ہوتا تھا۔ وہ کمرہ بیرونی دروازے کے ساتھ ہی تھا اور جب مستانہ اس کمرے میں ہوتا تو مکان والے اندرونی حصے میں ہوتے تھے اور ان کے علم میں نہیں ہوتا تھا کہ مستانہ اپنے کمرے میں کیا کر رہا ہے، اس سے ملنے کون آرہا ہے۔ اندرونی حصے میں آواز اس کمرے تک نہیں آتی تھی اور اس کمرے کی آواز اندر نہیں

”یہ تو مر گیا“ شہنشاہ نے کہا۔

”ٹھیک ہے مر جانے دو“۔ میں نے اپنی پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”تلاشی لو اس کی“۔

کچھ نوٹ خون میں بھیگ گئے ہیں..... اور یہ تین سو روپے سے زیادہ نہیں ہیں۔

”انہیں رکھ لو اور یہاں سے نکل چلو!“

”اس طرح تو ہم باہر نہیں جاسکتے“ شہنشاہ نے اپنے اور میرے خون آلودہ کپڑوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

بات وہ ٹھیک کر رہا تھا۔ ہمارے کپڑے خون میں لت پت تھے۔ میں نے کمرے میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی اور پھر مجھے مستانہ سیال کے کئی شلوار سوٹ نظر آ گئے۔ میں نے کپڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”اپنے کپڑے اتار کر ان میں سے ایک جوڑا پہن لو“ میں بھی یہی کرتا ہوں۔ اتنا کہہ کر میں نے اپنے کپڑے اتارے اور پھر ذرا سی دیر ہی میں مستانہ سیال کا جوڑا میرے جسم پر تھا، یہی کچھ شہنشاہ نے بھی کیا۔ کپڑے بدلنے کے فوراً بعد ہی ہم دونوں کمرے سے باہر تھے۔ باہر نکل کر میں نے کمرے کا دروازہ بھیڑ دیا تاکہ لوگوں کو یہی گمان ہوتا رہے کہ مستانہ ٹی وی دیکھ رہا ہے۔

کمرے سے باہر آنے کے بعد شہنشاہ نے رائے دی کہ ہمیں چند دن کے لیے حیدرآباد سے چلے جانا چاہیے۔ میں نے اس کی رائے مان لی اور ہم دونوں کراچی کی بس میں سوار ہو گئے۔

ہر شخص کے ذہن میں یہ سوال آسکتا ہے کہ ہم نے اتنی بے دردی سے مستانہ سیال کو کیوں مارا۔ اس ”کیوں“ کے جواب میں ایک حقیقت افروز کہانی

جاتی تھی۔

جب ہم سیال کے کمرے میں جا کر بیٹھے تو اس وقت میں یہ جان گیا تھا کہ اس وقت مستانہ گھر میں اکیلا ہی ہے کیونکہ اندرونی حصے میں روشنی نہیں تھی اگر تھی تو بہت کم نفی دوسرے ایک سناٹا بھی تھا اسی لیے میں نے کہا تھا کہ مجھے علم ہے اس وقت گھر والے نہیں ہیں، اس پر مستانہ نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے ٹوا میں رہنے والی بات کی تھی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ مستانہ اپنی عزت کی خاطر فوراً اپنی جیب خالی کر دے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا پھر میں نے فوری فیصلہ کیا تھا کہ جب آہی گئے ہیں تو خالی ہاتھ جانا بیکار ہے۔ اس لیے میں مستانہ کو مار کر اسے لوٹنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ مستانہ نے گالی دی اور وہ مسلسل گالیاں بکتا رہا، مزاحمت کرتا رہا، ہمارا ہر وار اسے مشتعل کرتا رہا اور لمحہ بہ لمحہ ہمارے غصے اور جنون میں اضافہ ہوتا رہا۔ اگر مستانہ خاموشی سے ہمارے آگے ہتھیار ڈال دیتا تو اپنی جان سے نہیں جاتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسے لوٹنے کے بعد ہم گرفتاری سے بچنے کے لیے اس کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دیتے۔

اس کا علم بہر حال ہمیں پہلے سے نہیں تھا کہ حالات ہمیں کس رخ پر چلنے کے لیے مجبور کرتے، ہم نے جو کچھ کیا وہ تو شاید غلط ہے، لیکن میرے خیال میں حالات کا تقاضا یہی تھا اگر ہم مستانہ کے ساتھ یہ نہ کرتے تب بھی ہم دہشت گرد اور ڈاکے کے الزام میں جیل میں ہوتے، مستانہ مجھے اور میرے والد کو اچھی طرح جانتا تھا اور پھر وہ سینئر صحافی بھی تھا۔ اس کے بیان پر پولیس فوراً حرکت میں آتی اور پھر صبح سے پہلے ہی ہم گرفتار ہو جاتے اس

کے قتل کے بعد یہ ضرور ہوا کہ ہم دو دن بعد گرفتار ہوئے۔ وہ بھی محض اس لیے کہ ہم کپڑے مستانہ کے گھر میں ہی چھوڑ آئے تھے۔ پولیس دھوبی کے لگائے ہوئے نشان سے ہمارے گھر تک پہنچ گئی۔ اگر ہم دو دن بعد نہیں پکڑے جاتے تو چار دن بعد پکڑ لیے جاتے۔ کچھ بھی ہو ہمارا پکڑا جانا لازمی تھا۔ ہم نے دو دن کراچی میں جس دوست کے گھر گزارے تھے اس نے تو یہی مشورہ دیا تھا کہ ہم گرفتاری دے دیں اپنی ”عزت“ بچانے کی خاطر ہم نے خون کیا ہے اس لیے ہمارا کچھ نہیں ہوگا۔ ”عزت“ بچانے والی کہانی ہم نے کراچی والے دوست کو بھی سنائی تھی۔

دو دن تو ہم نے کراچی میں گزارے تھے، ایک تو ہم گھروالوں کو بتا کر نہیں گئے تھے، دوسرے ہمیں یہ یاد آ گیا تھا کہ ہم کپڑے مستانہ کے کمرے میں ہی لاش کے پاس چھوڑ آئے ہیں۔ ان کپڑوں کے توسط سے پولیس ہمارے گھر تک پہنچ سکتی ہے۔ اس سے پہلے کہ پولیس ہمارے گھر تک پہنچے ہمیں خود گھر تک جانا چاہیے پھر ممکن ہے بچاؤ کی کوئی سبیل نکل آئے۔ گھر پہنچنے کے بعد ہی ہمیں علم ہوا کہ پولیس بہت تیزی سے حرکت میں آگئی ہے۔ اصل میں معاملہ ایک صحافی کا تھا۔ دیگر صحافی بھی حرکت میں آگئے تھے۔ یہ تو ہمیں بعد میں علم ہوا کہ صحافیوں نے قاتلوں کی جلد گرفتاری اور عبرت نازک سزا کا مطالبہ کیا ہے۔

پولیس نے شہنشاہ کو پہلے گرفتار کر لیا۔ میں خود اپنے گھر پر گرفتاری دے سکتا تھا، لیکن والدہ کا سامنا کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ اس لیے میں نے خود تھانے میں جا کر پیش ہونے کا فیصلہ کیا اور تھانے

کی سمت پیدل ہی روانہ ہو گیا لیکن ابھی میں تھانے پہنچنے بھی نہیں پایا تھا کہ پولیس کے چند لوگوں نے مجھے گھیر لیا۔ لیکن ان کا رویہ میری توقع کے خلاف بہت نرم تھا شاید اس رویے نے مجھے رونے پر مجبور کر دیا۔ جب ایک سادہ لباس پولیس کے آدمی نے مجھے پکڑا تو میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ یہ الگ بات ہے کہ میں رونا نہیں چاہتا تھا۔

تھانے پہنچ کر میں نے اور شہنشاہ نے اقبال سے کہا دیا۔ ہم نے تسلیم کیا کہ مستانہ کو ہم نے بے دردی سے قتل کر دیا۔ ایسا کیوں کیا؟ اس کے جواب میں ہم نے جو کہانی سنائی وہ ممکن ہے، زیادہ بہتر نہ ہو، یعنی وہ ہمیں سزا سے بچانے کے قابل نہ ہو لیکن ہم نے ”عزت“ بچانے والی کہانی سنا دی اور یہ کہہ دیا کہ مستانہ غلط کام کا عادی تھا۔

ہمارے اقبالی بیان کے بعد ہی پولیس کے ایک افسر نے صحافیوں کو مجرموں کے گرفتار ہونے اور اقبال جرم کرنے کے بارے میں بتایا۔ ہمیں صحافیوں کے سامنے پیش کیا گیا، اس وقت پولیس افسر نے وہی کہانی دہرائی جو ہم نے سنائی تھی۔ ”ان لڑکوں نے یہی بیان دیا ہے“ پولیس افسر نے بتایا ”میرا خیال ہے یہ درست کہہ رہے ہیں۔“ اس کے بعد ہی پولیس افسر نے ہماری گرفتاری کے لیے کی جانے والی کارروائی کے بارے میں بتایا کہ کس انداز میں پولیس نے تفتیش کی، کس طرح دھوبی تک پہنچ کر کس طرح دھوبی کی مدد سے ہمارے گھر تک پہنچے، کس انداز میں شہنشاہ کو گرفتار کیا اور کیسے مجھ تک پہنچے، افسر نے مستانہ کے قتل کو اندھا قتل قرار دیتے ہوئے فخریہ انداز میں کہا کہ ہماری پولیس نے ملزموں کو صرف اڑتالیس گھنٹوں کے اندر گرفتار

کر کے ان سے اعتراف جرم کرا لیا۔ پولیس کی کارگزاری اپنی جگہ لیکن اگر ہم خود گرفتار ہونا نہ چاہتے تو کوئی ہمیں گرفتار نہیں کر سکتا تھا۔ ہم سے پہلی غلطی یہ ہوئی تھی کہ ہم نے اپنے خون آلود کپڑے مقتول کے کمرے میں چھوڑ دیئے۔ دوسری غلطی یہ ہوئی کہ ہم کراچی سے واپس آ کر اپنے گھر پہنچ گئے۔ اگر ہمارا تفتیش کسی جرائم پیشہ گروہ سے ہوتا تو ہمیں کراچی ہی میں پناہ مل جاتی۔ اگر مبینہ دو مبینہ کی تفتیش کے بعد پولیس ہمارے گھر تک پہنچتی تو کیا ہوتا۔ ہم لوگ تو پولیس کے ہاتھ نہیں آتے۔ آخری بات میں یہ کرنا چاہتا ہوں کہ اقبال جرم ہم نے خود کیا۔ ہم سے اعتراف کرانے کے لیے پولیس کو کچھ نہیں کرنا پڑا۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ لوگ کہتے ہیں، ہر مجرم اپنے پیچھے کوئی نہ کوئی ایسا سراغ ضرور چھوڑ جاتا ہے جس کے سہارے اس کی گرفتاری عمل میں آتی ہے لیکن ایسے مجرم بھی ہوتے ہیں جو اپنے جرم کا اعتراف نہیں کرتے۔ پولیس والے ریمائنڈ لیتے اور جرم قبول کرانے کے لیے ملزموں پر تشدد کی انتہا کر دیتے ہیں لیکن وہ اعتراف جرم کرتے ہی نہیں۔ لیکن ہمارے ساتھ یہ سب نہیں ہوا۔

”گرفتاری کے بعد ہم لوگوں نے ملزموں سے اقبال جرم کرانے کے لیے کوئی کوشش نہیں کی“ افسر نے صحافیوں کے سامنے کہا۔

زدوکوب اور تشدد کو پولیس افسر ”کوشش“ کا نام دے رہا تھا، واقعی پولیس نے ”کوشش“ نہیں کی تھی۔ مستانہ کے قتل سے لے کر گرفتاری اور پھر اعتراف جرم تک میں ایک سمجھ میں نہ آنے والی کشمکش میں تھا۔ جب میں نے مستانہ پر چھلانگ لگا کر اس کا منہ دبایا تھا اس وقت دل میں ایک ہی

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ

(اور ہم نے آپ کا ذکر (سب پر) بلند کر دیا۔ القرآن)

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

پنجمبر آخر الزماں کی سیرت پاک **سیارہ ڈائجسٹ** کی طرف ایک لاثانی پیشکش

عام ایڈیشن: 275 روپے
قیمت: ڈیٹکس ایڈیشن: 450 روپے

عکس سیرت

”میں نے جب یہ کتاب ختم کی تو اونچی آواز میں، جسے میں بھی صاف
سُن سکوں، ایک بار پھر کلمہ پڑھا۔ گویا اپنے آپ سے اپنے مسلمان
ہونے کا اعلان کیا۔“ (عبدالقادر حسن، مشہور صحافی)

یہ ایمان افروز کتاب خود بھی پڑھیے اور اپنے دوستوں کو بھی پڑھائیے

سیارہ ڈائجسٹ - 240 مین مارکیٹ، ریواز گارڈن لاہور

فون: 042-37245412

کیا آپ جانتے ہیں؟

پاکستان دنیا میں سب سے زیادہ رکوں پیدا کرنے والا ملک ہے۔ پاکستان دنیا کا 95 فیصد رکوں پیدا کرتا ہے۔

پاکستان آم پیدا کرنے والا دنیا کا ساتواں بڑا ملک ہے۔

پاکستان دنیا میں سیب پیدا کرنے والا دسواں بڑا ملک ہے۔

پاکستان دنیا میں کپاس پیدا کرنے والا پانچواں بڑا ملک ہے۔

پاکستان دنیا میں کھجور پیدا کرنے والا تیسرا بڑا ملک ہے۔

پاکستان دنیا میں دودھ کی پیداوار کے لحاظ سے پانچواں بڑا ملک ہے۔

کرانے کے لیے کیا کچھ کر سکتے ہیں۔

”تم ایس ایچ او صاحب سے اجازت لے لو اور یہ ابھی سچ بولنے لگے گا، میرا دل کہتا ہے کہ یہ ان لوگوں کا پہلا قتل نہیں ہے۔“

”اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے، وہ خود ہی کہیں گے، دوسرے جرم قبولوانے کے سلسلے میں اس کا ریمائنڈ تو لیا ہی جائے گا پھر دیکھ لیں گے سالے کو کتنے پانی میں ہے۔“

سپاہی اُس وقت حوالات کے دروازے پر کھڑے آپس میں گفتگو کر رہے تھے اور میں یوں بیٹھا تھا جیسے وہ کسی دوسرے کے بارے میں بات چیت کر رہے ہیں۔ شہنشاہ بھی چپ تھا، لیکن اس کے چہرے سے میں نے اندازہ لگایا کہ جیسے وہ کسی گہری سوچ میں گم ہے۔

شام سے پہلے پہلے، میں نے ایک سپاہی سے کہا کہ میں ایس ایس پی صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔

خواہش تھی کہ مستانہ کا دم نکل جائے، پھر جب میرے کہنے پر شہنشاہ نے میرے دیئے ہوئے چاقو سے مستانہ پر وار کرنے شروع کیے اس وقت بھی ہر وار کو میں آخری سمجھ رہا تھا۔ جب مستانہ اس کا ہر وار سمجھ گیا تو پھر میں نے جب چاقو لے کر مستانہ پر وار کرنے شروع کیے تو مجھ پر ایک جنوبی کیفیت طاری تھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں، بس ایک ہی دھن سر پر سوار تھی کہ مستانہ کسی طرح دم توڑ دے۔ اس کیفیت کو میں سوائے جنون کے کوئی اور نام نہیں دے سکتا۔ یہ بھی سچ ہے کہ ہم مستانہ کے گھراسے جان سے مارنے کی نیت سے نہیں گئے تھے کیونکہ اس کے ساتھ ہمارا کوئی تنازع نہیں تھا۔ زمین، جائیداد کا کوئی جھگڑا نہیں تھا، کوئی ناماندانی دشمنی نہیں تھی۔

صحافیوں کے جانے کے بعد تھانے کے کئی سپاہیوں نے ہم سے بے وجہ ہی پوچھ گچھ شروع کر دی ”میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ تمہارا کسی نہ کسی جرائم پیشہ گروہ سے تعلق ہے“ ایک سپاہی نے کہا ”تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا اعتراف کرانے کے لیے ہم تم پر تشدد بھی کر سکتے ہیں۔“

”جب ہم قتل جیسے جرم کا اعتراف کر سکتے ہیں تو کسی جرائم پیشہ گروہ سے تعلق کا اعتراف کرنے میں کیا جاتا ہے۔“

”ارے ان کا تعلق دہشت گردوں سے ہے“ ایک سپاہی نے کہا ”جس بے دردی سے انہوں نے مستانہ کو مارا ہے اس بے دردی کا مظاہرہ عام فرد کر ہی نہیں سکتا۔“

”بتاؤ یہ ٹھیک بہہ رہا ہے؟“ تیسرے سپاہی نے کہا ”ورنہ تم کو معلوم ہی ہے کہ پولیس والے اقبال جرم

”وہ تو ٹھیک ہے صاحب، ہم نے اس کا اعتراف بھی کر لیا ہے، لیکن اب ایک التجا یہ ہے کہ ہمیں ہمارے والدین سے نہ ملائیں، وہ ہم سے ملنے ضرور آئیں گے لیکن ہم ان سے ملنا نہیں چاہتے ان سے ملنے کی ہم میں ہمت نہیں ہے ان کا سامنا کرنا اب ہمارے بس کی بات نہیں۔“

”یہ بہت مشکل کام ہے“ ایس ایس پی نے زیر لب کہا ”وہ ملاقات کے لیے کورٹ سے آرڈر لے کر بھی آسکتے ہیں، ایسے وقت انہیں ٹالنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔“

”پھر صاحب ہمیں جیل بھیج دیں۔“

”وہ تو جیل میں آکر بھی تم لوگوں سے ملاقات کر سکتے ہیں۔“

”وہاں ہم سے جب وہ ملاقات کے لیے آئیں گے، پہلے تو اس وقت تک ہم میں ہمت بھی پیدا ہو جائے گی۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو ہم ملاقات سے انکار کر دیں گے۔“

”تم تو یوں بات کر رہے ہو جیسے تمہیں قاعدے کا قانون سب معلوم ہوں۔“

”کچھ باتیں دوسرے بھی بتا دیتے ہیں سر!“ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ ایس ایس پی نے کہا اور پھر سپاہیوں کو بلا کر کہا کہ ہمیں حوالات میں پہنچا دیں۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اس لیے حوالات میں پہنچ کر ہم لوگ آپس میں یہ طے کرتے رہے کہ والدین کا سامنا تو ہمیں کرنا نہیں ہے اور ہم ان سے ملنے سے صاف انکار کر دیں گے اگر وہ حوالات تک پہنچ بھی گئے تو ہم دیوار کی طرف منہ کر کے بیٹھ جائیں گے، لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ دوسرے

اس سپاہی کی سمجھ میں کچھ تو نہیں آیا کہ میں کیوں ملنا چاہتا ہوں۔ اس لیے اس نے میری طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کندھے اچکائے اور بغیر کچھ کہے آگے بڑھ گیا۔ جب ایک دوسرا سپاہی حوالات کی طرف آیا تو میں نے اس سے بھی کہا۔

”ابے تو کیا کرے گا صاحب سے مل کر؟“ اس سپاہی نے کہا۔

”میں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں“ میں نے کہا اور لمحہ بھر رک کر بولا ”ایک اہم بات“ ایسی بات جو میں کسی دوسرے کے سامنے کرنا نہیں چاہتا۔“

”ٹھیک ہے، بیٹھارہ میں تھانے دار صاحب سے بات کرتا ہوں“ اتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔

اس کے بعد میں نے کسی سے نہیں کہا۔ میرا خیال تھا کہ یہ لوگ میری بات چیت ایس ایس پی سے نہیں کرائیں گے۔ لیکن میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ ایک سپاہی نے حوالات کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا کہ تمہارا بلاوا ہے۔ حوالات کا دروازہ کھلتے ہی ہم لوگ باہر آ گئے۔ پھر وہ سپاہی ہمیں ایس ایچ کے کمرے میں لے گیا۔ وہاں ایس ایس پی بیٹھے تھے۔ ”کیا بات ہے؟“ ایس ایس پی نے بارعب آواز میں کہا ”ایک ذاتی مسئلے پر آپ سے بات کرنا ہے۔“

”ذاتی مسئلے پر؟“ ایس ایس پی نے حیرت سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔“

”ہم لوگ..... معزز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔“

”تو پھر ہم لوگ کیا کریں، جرم تو تم نے بہت گھنٹا کیا ہے انسان کی جان لینا۔“

بچوں میں خود اعتمادی

کیلئے روایتی کھیل

ایک نئی تحقیق میں کہا گیا ہے کہ بچوں میں خود اعتمادی پیدا کرنے کیلئے روایتی کھیلوں کا فروغ ضروری ہے۔ محققین کے مطابق روایتی کھیلوں سے نہ صرف بچے چاق چوبند رہتے ہیں بلکہ ان کا وزن بھی نہیں بڑھتا۔ روایتی کھیلوں میں دلچسپی لینے والے بچے ذہنی اور جسمانی طور پر تندرست رہتے ہیں اور انکے جسم کا مدافعتی نظام بھی بہتر ہوتا ہے، روایتی کھیلوں میں بچہ ایک ٹیم میں اپنا کردار ادا کرنا سیکھتا ہے اور یوں اسے دوسرے لوگوں سے تعلقات بنانے میں بھی آسانی ہوتی ہے اور اسکی خود اعتمادی میں اضافہ ہوتا ہے، جبکہ اسکی لڑکیاں جو اپنا وزن کم کرنے کیلئے ڈائٹنگ کرتی ہیں انہیں خوراک ترک کرنے کے بجائے ورزش اور کھیلوں میں حصہ لینا چاہیے۔

جھوٹ سے بچانو

ایک صاحب پھلی والے کی دکان میں داخل ہوئے اور بولے۔ ”میں پانچ عدد تازہ مچھلیاں خریدوں گا لیکن طریقہ یہ ہوگا کہ میں ذرا دیر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ تم لوگ ایک مچھلی میری طرف پھینکو میں اسے کچھ کروں گا۔“ اتنے تردد کی کیا ضرورت ہے.....؟“ دکان دار نے پریشان ہو کر پوچھا ”دراصل مجھے جھوٹ بولنے کی عادت نہیں ہے میں گھر جا کر کہنا چاہتا ہوں کہ یہ مچھلیاں میں نے پکڑی ہیں۔“ ان صاحب نے جواب دیا۔

”میں نے قتل کیا ہے“ میں نے تیز آواز میں کہا ”ایک صحافی کو میں نے مار دیا۔“

”ابے کیوں جھوٹ بولتا ہے“ ایک داڑھی والے قیدی نے کہا۔ لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ بھی کسی اچھے گھر کا فرد ہے ”یہاں سچ بولنا چاہیے، یہاں تیرا

روز صبح ہی ہمیں معلوم ہوا کہ ہمیں جیل بھیجا جا رہا ہے، لیکن اس کے ساتھ ایک اداس کر دینے والی خبر بھی میرے لیے تھی۔ مجھے تو حیدرآباد جیل بھیجا جا رہا تھا لیکن شہنشاہ کو کراچی بھیجا جا رہا تھا کیونکہ بچوں کی جیل کراچی میں ہے اور پولیس والوں کا خیال تھا کہ وہ ابھی بالغ نہیں ہے۔ اس کی عمر سترہ سال سے زیادہ نہیں ہے اور اس کے پاس شناختی کارڈ بھی نہیں ہے کیونکہ وہ ابھی شناختی کارڈ لینے کے قابل ہی نہیں تھا۔

میں شہنشاہ سے الگ ہونا نہیں چاہتا تھا، ایک جرم ہم نے ساتھ کیا تھا تو سزا بھی ساتھ ہی ایک جیل میں رہ کر اٹھانا چاہتا تھا لیکن آخر ہم دونوں جدا ہو گئے۔ حیدرآباد جیل میں نے طالب علمی کے زمانے میں طلبہ کے ساتھ ایک بار دیکھی تھی، لیکن جب میں قیدی کی حیثیت سے وہاں پہنچا تو یہاں کے رنگ وہ نہیں تھے جو میں دیکھ کر گیا تھا۔ حالانکہ میں کچا قیدی تھا اس لیے مجھے نہ جیل کے کپڑے ملے تھے نہ ٹوپی، لیکن ایک سنگ اور پلیٹ دی گئی تھی تاکہ میں اس جیل کی روٹی کھا سکوں۔ جیل کے اندر داخل ہوتے ہی قیدیوں نے مجھے گھیر لیا۔ سب کے لبوں پر ایک ہی سوال تھا کہ میں کس جرم میں اندر آیا ہوں۔ جب تھوڑی دیر تک میں نے جواب نہیں دیا تو پھر قیدیوں نے تبصرے شروع کر دیئے۔

”جیب کترا معلوم ہوتا ہے۔“

”نہیں سالانہ چور معلوم ہوتا ہے“ دوسرے نے کہا۔

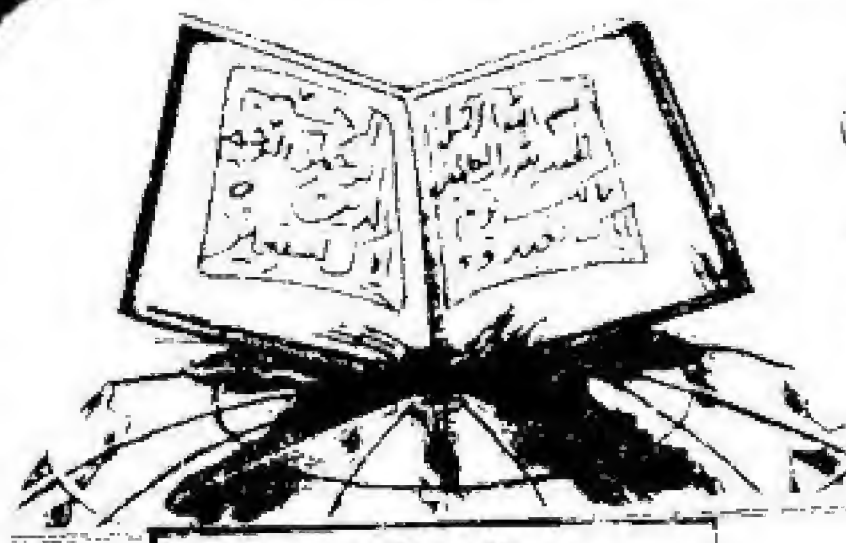
”ارے نہیں یہ کسی ٹکی کو لے کر بھاگا ہوگا تاکہ

اپنی محبوبہ کا سودا کر کے نیش کرے۔“

”ارے نہیں حرامی شراب یا ہیروئن بیچتا ہوگا۔“

”ابے نہیں چہرے سے تو ایسا نہیں لگتا، استاد

معلوم ہوتا ہے اس کا تعلق ضرور کسی.....“



”دُعائے قدیر بدل دیتی ہے“ (حدیث رسول)

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک ایمان افروز پیشکش



دُعائے قدیر

شائع ہو گیا ہے

- متدانی دعائیں۔
- عظیم پیغمبران خدا کی وہ دعائیں جو نسل انسانی کے لیے نجات اور رہایت کا باعث بنیں۔
- خالق کائنات کے آخری نبی محمد رسول اللہ کی تمام مسنونہ دعائیں جو رحمت اللعالمین کی ذات برکات کا مقدس پرتو ہیں۔
- صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کی دعائیں۔
- ائمہ اکرام اور اسلام کے عظیم اور باکمال صوفیائے عظیم کی بابرکات دعائیں۔

جدید دنیا کے گھمبیر اور اعصاب شکن مسائل میں گھرے
پریشان حال انسان کے تمام مسائل کا تشفی آمیز
روحانی اور ایسانی علاج

قیمت 175 روپے

سیارہ ڈائجسٹ: 240 مین مارکیٹ ریواڑ گاؤں لاہور۔ فون: 37245412

”اس سے بہت کچھ ہوگا“ تمہارا وکیل یہ ثابت کرنے کی کوشش کر سکتا ہے کہ قاتلوں نے تمہارے کپڑے پہن کر قتل کیا اور کپڑے وہاں ڈال کر چلے گئے۔“

”یہ بہت مشکل ہے“ کیونکہ ہماری نشان دہی پر پولیس نے مستانہ کے کپڑے اور آلہ قتل برآمد کیا ہے۔“

”وہ ٹھیک ہے“ کورٹ کو غلط راستے پر ڈالنے میں کیا حرج ہے اے سزا ہی کم ہو جائے گی۔“

اس انداز کی باتیں ہیرک میں روز ہی ہو رہی ہیں اور جب رات میں ہیرک میں سوتا ہوں تو یہی سوچتا ہوں کہ جو کچھ میں نے کیا ہے، مجھے اس کی سزا بھگتنا ہے چاہے یہاں بھگت لوں چاہے وہاں بھگت لوں، یہ الگ بات ہے کہ جب میں مستانہ کو قتل کر رہا تھا اس وقت میں اپنے آپ میں نہیں تھا، میرے سر پر ایک جنون سوار تھا۔ مستانہ کو جان سے مار دینے کا جنون۔ شاید میرے لاشعور میں یہ خوف بیٹھ گیا تھا کہ اگر مستانہ بچ گیا تو ہمیں لمبی سزا کرادے گا، کیونکہ وہ صحافی بھی تھا اور اس کی پہنچ بھی بہت تھی، کیونکہ اس کا تعلق سیاسی پارٹیوں سے بھی رہا تھا۔

اب میں ہر قیدی کی رائے توجہ سے سنتا ہوں جیسا کہ میں اس کی رائے پر عمل ضرور کروں گا لیکن میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنا بیان تبدیل نہیں کروں گا۔ چاہے مجھے پھانسی کی سزا ہی کیوں نہ ہو جائے۔ پھانسی کی سزا کے سلسلے میں بھی میرا خیال ہے کہ شاید وہ نہ ملے، عمر قید ہو جائے ایسی صورت میں یہ تو ٹھیک ہے کہ جوانی جیل میں کٹ جائے گی لیکن آخری عمر آزاد فضا میں گزاروں گا۔



کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

”مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے، قتل کیا بس قتل کیا۔“ میں نے کہا۔

ہیرک بند ہونے تک بہت سے قیدیوں کو علم ہو گیا تھا کہ میں خون کر کے جیل آیا ہوں۔ جس ہیرک میں میں بند ہوا تھا، وہاں کے کئی قیدی رات تک میرے دوست ہو گئے اور پھر انہوں نے مجھے بہت تسلی دی کہ میرا کچھ نہیں ہوگا۔ مجھے کورٹ میں بیان تبدیل کر دینا چاہیے۔ کہنا تم نے پولیس کی مار سے بچنے کے لیے جھوٹ بولا تھا، لیکن ان لوگوں کی بات میری سمجھ میں نہ اس وقت آئی تھی اور نہ اب آرہی ہے۔ حالانکہ ہر قیدی جو میرے قریب ہوتا وہ یہی کہتا کہ میں اپنا بیان تبدیل کر دوں۔ جب میں ان سے کہتا کہ میں تمہا نہیں ہوں۔ میرے ساتھ ایک لڑکا بھی ہے اور وہ دوسری جیل میں ہے۔

”تو کیا فرق پڑتا ہے“ ایک قیدی نے کہا ”وہاں کے قیدی بھی اسے مشورہ دے رہے ہوں گے کہ وہ اپنا بیان تبدیل کر لے۔“

”کوئی ضروری تو نہیں کہ جو میں بیان دوں وہ بھی وہی بیان دے“ میں نے کہا۔

”تم دونوں کا پس الگ الگ نہیں چلے گا۔ پیشی پر اسے بھی حیدرآباد پولیس لایا کرے گی، وہاں مشورہ کر کے ایک جیسا بیان دینا۔ بیان تبدیل بھی کر دو گے تو کیس کمزور ہو جائے گا۔ پھر تمہارا چشم دیدہ گواہ کوئی نہیں ہے۔ ثبوت البتہ صرف کپڑے ہیں، لیکن تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ تمہارے کپڑے چوری ہو گئے تھے چونکہ معمولی چوری تھی اس لیے تم نے رپورٹ نہیں کی تھی۔ اگر بڑی چوری ہوتی تو اس کی رپورٹ بھی کی جاتی۔“

”تو اس سے کیا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

میرا کشمیر..... میرا عشق

(وادی نیلم)



فرخ صابری

قسط نمبر 5

دنیا کی تمام بڑی اور زندہ زبانوں کی طرح..... اردو زبان میں بھی تمام اصنافِ سخن و نثر کے علاوہ سفر نامے بھی لکھے گئے۔ بن انشا، بیگم اختر ریاض الدین اور مستنصر حسین تارڑ جیسے سفر نگاروں کی اس صف میں اب فرخ صابری بھی آ شامل ہوئی ہیں۔

فرخ صابری اپنے اچھوتے موضوعات اور منفرد طرز اسلوب کی وجہ سے بین الاقوامی سطح پر پذیرائی پا چکی ہیں۔ افسانہ نویسی، ناول نگاری، کالم نگاری، تذکرہ نویسی اور تحقیق و تنقید میں اپنا ایک مقام اور پہچان رکھنے والی یہ لکھاری مذکورہ بالا تمام اصناف کا دلکش مرقع ”میرا کشمیر..... میرا عشق“ لے کر آئی ہیں۔ جس میں افسانوی ماحول، ناولوں والی منظر کشی، کالم کا سادہ ایجاز و اختصار، تہذیب و تاریخ کا تحقیقی مطالعہ اور سب سے بڑھ کر یادوں کے دلخراش تذکرے ”ہنک رنگ“ دکھاتے ہیں۔

اس سفر نامے میں فرخ کا اسلوب جذب و مستی میں ڈوبا ”اللہ اکبر“ کا کوئی نعرہ مستانہ سا ہے۔ اُس پر بھرپور تاثراتی ٹکڑوں کی پیوند کاری، وسیع ذخیرہ الفاظ کا بر محل و برجستہ استعمال، کمال کا مشاہداتی انداز اور پھر متعلقہ علاقوں پر اٹھائے گئے وہ نثر سوال اس سفر نامے کو منفرد مقام پر لے جاتے ہیں۔ اس تحریر کی نمایاں خوبی شعری و نثری ٹکڑوں کا جا بجا استعمال ہے۔ ساتھیوں کی چھیڑ چھاڑ اور منظر کشی میں انوکھی جزئیات طرازی ایسی خوبیاں ہیں جو محض فرخ کے قلم کی فسوں کاری ہی ہو سکتی ہے۔

ادب، تاریخ اور تہذیب میں رہے اس سرشار سفر نامے کو پڑھ کر، کشمیر جنتِ نظیر جانے کا لطف ہی کچھ ”اور“ ہے۔ دراصل کشمیر مصنفہ کا ایسا موضوع ہے جس پر وہ انہی صفحات پر ناول ”آوارگی“ (قسط وار) افسانے ”بڈھا“ اور ”شاہکار“ کے علاوہ ایک ادبی و تحقیقی مقالہ ”کشمیری افسانہ نگاروں کے ہاں کشمیر کی زندگی“ پیش کر چکی ہیں (اس مقالے کو عالمی سطح پر پذیرائی ملی تھی)۔

اور اب..... فرخ صابری کا ”سیارہ ڈائجسٹ“ کے قارئین کے لیے ”جنت“ سے لایا ہوا اک توشہ خاص ”میرا کشمیر..... میرا عشق!“ پیش خدمت ہے!

(ادارہ)



باب چودہ: - تاؤ بٹ! اور عورت راج

ہمیں انتہائی قلق تھا کہ جو تاؤ بٹ اس سارے دشوار مگر دلکش سفر میں ہمارا مطمع نظر رہا تھا۔ ہمارا اصل 'مطلوب' تھا..... ہماری منزل مقصود تھا۔ یوں لب جو آکر ہاتھوں سے پھسلا جاتا تھا۔

مگر ہم نے صرار نہیں کیا۔ دل کے ارمانوں کو کچلا اور سفر کے رہنماؤں کے عذر یا شاید "عذر لنگ" پر سر جھکا دیا۔ جس سے وہ کافی خوش تھے اور جا بجا ہمارے لیے رطب اللسان تھے اور ہمیں بطور مثال دوسروں کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا۔ "تعاون" تہذیب اور زندہ دلی کے شاہکار لاہوری ہمارے لیے یہ تمغہ حسن کارکردگی برائے دورہ نیلم بھی شاید اناؤنس ہو جاتا۔

مگر ایک خاص گروہ بھند تھا۔

"تاؤ بٹ نہ گئے تو سب پیسے برباد!" نجانے ہم سطحی اور اُتھلے لوگ پیسوں کو کہاں سے لے آتے ہیں۔ یہ کمیٹی اور گھٹیا اصطلاح ہمیں تفریحی و مطالعاتی دوروں میں بھی بار بار سننے کو ملتی تھی خوشحال گھرانوں کے بچے، جب ہر مرحلے پر اپنے اساتذہ کو یا تو دیے گئے پیسوں کا ذکر کر کے تا کافی سہولتوں اور ادھ کپے کپے کھانوں کے طعنے یا اپنی جیب سے روکڑے نکال کر اپنے اضافی خرچے کی دھونس دیتے، فلاں جگہ بس روکیں، فلاں برگر لینا ہے۔ یہاں کوچ روکیں ٹھمکاں پیزا لینا ہے۔ یہاں کیل کی خانماں خراب آبادی میں بھی یہی صورت حال تھی۔ یہاں اس خاص گروہ نے "پریشر گروپ" بنا لیا تھا کہ ہر صورت میں تاؤ بٹ جائیں ہی جائیں۔

"ٹھیک ہے" ہوائی کارروائی میں چودھریوں کی جانب سے بھی حتمی دھمکی دے دی گئی۔ "اپنے بل بوتے یعنی رسک اور جیب کے بل بوتے پر چلے جائیں۔ ہم اتنے بچے روانہ ہو جائیں گے۔ اگر آپ واپس آگئے تو ٹھیک ورنہ اپنے بل بوتے پر واپس اسلام آباد چلے جائے گا۔"

"ٹھیک ہے، پریشر گروپ بھی جان ہتھیلی پر رکھ کر یہ گرما گرم مذاکراتی ٹاکرہ کر رہا تھا۔" آپ جیپوں کے پیسے بچا کر بے ایمانی اور دھوکا دہی کا مظاہرہ کریں، ہم تاؤ بٹ جا کر دکھائیں گے۔

"تاؤ بٹ! زندہ باد" نعرہ لگا۔

"تایا بٹ!" کسی پنجابی کے ہاتھوں نعرہ بگڑا "زندہ باد" اور پھر جب تایا بٹ کے عاشقین رنجت سفر باندھ رہے تھے تو اصل شائقین بلکہ عاشقین منہ بسورے، دل مسوس کر سوائے شاردہ کو پر تول رہے تھے۔

بعد ازاں..... جب وہ لوگ لوٹ کر آئے تو تاؤ بٹ کی ایسی تصویر کشی کی کہ بہت سے جان گئے کہ اُن کا بھلا ہی

ہو گیا جبکہ چند کے نزدیک وہاں بڑی زبردست کشش تھی اور وہ تھی وہاں کا ”عورت سماج“ یا شاید ”عورت راج“..... تاؤ بٹ کہ جہاں نیلیم اپنے وسیع ترین پاٹ اور کئی شاخوں میں بٹے دھاروں کے ساتھ پاکستان میں داخل ہوتا ہے۔ اپنی دریا دلی اور خوبصورتی کے نکتہ عروج پر ہوتا ہے..... وہاں اس دنیا کی قدیم ترین تہذیب سانس لیتی ہے۔ جب جنگلوں میں مارے مارے پھرنے والے جانوروں جیسے مرد انسان عورت کی وجہ سے ”آبادی“ کا مفہوم جانے اور لور لور پھرنے والوں انسانوں کو ”مرکز“ ملا تو وہ تہذیب آشنا ہو گئے تھے تب عورت کا ہی سماج تھا۔ اُس کا راج تھا۔ وہ سماجیات اور آبادیات کا مضبوط استعارہ تھی۔ مرد، بیل، ڈھور ڈنگر اور اُن کی مدد سے پھر کھیتی باڑی۔ ایک طرف بیل اور دوسری طرف مرد کو جوت لیتی تھی۔ مذکورہ بالا تمام ”اشیاء“ اس کی ملکیت تھیں اور وہ اناج اُگانے اور اُسے کھیتی باڑی تک لے جانے کی موجد تھی۔

”تاؤ بٹ“..... آج بھی اُس تصور کی تصویر دکش ہے۔ ہزار ہا برس پرانا یہ سماجی نظام ہلکی سی رد و قدح کے ساتھ وہاں رائج ہے۔ گوکیل میں اس نظام کی باقیات اور موجود تھیں۔ یہاں تہاں سب امور زیادہ تر عورتیں ہی انجام دے رہی تھیں..... مگر یہ نظام اپنی تمام لطافتوں اور کثافتوں کے ساتھ تاؤ بٹ میں موجود ہے۔ جہاں قدرت کے تمام قدرتی رنگ تو موجود ہیں مگر ”وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ“ کچھ زیادہ ہے۔ یہ رنگ ڈھنگ یوں کچھ اور رنگ جھاتے ہیں کہ وہ دنیا کے اس بلند ترین ہمالیاتی سلسلے کی گود میں تمام کے تمام گھریلو، معاشی اور سماجی امور انجام دیتی ہے۔ ”یار! میں بھی تو تاؤ بٹ کی پچھڑی ہوئی کوئی کونج تو نہیں؟“ سنتے ہی میں کر لائی تھی ”یہ سارے کام تو میں بھی لاہور میں رہ کر، کر رہی ہوں۔“

”اور میں بھی“ ایک اور زنانہ شکوفہ پھوٹا۔ ”اور سوال تو یہ ہے کہ آخر کون نہیں؟“ میرا فلسفہ جاری رہا۔ ”کون ورکنگ لیڈی ان امور سے مبرا ہے؟“۔ ”خیر..... ہمیں تو کتے نے کاٹا تھا کہ ہم نے خود اکلے میں سردے لیا اور ”آزادی نسواں“ کی علمبردار بن گئی ہیں۔ کس نے کہا.....!“

”کسی نے نہیں کہا“ ایک حتمی دلیل آئی تھی ”آج کے بدلتے دور میں یہ ہماری ذمہ داری بن گئی ہے۔ ہم شوق سے نہیں، ذمہ داری سے باہر نکلتے ہیں اور اس تلخ زندگی کی کڑواہٹ سہتے ہیں۔“

خیر تاؤ بٹ میں تو یہ سب کچھ، صدیوں سے جوں کا توں چل رہا ہے کسی زمانے میں یہاں رانی کی ایک فلم ”عورت راج“ سینماؤں میں لگی تو ایک کھڑکی توڑ رش لیا تھا اور دوسری طرف مرد مار معاشرے نے اس کی خوب کھڑکیاں توڑیں۔ پتھراؤ کیا تھا..... اور بالآخر ”عورت راج“ کو سینماؤں سے اُتار لیا گیا۔

مگر تاؤ بٹ میں عورت راج ہے۔ ہاں صدیوں زدہ اور جدید دور کے عورت سماج میں واضح فرق آ گیا ہے۔ اب تاؤ بٹ کے مردوں کے ہاتھوں میں موبائل فون ہیں اور بوڑھی عورتیں ”انٹرنیٹ“ کی بات کرتی ہیں۔ ہوا بدل گئی ہے اور ہوا لگ گئی ہے۔

مگر تن آسانی اور اہل پسندی کے اپنے مزے ہیں۔ سو مرد اپنے سماجی استحقاق کو نہیں چھوڑتے اور ہاتھ پاؤں توڑ کر چار پائیاں توڑتے رہتے ہیں۔

”پارلی ٹائم لائف اسٹائل“

جیسے یہاں لاہور میں جھکیوں میں، مردوں کی زندگی بڑی مست ہے۔ اپنے ہاتھ پاؤں توڑ کر، چارپائیاں توڑو۔ کام کرنے والی ماں، بہن، بیٹی، بیوی سے پیسوں کو بنو رو اور نہ دیں تو اُن کی ہڈیاں توڑ دو۔ البتہ..... فریضہ اُن کا بس ایک ہے۔ ذمہ داری بس ایک..... بچے پیدا کرنے کا جانوروں جیسا کوئی ”غیر انسانی وسیلہ قدرت“ بننے کا فرض۔

ایسے ”ذمہ دار مرد“ ہمارے اس گنگا جمنی معاشرے میں کچھ زیادہ نہیں ہوتے جارہے؟ تو کیا تاؤبٹ کا نظام زندگی..... سارے سماج پر پھیل جائے گا۔

یہ وہ تاؤبٹ تھا جو میرے اُس سماجی و تہذیبی ناول ”آوارگی“ کا کلائمکس مقام تھا۔ اُس ناول میں مرکزی کردار میر طارق مصطفیٰ جو حال کا استعارہ تھا اور اپنے ماضی، اپنے آباؤ اجداد کی تہذیبی جڑیں کشمیر میں تلاشتا تھا۔ اس ناول میں رنجیت سنگھ کی ”رجیم“ (عہد حکومت) کی جڑیں بھی تلاشی گئی ہیں کہ جب یہ بے مثال خطہ کشمیر اور پنجاب کے درمیان حد نہ باٹتا تھا..... ناول ”آوارگی“ کئی ماہ تک پاکستان کے مشہور ڈائجسٹ ”سیارہ“ میں چھپتا رہا تھا۔ یہ 2007-08 کی بات ہے۔ اس رام کہانی کا یہاں خاص مقصد یہ ہے کہ ”تاؤبٹ“ میری اس تہذیبی تلاش کی ”حتمی منزل“ ہی نہ تھا بلکہ بطور ناول نگار اس ناول، اس کے مرکزی خیال نے اس کے کرداروں نے میری رگوں سے جنم لیا تھا۔

یہ تلاش میرے خود کے اندر ہلکورے لیتی تھی تو ایسی تشنگی میں کیل سے ہی لوٹ جانا، میرے کتنے ہی خوابوں کا خون تھا؟

میں نے دل گرفتہ انداز میں تمام سیاحین پر نظر ڈالی۔ خصوصاً لاہوری پارٹی پر..... ہم میں سے کتنے ہیں؟ جو کبھی لوٹ کر یہاں آئیں گے۔

اور کبھی آئیں بھی تو ان مقامات پر انہی لوگوں کے ساتھ ہوں گے؟ کبھی نہیں..... ہرگز نہیں۔ کم از کم دوسرے تو ایسے تھے جو شاید ہی کبھی یہاں آئیں۔ ایک تو ہماری چھینا مینا جوڑی۔ جو شاید ہی اب کبھی لاہوری مہم جوؤں کی ہمرکاب بنیں۔ انہیں اب اپنے اپنے پیاؤں کے گھر سدھارنا تھا اور وہ گھر لاکھ لاکھ دیں۔ بن بیاہی زندگی کی بے فکری کا سکھ کبھی نہیں دیتے..... اور مہم امید کا دوسرا سرا میں تھی۔ جو عمر کے اس حصے کو آگے لگی تھی اور جسے ذہنی انتشار نے یوں توڑ پھوڑ دیا تھا اور جس سے آرٹھرائٹس کے سبب جوڑوں کا عذاب اب سنبھالے نہیں سنبھلتا تھا (میں نظاروں میں کھڑی ہو کر، انہیں چھونے کی سکت نہ پاتی تھی، جیسے کرٹل آبشار پر ہوا تھا۔ جیسے نیلم کنارے ’آسن پتھروں‘ پہ میں اسی اُن چھوٹی کیفیت میں رہی۔ جیسے شوٹرنالے کی وہ سیڑھیاں میں نہ اتر سکی تھی۔) جس پر سعدیہ طاہرہ، ثمن اور نادیا یہ قلائعیں بھرتی اُتر گئی تھیں اور شہزادی نے اپنے دلکش پوز کے ساتھ ’خصوصی تصویریں‘ اُتروائیں تھیں۔

میں ان منظروں اور راحتوں کو نظروں سے چھوٹی تھی مگر اکلیاں اُن چھوٹے کرب سہتی تھیں۔ سوئی خوب جانتی تھی کہ یہ ”جہان خوش نما“..... جس میں زندگی کی قلقاریاں ہیں ”مجھ پہ اپنے دروازے بند کرنے کو ہے۔ تو کیل سے وقت رخصت میں دل گرفتہ تھی اور منظروں کو یوں نکلتی تھی جیسے کوئی ماں اپنے اکلوتے بیٹے کو محاذ پر بھیجتے وقت

سیارہ ڈائجسٹ کا عظیم الشان نمبر



رسول ﷺ نمبر

کانپیا ایڈیشن ضروری تراجم و اضافہ کے ساتھ شائع ہو گیا ہے

- ◀ سیرت پاک پر ایک جامع دستاویز ▶
- ◀ حسین و جمیل سرورق ▶
- ◀ بے شمار نعتوں کا انتخاب ▶
- ◀ عکسی طباعت ▶
- ◀ ہر جلد کے پانچ سو صفحات ▶
- ◀ 2 جلدوں پر مشتمل ▶
- ◀ دنیائے اسلام کے اہل علم کے رشحاتِ قلم کا مجموعہ ▶



قارئین حضرات اپنے آرڈر سے جلد مطلع فرمائیں

منگوانے کا پتہ

سیارہ ڈائجسٹ 240 مین مارکیٹ ریواڑ گارڈن لاہور۔ فون: 37245412

باب پندرہ:- کیمسٹری ٹیچر کی مسٹری

مگر ہماری ”سیاحتی پارٹی“ کے دو لوگ اپنے عروج پر تھے اور حد سے زیادہ سرور۔

ایک تو ہماری شہزادی جمیلہ اور دوسری سرور ونگ کی ”مائی باپ“ سعدیہ سرور۔

سعدیہ سرور نے جتنا شور اس ٹرپ کی خاطر مچا رکھا تھا اس کا عشر عشر بھی گزشتہ دنوں کہیں نظر نہ آیا تھا۔ ان دو، ڈھائی دنوں میں وہ ممتا اور خوف میں اس قدر دبک کر بیٹھی تھی اور اپنے تمام سرور ونگ کو بھی حسب ضرورت ٹینگ اور خوف بانٹ رہی تھی۔ اب کیفیت کا خول توڑ کر باہر نکل رہی تھی۔ اپریلیم میں اُس نے اس تڑپے خول سے ہلکا سا سر باہر نکال کر ”جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا“ اور پھر بقیہ رستہ بھگتے میں مصروف ہو گئی تھی۔

اب پتہ نہیں یہ کیل کا کمال تھا یا کرشل آبشار کے معجزوں کا اثر۔ وہ قدرے خوش اور کھلی کھلی پھر رہی تھی اور اُس پر یہ کہ کھلے گلاب کا اپہ بھی پہن لیا تھا بلکہ ”زیب تن“ کیا تھا کیونکہ وہ اُسے زیب دے رہا تھا۔ اور ہم چاروں کا کیل، شاردا، تخیم کلر، گلاب اور گلابی ہی تھا اور اب وہ بڑھ چڑھ کر تصویروں میں اپنا حصہ وصول کر رہی تھی بلکہ بعض دفعہ تو خراج بھی لیتی کہ میری بھین دا حصہ وی دیو۔

الغرض..... اُسے کیل گاؤں کی مسموم فضائیں راس آگئی تھیں۔

”سعدیہ! سارا رستہ تو، ٹو نے ہمارا ”تراہ کاڈ“ دیا تھا؟“ گلابی اُردو پنجابی ہمارا اس مہم کا خصوصی ماٹو یا سلوگن تھا۔ وہ خوب کھل کر ہنسی اور پھر وضاحت پر اتر آئی ”وہ مس فرخ! میں بہت ڈر گئی تھی، پورا رستہ سہم کر بیٹھی رہی ہوں۔“

”اس بریکنگ نیوز کا شکریہ!“ ہم نے چھیڑا ”ہم نے یہ مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ پہاڑوں کی خوبصورتی بھی اور تمہارا پیلا پنچ چہرہ بھی۔ ایک طرف نادیدہ کو قلاوے میں بھر کر کندھے سے لگا رکھا تھا تو دوسری طرف دونوں برادران خورد کو TANG پلا پلا کر کئی ریکارڈ بنا چکی ہو۔“

وہ کھل کر ہنستی چلی گئی۔ وہ ہمیشہ ایسے ہی ہنستی تھی اور تروتازہ حلیے میں تازہ بھونکنے کی طرح یوں شاف روم میں داخل ہوا کرتی تھی کہ جیسے قدرت نے اسے دنیا کو شاداب رکھنے کی ساری ذمہ داری دے رکھی ہو۔ مجھے ہمیشہ اس کی انٹری سے پہلے ہی ہوائیں خبر دینے آ جاتیں کہ مس فرخ! سعدیہ آرہی ہے۔

یہ وہی سعدیہ سرور تھی جس نے سیاحتی مہم کے اک نازک موڑ پر، بڑے دہنگ انداز میں کہا دیا تھا۔

”اگر کوئی بھی نہ گیا تو بھی میں اکیلے ہی چلی جاؤں گی“ اور اب یہ بلند وبالا ہیبت ناک دیو ہیکل پہاڑ تھے اور اس کے اونچے نیچے راستے کیا وہ ناموافق سڑک..... سو سعدیہ کا پتہ پانی ہوتا رہا کہ ایک تو وہ سرور ونگ کے جبران ساتھ لے کر ساری ذمہ داری ساتھ لے آئی تھی، اپنے رستے مظفر آباد کے بعد، نیلیم میں داخل ہوتے ہی باقی دنیا سے رابطے کٹ گئے تھے۔

”اور کٹے رابطوں میں باہمی ذمہ داریاں..... ہمیشہ بڑھ جاتی ہیں وہ بھی بڑھی ذمہ داریوں کے گھیراؤ میں تھی۔“

اُس پر سرور ونگ کی بڑی باجی..... گویا بنی بنا کی جھوٹی امی۔ سوکیل گاؤں میں جھوٹی امی نے حفاظتی ونگ کھول کر، اپنے سب بچوں کو آزاد کر دیا تھا اور وہ خود مختار سے ادھر ادھر لطف اندوز ہو رہے تھے۔

نہن مسعود اور نادیہ سرور کی منظر کش فطرت نے میل کھا کر اپنی چھینا مینا جوڑی بنالی تھی۔ سعد رحمان اور حسن سرور ادھر ادھر پہاڑوں کی کھوج میں کھوؤں کے اندر کی تصویریں بنا رہے تھے۔ گھوڑوں سے راہ و رسم بڑھا رہے تھے۔ پہاڑی کھیتوں میں دھما چوڑی جاری تھی اور ہم انہیں ریسٹ ہاؤس کی کھڑکیوں سے دیکھ دیکھ کر لوٹ پوٹ ہوتے۔ حسن سرور، اس ونگ کا ذمہ دار اور سنجیدہ نوجوان، بڑی ذمہ داری کے ساتھ ہم سب کے ”ساتھ“ تھا۔

اس لیے..... اب سعد یہ سرور بھی بکریوں اور پہاڑی ٹوؤں کے ساتھ اپنی تصویریں بنوا رہی تھی اور بتیں دانتوں کے ساتھ خوش نظر آتی تھی۔

یہی وہ جادوانی مسکراہٹ تھی جو ہمیشہ مجھے انسپائر کرتی آئی تھی۔ یہ مسکراہٹ اس کے چہرے کا جزو لاینفک تھی۔ اور اک گزشتہ ٹرپ میں بھی، اسی مسکراہٹ کے ساتھ، وہ پتے پتے، بوٹے بوٹے یہاں تک ”مٹک پوری ٹریک“ (گلیات مری) کی برف باری سے لطف اندوز ہوتی تھی۔

مگر سعد یہ سے میری ”میچنگ“ کی کئی وجوہات تھیں۔ عمروں کے ڈبل تفاوت کے باوجود۔

وہ سائنس ٹیچر ہوتے ہوئے بھی اور غیر ادبی نسل کی نمائندہ ہونے کے باوجود بہت ہی اعلیٰ ”ادبی ذوق“ کی مالک تھی۔ کیمسٹری نوجوان ٹیچر کی اس ”ادب شناسی“ پر ہمیشہ میں حیران ہی ہوئی۔ ادب سے بھی زیادہ اُس نے مذہب اور اخلاقیات کا وسیع مطالعہ کر رکھا ہے اور پھر غضب کی یادداشت، جب حوالے دیتی اور اقوال سناتی تو میں ہو کتابی کیڑا ہوں اور کتابیں ہی میرا اوڑھونا بچھونا ہیں اُس سے بہت متاثر ہوئی۔

جب وہ کبھی، عمروں کے تفاوت کے باوجود، میرے پاس آتی تھی تو دل چاہتا کہ وہ بولتی رہے اور میں سنا کروں۔ ہم خوب مکمل کر باتیں کرتے، ذہنوں کے درمیان کوئی خلا کوئی دراڑ نہ تھی۔

یہاں تک کہ ہم دل کی باتیں بھی کر لینے۔ چنی الجھاؤ بھی سلجھانے کی کوشش کرتے۔ کبھی کبھار ذاتی مسائل بھی زیر بحث لے آتے اور ہمیشہ اس باہمی رفاقت سے لطف اندوز ہوتے۔

الغرض..... اس کیمسٹری کی ٹیچر کے ساتھ، میری ”کیمسٹری“ خوب بھی تھی اور زبردست بھی۔ اور پہاڑی راستوں پر بھی عب اتفاق ہوا اور قدرت کی اک ”مسٹری“ ہمیں حیران کر رہی تھی۔ شاردہ سے کیل جاتے ہوئے وہ منظر دیکھا۔ جب کوئی منظر چھوڑنے والا نہیں تھا۔ سامنے رتی گلی کی پہاڑیاں، سنہری تاج لیے اپنی جانب بلا تھیں کہ وادی نیلم اور وادی کاغان کی یہ شہزادیاں حسن، بے مثال کی مالک تھیں۔ گنگنائی وادیاں ’بھرا‘ میں کھاتا اڑدھا دریا۔ ببا دیکھو اور کیا چھوڑو؟ ”وہ دیکھو“ کسی نے نعرہ لگایا ”سب چھوڑو، بس ادھر دیکھو“۔

کیا دیکھتے ہیں، جوان کی پندرہ تاریخ اور برف جی ایک آبشار..... ایک رُکی ہوئی آبشار۔ جس میں برف جی تو تھی مگر روکی کے کالوں کی طرح تھی اور پھر جا بجاتی۔ تیز کوچ سے یہ نظارہ کرتے گزرے اور حسرت بھری نظروں

سے پیچھے دیکھتے رہے کہ لوٹیں گے تو یہ برف پگھل چکی ہوگی۔

ایک دن بعد..... ہم لوٹے تو منظر ہوں کاٹوں تھا۔ برف ویسی ہی تھی اور ہم اس ”راز قدرت“ پر حیراں۔ یہاں یہ سجدیہ سرور ہی تھی جو دور کی کوڑی لائی اور اپنی کیمسٹری کی زبان میں ”مسٹری“ حل کی تھی۔

”در اصل یہ کیمائیم ہے، چونا..... پہاڑوں سے چونا ملا بریلا پانی بہتا ہے کیونکہ ان پہاڑوں میں چونا پایا جاتا ہے۔ پانی تو بہہ کر نیلم برد ہوا اور کیمائیم اس آبشاری راستے پہ چپکا پڑا ہے۔“

”یہ دس دن بعد بھی..... یونہی ملے گا“ نادیہ سرور بولی جس کی ”استادی“ یہ تھی کہ وہ کیمسٹری ٹیچر ہونے کے ساتھ ساتھ علم نباتات میں بھی پڑھ چکی تھی۔ اور اس میں باقاعدہ ماسٹر ڈگری لے رکھی تھی..... سو اس ٹرپ میں، ابھی میری اور نادیہ کی ”باہمی کیمسٹری“ تو اتنی عمدہ نہ ہوئی تھی۔ البتہ نباتات میں اُس کا گم ہونا اور کشمیر کے نباتاتی حسن نہار نے کافن، اُس میں کمال تھا۔ تبھی تو اپر نیلم کی سدرہ اور کیل کی کوگو (کول) کو دیکھ کر یوں گود لے لیتی تھی جیسے ”گڈ ڈاؤں میں لعل“ تلاش کر لیے ہوں۔

تلاش اور کھوج کے اس سفر میں سرور سسٹمز نادیہ اور سجدیہ نے مجھے دو انمول پتھر تحفہ نذر کیے جو نیلم کنارے سے، وہ جوہریوں کی طرح پرکھ کر لائی تھیں۔ ایک میں کیمائیم واضح تھا اور دوسرے میں آئرن۔ وہ دونوں پتھر میرے عجائبات میں بمعہ تاریخ و محبت محفوظ ہو گئے۔

کیونکہ وہ میری محبت میں لائے گئے تھے۔ جن مناظر اور پتھروں کو میں چھو نہیں پائی تھی اب تک ان پتھروں کی بدولت، کئی بار چھو چکی ہوں۔

ان..... ان چھو۔ نے محسوسات کو بھی دل کی گہرائیوں سے چھو لینے والی نادیہ سرور، پتہ نہیں کیوں کہتی ہے کہ وہ اچھے لوگوں کو اپنی زندگی سے گنوا لیتی ہے؟ میرے نزدیک یہ ناممکن بات ہے۔

باب سولہ :- سپات آف دی ٹرپ

اپر نیلم سے تاؤبٹ روانہ ہوئے تھے تو کیل جاتے ہوئے شاردہ کو ہوائی نظروں سے دیکھا تھا اور بالائی بالائی گزر گئے تھے یہاں کی فضاؤں میں کچھ تھا جو من کو گرفت میں لیتا تھا اور آنکھوں کو تراوٹ۔ اسی لیے تو یہاں سے گزرتے، دل بچھ سے گئے۔

اور اب تاؤبٹ کے سلسلے میں کچھ بچھے تو چودھری قائدین نے ”شارداروٹن“ کی نوید سنائی تھی اور ہمارے بچھے ارمان پھر تر وزاں تھے۔

مگر بنجر ویران اور افلاس گزیدہ کیل کے ادھر ادھر چھپے نظارے بھی آنکھوں میں یوں کھب سے گئے تھے کہ پاؤں کی زنجیر ہوتے تھے اور نظریں ہٹ ہٹ کر پلٹتی تھیں۔

واپسی پر وہی جنت نظیر نظارے، کرشل آبشار اور بہت سی آبشاریں اور ٹوٹی پھوٹی سڑک کی دریا کو لڑھکتی عمودی ڈھلوانیں اور اُن میں سے گزرتے گجروں کے قافلے۔ گزشتہ دنوں میں ہم ایسے کئی قافلے دیکھ چکے تھے۔ پہاڑی بکروں کے یہ طویل ریوڑ۔ اس دفعہ میری سیٹ دریا کے رخ پر تھی اور ایک جگہ بہت بڑا ریوڑ درمیان میں تھا اور

کوچ تھی کہ رینگ رہی تھی مہادا کوئی بکرا بکری یا بچہ کوچ کے نیچے نہ آجائے۔ اب ایک دفعہ جو، میں نے اچک کر نیچے جھانکا تو میری سٹی کم میری طرف کے دونوں پہلے نظر نہ آتے اور نہ ہی سڑک اور ڈھلوان توڑے درجے کی بجائے 110 ڈگری زاویے کو مڑی بلکہ اندر دھنسی ہوئی تھی۔

گویا آدمی بس فضاؤں میں معلق تھی اور ٹائر شاید کبھی پورے اور کبھی آدھے ادھورے سڑک پر تھے۔ اس پر غضب یہ کہ گجروں کے میلوں لے ”بکرا قافلے“ گزرتے تھے اور بکرے اس قدر ماہرانہ انداز میں قلائیں بھرتے، پھدکتے اچھلتے یوں گزرتے جیسے یہ ہل صراط نہ ہولا ہوڑ اسلام آباد موٹروے ہو..... ایک دفعہ تو میری چھین نکل گئیں۔ بکرا پیسے سے بچا اور نیچے لڑھک گیا مگر پھر اگلے ہی لمحے پھدک کر دوبارہ کوچ کے متوازی بھاگ کر، اپنے ریوڑ سے جا ملا۔

گجروں کے قافلے سارا سیزن اسی طرح چراگا ہوں کی تلاش میں اترتے چڑھتے سرگرداں رہتے ہیں۔ کیل سے شاردہ کا فاصلہ محض انیس کلومیٹر ہے جبکہ مظفر آباد یہاں سے 136 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ جونہی ہم شاردہ پہنچے اس کی ٹھنڈی مگر شفیق فضاؤں نے آگے بڑھ کر جیسے کوئی انوکھا ”سواگت“ کیا۔ چودھری برادران رہائش کا بندوبست کرنے نکل گئے اور ہم بازار میں کھڑے تھے۔ سو کوچ میں بیٹھے بیٹھے خرید و فروخت کے، کچھ امور یاد آگئے۔ بتایا گیا کہ حسن اچھا فروٹ خرید لیتا ہے اور مناسب داموں میں۔ وہ فروٹ یعنی آم لایا جو واقعی عمدہ تھے مگر دام بھی عمدہ ہی تھے۔ ہاں اس اعتبار سے قابل برداشت تھے کہ پنجاب اور خصوصاً لاہور جیسے معیاری اور معیار فروخت پر آم مل گئے۔ اور یوں نیلم کنارے ہماری ”مینگو پارٹی“ کا ابتدائی اہم مرحلہ ترتیب پا گیا۔

شاردہ کا یہ بازار کیل کے بازار سے قدرے بڑا اور بارونق تھا۔ اس لیے نادیدہ سرور کی جو شاپنگ کیل میں تشنہ رہ گئی تھی وہ اسے پورا کرنے کے لیے اتر گئی۔ ظاہر ہے چھینا کے ساتھ مینا نے بھی اترنا تھا۔ سوٹن مسعود یہ کہہ کر اس کے ہمرکاب ہوئی کہ شاید یہاں کشمیر کی کوئی ”سوغات“ چنزل جائے۔ جسے وہ اپنی سہیلیوں کے لیے لے جاسکے۔ واپس آئیں، تو مایوس تھیں، مگر چہروں کی حد تک۔ البتہ ہاتھوں میں کچھ نہ کچھ تھا۔ جنہیں سکارف کہا جا رہا تھا۔ اور وہ سکارف کشمیری نہیں ”کشمیری سفر“ کی سوغات سمجھ کر لے لیے تھے۔ ورنہ لاہور کی ہر مارکیٹ ایسے سکارفوں سے بھری پڑی تھی۔

رہائش کا بندوبست ہو گیا۔ اسی بازار میں ’لب سڑک‘ وہ ریسٹ ہاؤس نما ریسٹورنٹ تھا مگر وہاں ہم اترے نہیں البتہ کوچز نیچے اترتی چلی گئیں۔ بالکل نیلم کے کنارے پر جہاں خیموں کی عجب بہار تھی۔ پورا ایک ’کینوس سٹی‘ آباد تھا۔ جیسے اور تاحہ نظر ایسے کئی کیمپ تھے اور دوسرا شہر بھی نیلم کے کنارے کنارے بھی آباد تھا۔ نیلم اس پوری آبادی کو بڑی محبت سے اپنی گود میں لے آیا تھا اور یہاں بھی اگرچہ وہ تھا تو نیلم ہی مگر قدرے پرسکون۔ شاردہ سطح سمندر سے 6499 فٹ کی بلندی میں ہے اور طمانیت و سکون کی تمام تر حلاوت کے ساتھ..... یہاں تک کہ نیلم جیسا منہ زور دریا بھی یہاں مودب ہو کر، دبے پاؤں گزرتا ہے۔ وہ انسانوں کے درمیان آ بیٹھتا ہے کہ آؤ کچھ میری سنو کچھ اپنی سناؤ۔

دریاؤں سے گفتگو کی بھی اک اپنی زبان ہے۔ میں نے اس 'خوبصورت زبان' کا کھوج اُس زمانے میں لگا لیا تھا جب ابھی طالب علم تھی۔ اُس لڑکپن میں کتاب 'سدا حارتھ' ہاتھ لگ گئی۔ کیا غضب کی تاثراتی کتاب تھی۔ جو کپل دیو عرف شہزادہ سدا حارتھ المعروف مہاتما کی متلاشی نروان کھوج سے خیال لے کر علامتی انداز میں لکھی گئی تھی۔

اور جس کا مرکزی کردار اسی طرح سکون اور نروان کی تلاش میں جنگل، جھیلوں، جھرنوں اور دریاؤں کے ساتھ ساتھ بھٹکتا پھرتا تھا۔ فطرت سے گفتگو کرتا تھا۔

اور پھر دریا کنارے اُس جمائے بیٹھ گیا۔ وہ دریا سے گفتگو کرتا تھا اور دریا اس کی دلی زبان سمجھتا تھا کیونکہ اس گفتگو میں وہ محض سائے ہوتا تھا "A good listener"۔ یہ محض 'سماعت' رکھتا۔ دوسروں کو بس سننا، اپنے افلاطونی مشوروں کے بغیر سننا۔ دوسروں کو اہمیت دینا اور اپنا آپ اور اپنی ہی بات دوسروں پر نہ ٹھونسنے نے 'سدا حارتھ' نام کی کتاب سے ہی سیکھا۔

اور جو سدا حارتھ تھا..... اصل سدا حارتھ یعنی 'بڈھا'..... وہ واقعی مہاتما تھا۔ شاردہ آتے ہی اُس کی روح، اُس کا جھایا سن اس کا پایا ہوا وہ نور محسوس ہوتا تھا۔ شانتی، امن و آتش۔ دلوں پر کنڈاں اس کی تعلیمات..... یہاں سب کچھ کتنا جاذب نظر تھا؟ میرے ابا جان بچپن میں مجھے بتاتے تھے (جب ہم باپ بیٹی ڈھیروں گفتگو کرتے تھے) کہ بعض محققین کے نزدیک بدھا بھی کوئی پیامبر تھے۔ قرآن مجید میں جو ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کا کہا گیا ہے تو کیا پتہ کون پیغمبر تھا۔

یہ تو اُن کے انے والے تھے جنہوں نے اُن کے بت بنائے یا انہیں اوتار سمجھا یہاں تک کہ انہیں خدا بھی مان لیا اور ہم بھی اس شاردہ گاؤں کو مان گئے تھے۔ اُس عظیم صانع کی عظیم کاری کے کتنے سکون کے ساتھ ہر سو پھیلی ہوئی تھی اور اس خیمہ بستی کی اپنی اک کشش تھی۔

حالانکہ 'کینوس سٹی' کی اپنی کوئی غلش ہے وہ کینوس سٹی جو شمالی علاقہ جات میں تب بستی ہیں جب یہاں فوجی آپریشن ہوتے ہیں تہی آبادی، خانماں خراب، ہو کر ان میں بستی ہے اور غربت و مصائب کے پنے انہیں مزید جکڑ لیتے ہیں۔

پھر انہی علاقوں میں اکتوبر 2005ء کے بعد..... جو 'کینوس سٹی' آباد ہوئے اُن کے آس پاس کیسی کیسی دلخراش داستانوں نے جنم لیا؟ کن کے مصائب دکھائے گئے اور کل دنیا سے بھیجی جانے والی امداد ڈکار کون گئے؟

اور پھر وہ اک کینوس سٹی..... جہاں انہی خیمہ بستوں میں نسلیں پیدا ہوتی ہیں اور اپنے بچپن، لڑکپن، نوجوانی، جوانی، ادھیڑی عمر اور کہیں خال خال بڑھاپے میں، قربان ہو جاتی ہیں۔ جیسے آج کل GAZA میں..... سے زیادہ "غزہ کی پٹی" کہہ لیا جاتا ہے۔ یہ مقدس سرزمین جو بھی فلسطین تھی اور جس کی کمر میں اسرائیل کا چہرا مگو نہا گیا۔

برسوں سے مدقوت سے مدقوت نہ ہوتا جا رہا ہے۔ یورپ، افریقہ اور ایشیاء کے سنگم پر یہ اہم ترین فلسطین،

ایمان افروز..... عقل پرور..... عمل آفرین

سیارہ ڈائجسٹ
کا عظیم الشان

قارئین کے اصرار
اور مانگ کے تحت دس
سال کے بعد نیا ایڈیشن
شائع ہو رہا ہے۔

قرآن نمبر

- ☆..... رائگی اہمیت اور افادیت کا حامل ☆..... ایک متاع بے بہا
 - ☆..... ایک دستاویز ☆..... اعلیٰ رنگین طباعت
 - ☆..... ضخامت 1500 صفحات ☆..... تین جلدوں میں
- اپنی خدمات، مصنوعات کا اشتہار جلد جاری فرمائیں

مکمل
قیمت 525/-

داشتر ہارات دینے کی آخری تاریخ
30 مئی 2013ء ہے

قارئین کرام براہ راست بذریعہ منی آرڈر یا وی پی قرآن نمبرنگوا سکتے ہیں

سیارہ ڈائجسٹ 240 مین مارکیٹ ریواڑ گاؤں، لاہور
فون: 3724512

سیارہ ڈائجسٹ کے عظیم الشان اسلامی نمبرز

آثارِ قیامت نمبر

قرآن وحدیث کی روشنی میں علامات قیامت و آخرت اور حیات بعد از موت کا احوال (قیمت 175 روپے)

رسول ﷺ نمبر

سیرت پاک پر ایک جامع دستاویز (دو جلدوں میں - قیمت 350 روپے)

قرآن نمبر

ایمان افروز عقل پرور اور عمل آفرین پائیکش (تین جلدوں میں قیمت: 525 روپے)

اخلاق رسول ﷺ نمبر

حضور ﷺ کی پاکیزہ زندگی کے پاکیزہ واقعات پرنٹل دستاویز (قیمت 175 روپے)

عکس سیر نمبر

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ پر مبنی مقدس اور نایاب کتاب (قیمت 275 روپے)

اولیائے کرام نمبر

اللہ کے برگزیدہ بندوں کی ایمان افروز داستانیں (چار جلدوں میں - قیمت 700 روپے)

صحابہ کرام نمبر

ان عظیم ہستیوں کی کہانی جنہوں نے رحمت العالمین کی معیت میں زندگی بسر کی (قیمت 175 روپے)

خلفائے راشدین نمبر

اسلام کی سرپائی کیلئے خلفائے راشدین کی بے مثال قربانیوں کا ذکر (قیمت 175 روپے)

فرمان رسول نمبر

عاشقانِ رسول کی خدمت میں ایک بے مثال تحفہ (قیمت 175 روپے)

فہم دین نمبر

سماجی زندگی اور عبادات کے بنیادی مسائل کا حل قرآن وحدیث کی روشنی میں (قیمت 175 روپے)

انبیائے رسول نمبر

پیغمبرانِ خدا کی حیات طیبہ جاوداں کے روح پرورد کرے (قیمت 175 روپے)

ازواجِ مطہرات نمبر

امہات المؤمنین کی پاک زندگی کے واقعات، جو آج تک ایک جگہ اکٹھے نہ کیے جاسکے (قیمت: 200 روپے)

دعا نمبر

دعا تقدر بدل دیتی ہے حدیث رسول (قیمت 175 روپے)

معجزات رسول نمبر

سرور کونین کی زندگی کے دوران وقوع پذیر ہونے والے سینکڑوں معجزات پرنٹل دستاویز (قیمت 175 روپے)

قرآنی وظائف نمبر

ہماری آپ کی اور ہر گھر کی پریشانیوں، غموں، مشکلات کے حل کیلئے وظائف (قیمت 175 روپے)

قصص القرآن نمبر

ان واقعات کا مجموعہ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی اور اس کی امت کو بتانا ضروری سمجھے (قیمت 175 روپے)

صحابیات نمبر

100 سے زائد صحابیات کا تذکرہ جنہوں نے رسول اکرم سے بیعت کی (قیمت 175 روپے)

اسلامی احکامات نمبر

دلچسپ اور پراثر طرزِ تحریر میں قوتِ ایمانی سے سرشار سبق آموز حکایات کا مجموعہ (قیمت: 175 روپے)

حقوق العباد نمبر

حقوقِ فرائض انسانی بیان کرتا مجموعہ جس پر عمل کر کے ہی سچا مسلمان بنایا جاسکتا ہے (قیمت 175 روپے)

حج عمرہ اور زیارات نمبر

حج اور عمرہ کی ادائیگی کا طریقہ آسان اور عام فہم زبان میں اہم مقامات کی نشاندہی اور سود میپ (قیمت 175 روپے)

توبہ نمبر

توبہ اللہ کی رحمتوں کے دروازے کھولتی ہے، منہرے واقعات سے مزین توبہ کے آداب فضائل (قیمت 175 روپے)

والدین نمبر

والدین کے فضائل، حقوق اور فرائض آشکار کرتی تاریخی دستاویز - ہر گھر کی ضرورت! (قیمت 175 روپے)

لازوال اسلامی واقعات نمبر

رسول خدا ﷺ، خلفائے راشدین، صحابہ کرام اور صالحین کی زندگیوں کے ایمان افروز واقعات (قیمت 175 روپے)

شرعی احکام نمبر

عبادات سے معاملات اور معاشرت سے لیکر سیاسیات تک مکمل منہابطِ حیات (قیمت 175 روپے)

جو ”نبیوں کی سرزمین“ ہے۔ آج صرف اور صرف ’کشت خون و خرابہ‘ ہے۔
تیرہ صدیوں سے جہاں فلسطینی آباد رہے وہاں تین نسلوں سے یہی خیمہ بستیاں ہیں۔ یہ ”کینوس سٹی“ اور اس
میں اپنی بچی بچی پہچان کو ڈھونڈتے نہتے مگر لڑتے بھڑتے فلسطینی۔ جو کئی برسوں سے بس لڑتے جا رہے ہیں۔
اکیس سال پہلے 1993ء میں جب میری کتاب ”PEARLS OF A PRINCESS“ ”چھپی تو اُس
کے صفحات 144 اور 145 اس تلخ سچ کو اگلتے ہیں، کتاب کی مذکورہ شاعرہ لکھتی ہے (ترجمہ)
میں ’بے چہرہ آدمی‘ (بے نام و نشان فلسطینی) دنیا بھر میں گھومتا رہا۔
اور مجھے احساس تک نہ ہوا کہ

میرا چہرہ ’زندہ‘ نہیں

میرے نقوش تو اُس دن ”اُسے“۔

جب جون کی گرمیوں کی وہ ایک رات تھی
جس کا کوئی چاند نہ تھا

یہ رات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی

میں اس سے بھرپور نفرت کروں گا

اور پھر..... ٹوٹ کر محبت کروں گا

یہ وہ رات تھی جب میرا ملک

مجھ سے ”چوری“ کرایا گیا،

اُسی رات نے..... مجھے میرے نقش دیئے۔

کچھ آگے چل کر وہ پہچان اور کھوج کی راہ پر چلنے والا نمائندہ فلسطینی کہتا ہے کہ کیوں وہ ”بے چہرہ“ تھا۔
”بیس سال پہلے،

میں اکہ کمپ میں پیدا ہوا

میری پیدائش کے وقت۔ کوئی لیڈی ڈاکٹر نہ تھی۔

ہمارے ”کینوس سٹی“ میں

زندگی اور موت کا یکساں مقدر ہے

سو، میں اپنے پیارے باپ کی بانہوں میں پیدا ہوا

اور اُس نے، میرے ناتواں پیچھے پیروں میں

زندگی کی پہلی سانس بھرنی۔

میری ”پہلی چیخ“ اُس نے سنی۔

اور میرے سینے کو بوسہ۔

پھر ہاتھ اٹھا ’دعا‘ کے لیے

خدا یا! میرے بیٹے کو
ان ”خیموں کی زندگی“ سے بہتر زندگی دے۔

باب سترہ: - بذھا کا نیلم کنارے آسن..... ”شاردا“

اور اب بحیرہ عرب سے ساڑھے چھ ہزار فٹ کی بلندی پر دنیا کی خوبصورت ترین وادی..... نیلم میں ہم اُسی نیلم کے بالکل کناروں پر خیمہ زن تھے اور یوں خوش تھے کہ دنیا کی سب سے بڑی نعمت یکا یک ہاتھ لگ گئی ہو۔ ہماری پوری سیاحتی مہم کو مختلف خیمے الاٹ کر دیئے گئے تھے۔ یوں لاہوری پارٹی جو دس نفوس پر مشتمل تھی۔ اُسے قدرے بڑا خیمہ عطا کیا گیا۔

اندر نرم گرم عمدہ پھونے اور دبیز رضائیاں موجود تھیں، شوخ و شنگ رنگوں میں۔ اور میری جانو بیٹی یہاں بھی میرے لیے پریشان تھی۔ ”ماما! آپ کیسے بیٹھیں گی؟ آپ نیچے لیٹیں گی کیسے؟“ وہ خوب جانتی تھی کہ انداز نشست و برخاست اور طریقہ استراحت میں میرا خاص نخرہ بھی ہے اور نخرے سے کہیں زیادہ مجبوری بھی۔

میں جو گزشتہ پندرہ سال سے..... آلتی پالتی مار کر کبھی بیٹھ نہ سکی تھی۔ زمینی نشست اور محمدی بستروں کا لطف بھول چکی تھی۔ اس خیمے میں نرم رضائیوں کی مدد سے ایک لڑھکنی ماری اور چاروں شانے چت یوں لیٹ گئی کہ برسوں سے اسی اُمید کو لیے بیٹھی تھی۔

اور یہی وہ نازک نکتہ تھا جو میری ’ہردم..... ہم دم‘ بیٹی نے اپنا یونیورسٹی کا شاندار ٹرپ برائے ہنزہ وادی کینسل کر دیا تھا اور خواری اٹھانے میرے ساتھ ساتھ آگئی تھی۔

یہی وہ جانکسل مرحلہ تھا..... جس کی خاطر میرے مرحوم بھائی کی بیٹی تعبیر اطہر نے فیکسٹ کر کے اُسے ڈرا مارا تھا۔ ”ٹمن! پھپھو کو نہ جانے دو اور خدا کی قسم، وہ کیسپنگ تو بالکل بھی نہیں کر پائیں گی“ وہ کبھی کبھار تو بالکل میرا ”بھاؤ“ بن کر، میرا سوچتی تھی۔

مگر میں، یہ ناممکن مرحلہ اس شاردا کے کمپ میں سر کر چکی تھی۔ اور ٹمن ابھی تک سر پکڑے بیٹھی تھی یہاں تک کہ شہزادی جیلہ خیمے کا پردہ اٹھا کر، اپنی نزاکت اور تروتازگی کے ساتھ رونق افروز نہ ہو گئی۔ اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

دالوں، مرغیوں کے بعد..... کھانے میں آج ’بکرے‘ کا خصوصی اہتمام تھا جسے کیل سے ہی خریدا گیا تھا اور ”بکرہ اور جی“ ہمارے ساتھ ہی آئے تھے سو بکرا تو ”گل“ رہا تھا مگر ہم لاہوریوں کی نیلم کے پانیوں میں ”مینگو پارٹی“ تھی۔

اور وہ جگہ ”سپاٹ آف دی ٹرپ“ تھی فضا میں ہماری آمد پر مسرور تھیں۔ اور پورا ماحول مہمان نوازی کے تمام تر تقاضوں کے ساتھ گرم جوش تھا۔ میں جب ”مینگو پکنک سپاٹ“ پر پہنچی تو ہمارا کورم پورا تھا بلکہ نسیم چودھری بھی موجود تھیں اور بحریہ ٹاؤن، اسلام آباد والی فیملی بھی۔ ایک نیٹ نما شاہرہ میں آم ڈال کر نیلم کے حوالے کر دیئے گئے تھے۔

ہم بے فکر تھے کہ ایک بڑی سی سوٹا نما لکڑی اُس جگہ گھونپ دی گئی جہاں ہم سب بیٹھے ہوئے تھے اور آموں کا لقاؤ ایک سرے سے اُس کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا۔ کچھ لوگ آموں کو گرسنہ نظروں سے دیکھتے۔ ادھر ادھر ٹھہل رہے تھے۔ پتہ نہیں کیا وجہ تھی؟ حالانکہ ہم یہ آم لاہور سے تھوڑی لائے تھے ادھر بازار سے ہی تو لیے تھے اور بازار کو نساؤ دور تھا۔ پندرہ بیس قدم دوڑ کے جاؤ اور جتنے مرضی خرید لاؤ اور پھر خوب جی بھر کر ٹھنڈا کرو۔

”تو بھئی! آنکھوں میں یہ تشنگی اور گرسنگی کیوں آخر؟ میں نے اس گردا گرد ماحول کو دیکھا اور بچوں سے چند ”آموں بھری یادیں“ شیئر کیں کہ بچپن میں، میں نے کس طرح آموں کے باغوں میں دن گزارے ہیں۔ گاؤں کے نبرداریانا کی وجہ سے سارے باغوں میں بے دھڑک گھس جاتے تھے۔ جن میں زیادہ تر باغ نانا کی ہی ملکیت تھے۔ وہ پکے آم درختوں سے ”خود“ توڑتا وہ کھیتوں کے پتوں بچے بہتی ”آڑیں“۔ اُن میں پاؤں ڈبو کر بیٹھنا اور آموں کا ٹھنڈا کرنا پھر ٹھنڈے آموں کو لے کر، اوپر آم کے درختوں پر چڑھ جانا۔ اوپر ہی اوپر نرم مکی ٹہنیوں میں نرمی نرمی سے بیٹھ کر اُس ٹرین کا انتظار کرنا جو لاہور سے فیصل آباد اور ایصل آباد سے لاہور کو گزرتی۔ سانگلہ ہل اور سالار والا (دارالاحسان) رکتیں تو میلوں دور سے ہمیں وہاں اُن آم کے پھڑوں کی چوٹیوں سے نظر آ جاتی تھیں ہم آم چوستے رہتے، ساون کی گھٹائیں جھومتی رہتیں، مستانہ فضائیں گدگداتی گزرتی جاتیں اور آج اُن خواب اور مہتاب فضاؤں کے بھولے بسرے لحوں میں سے، اختر شیرانی کا یہ بند ہی دل کا ترجمان بن کر رہ گیا ہے.....!

کیا آم کے اونچے پھڑوں پر
اب بھی وہ چھپے بولتے ہیں؟
شاخوں کے حریری پردوں میں
نغموں کے خزانے گھولتے ہیں؟
ساون کے ریلے گیتوں سے
تالاب میں ”آمرس“ گھولتے ہیں؟

ادھر شاردا میں نیلام کنارے.....!

ہمارے آم اور اُن میں موجود ”آمرس“ خوب بخ ہو چکے تھے تو پھنسی ہوئی لکڑی نکالنے کی کوشش میں وہ ڈنڈا اور اندر دھنس گیا۔

نسیم چودھری فوراً چلائی

”یہ جگہ چھوڑ دو۔ یہ جگہ فوراً چھوڑ دو۔ جلدی کرو۔“

”کک کیوں؟“ کئی سوالیہ فقرے ابھرے۔

”یہ خوبصورت کنارہ کون چھوڑے گا؟“ یہ کوئی مناظر اور پانی پہ دلفگار لہجہ تھا۔

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور عظیم پیشکش

شرعی احکام

شائع ہو گیا ہے

قیمت 175 روپے

عبادات سے معاملات تک اور معاشرت سے لیکر سیاسیات تک
تبلیغی نصاب، قرآنی آیات اور صحیح احادیث کی روشنی میں

★ اسلامی ضابطہ حیات جس کی روشنی میں آپ اپنے شب و روز گزار
سکتے ہیں۔

★ آخرت کا توشہ، دلوں کی بیماریوں کے لیے شفاء۔

★ نیکیوں کی طرف رہنمائی اور گناہوں سے بچنے کے طریقے۔

★ ایسے سنہری حروف جنہیں پڑھ کر آپ اپنے اخلاق و کردار کی
کوٹاہیوں کو دور کر سکتے ہیں۔

سیارہ ڈائجسٹ 240 ریواژ گارڈن لاہور فون: 37245412

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

224

سیارہ ذابجٹ / جنوری ۲۰۱۵ء

”پلیز! یہ جگہ چھوڑ دیں“ نسیم چاندہری تھی اور جٹ بھی تھیں، سو تھوڑے حاکمانہ انداز پر اتر آئیں۔ جوابی پارٹی بھی اڑے فیصدی جٹ کنفی۔ سو ”جٹ کنالی چٹ“ جب کنالی چاٹ صورت حال میں تھے تو ڈھیٹ تھے اور اڑیل ٹو ہو رہے تھے۔

اور نسیم یا نسیم چودھری ماضی کی اس Co-oprative پارٹی کی ہٹ دھرمی پر نالاں ہو گئی۔ صورتِ حال سے آگاہ کیا اور ساری ذمہ داری لاہوری ٹرپ کی قیادت پر ڈالتے ہوئے کافی سخت تنبیہ بھی کر ڈالی۔

مگر ان سارے بیاضین کو بتا کر ہنگامی صورت حال یا نفسی و اضطرار پیدا نہیں کیا جاسکتا تھا بس اک حکم دیا جاسکتا تھا۔

سو میں اپنی حاکمانہ اصلیت پر اتر آئی اور جسے اکثر میں برداشت، رواداری اور ادب و آداب میں ملغوف کر کے رکھ چھوڑتی تھی۔

میں حکم دے چکی تھی کہ میں اپنی پارٹی کی خود ساختہ قائد تھی اور حکم دینا، میرا استحقاق تھا..... اوپر سے، میں بہت ہی دھانسو جٹ بھی تھی یعنی ”جٹ الطرفین“..... اور سب سے بڑا کہ LEO یعنی اسد شیرنی، ان تمام خوبیوں کی ایک خوبی..... سنیا رٹی..... بزرگ بننے کا ”واحد فائدہ“ یہ ہے کہ آپ کو ڈانٹنے اور ڈانٹتے رہنے کا سٹوفلیٹ مل جاتا ہے۔

اس لیے تو میں نے بس انکی اٹھائی تھی اور بیک جنبش زبان سب کو وہاں سے اٹھا دیا تھا۔ باقی در دسری نیلم چودھری نے انجام دی اور سب جنوں کا ”تراہ کاڈ“ دیا۔

بقول اُس کے دریا کنارے، ایسے دلکش اور خوش کن قطعے بڑے سانحوں کو جنم دیتے ہیں۔ گھاس کی گرفت کی وجہ سے یہ قطعے بس سطحی اور اوپری حد تک تو رہ گئے ہوتے ہیں مگر ان کے نیچے دریا کی تیز دھار موجیں گزرتی اور مچلتی ہیں۔ پھر یہ تہہ اور پتلی ہو جاتی ہے..... اس کے علاوہ تہوں کی بنی بنائی یہ پڑچھتیاں مچھلیوں اور دیگر آبی کیڑے مکوڑوں کے لیے بہترین ”رہائش گاہ“ ہوتی ہیں۔ جسے عوضانے کے طور پر طوطا چشم آبی مخلوق کھوکھلا کرنے کا ”مقصد جلیل“ اپنا۔ئے رکھتی ہے۔

آپ خود ہی سوچ لیں کہ یہ شاندار گھاسی قطعہ آپ کے ساتھ کیا کر سکتا ہے؟ ابھی ابھی میں نے لکڑی کو خود بخود اس میں دھنستے دیکھا ہے۔ آپ خود سوچیں کوئی بھی تیز دھارا.....!

”اُف کارڈ“ کئی زمانہ چھیں اُبھریں تو نیلم مزید ہراساں کرنے پر اُتر آئیں۔
 ”اب اس تختے..... یعنی ”تختہ طاعون“ کو کھینچیں۔“

”اب اس تختے..... یعنی ”تخت طاؤس“ پر کوئی بیٹھنا چاہتا تو اس کا شوق اُس کی مرضی“ اور خود مرنے کی مرضی، کسی کی نہیں ہوتی اس لئے کہ

یہ ساری باتیں سوائے شہید کے اور شہید کب مرتا ہے وہ تو زندہ و جاوید ہو جاتا ہے۔

(جاری ہے)